
دلچسپ نگار تحریریں ۔ زندگی کی تصویریں
سچی کہانیاں
February
2017
عشق
ناہیدا اختر
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں
☆......"مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆......ایم اے راحت کا تہلکہ خیز سلسلہ "زرد لومڑی"
Monthly

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان / دانیال شمسی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتا: C-88 II فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✻ جلد: 34 ✻ شمارہ: 02 ✻ فروری 2017ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔



فون: 021-35893121-35893122 [illegible] OB-7 [illegible] کراچی



دنیا میں کس جگہ سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کا

فرض ادا کیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

[illegible] رابطہ کیجیے 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی

021-35893121 - 35893122

میری طیبہ

طیبہ...... میری بیٹی...... آپ کی بیٹی...... بے بس......

لاچار...... مجبور...... میں سوچتی ہوں کہ کیا اُس کی کم سنی اُس کی مجبوری تھی یا اُس کی غربت جواب ندارد...... میں سوچتی ہوں کہ کیا یہ صرف ایک طیبہ ہے یا اس جیسی بے شمار ہیں۔ یہ غیروں کے تشدد کا شکار ہوئی مگر جو اپنوں کے تشدد کا شکار ہیں ان کو انصاف کون دلائے گا؟ کیوں طیبہ کھیلنے کودنے کی عمر میں گھروں میں جھاڑو لگا رہی تھی؟ کیوں طیبہ اسکول جانے کی عمر میں اپنے سے بڑے بچوں کے یونیفارم استری کر کے انہیں اسکول کے لیے تیار کروا رہی تھی؟ وہ ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی کھانے کے بجائے کیوں بیگم صاحبہ کے جوتے کھا رہی تھی؟ سپریم کورٹ یقیناً اس طیبہ کو انصاف دلائے گی۔ اس پر ظلم کرنے والوں کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ مگر کیا واقعی گناہ گار وہ لوگ ہیں جن کے گھر میں وہ جھوٹے برتن مانجھتی تھی؟ یا وہ والدین جنہوں نے صرف چند روپوں کی خاطر بچی کو نوکری پر لگوایا ہوا تھا؟ یا حکومت جو روٹی، کپڑا اور تعلیم جیسی بنیادی سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے؟ یا ہمارے اپنے اعمال جن کی بدولت ہم پر ایسے بے حس اور سفاک حکمران مسلط ہیں؟ میں سمجھتی ہوں کہ اگر ہمیں اپنی شہزادیوں کو ظالم دیو کے چنگل سے چھڑانا ہے تو سب سے پہلے اپنے اندر چھپے شیطان سے نجات پانا ہوگی۔ لالچ، طمع، حرص جیسی بلاؤں سے چھٹکارا پانا ہوگا، رد بلا کا وظیفہ کرنا ہوگا۔ تبھی مستقل بنیادوں پر ظلم اور بے حسی کا خاتمہ ہوگا اور میری طیبہ، آپ کی طیبہ سکون کی زندگی گزار سکے گی ورنہ......

ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے......

منزہ سہام

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے جیسے نہیں

اِس لیے کہ ''سچی کہانیاں'' کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں'' کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ ''سچی کہانیاں'' پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے ''سچی کہانیاں'' میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ ''سچی کہانیاں'' میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

لیجیے ساتھیو! ایوارڈ مبارک ہوں آپ سب کو۔ اس ایوارڈ تقریب کا انعقاد دراصل ایک تجربہ بھی تھا۔ سنا تھا محبت کرنے والے تو آسمان سے تارے توڑ لاتے ہیں، دودھ کی نہریں بہا دیا کرتے ہیں۔ 50 ویں منزل سے محبوب کا نام لے کر چھلانگ لگا دیا کرتے ہیں۔ 110 وولٹ کی تار کو چھو لیا کرتے ہیں۔ یخ بستہ منجمد موسم میں ماؤنٹ ایورسٹ تک دوڑ لگا دیا کرتے ہیں مگر...... سنا تھا جب حقیقت میں دیکھا تو ایسا کچھ نہ ہوا۔ محبت کے سارے دعوے دھرے رہ گئے، جنہوں نے ایفائے عہد نبھایا وہی مورد الزام ٹھہرے ''میرے ساتھیو! نا انصافی کر کے اللہ کو کیا جواب دو گے۔'' ایک کی دہائی۔ ''کیا ہماری کوئی کہانی قابل انعام نہ تھی۔'' دوسرے نے کہا ''بچے بال لو بچے۔'' ''کچھ دن تو ہم آئیں۔'' تیسرا جملہ ہوا۔ ''بڑی سردی ہے۔'' چوتھا پہلے ہی عتاب ادب تو ازاں سے ڈر گیا تھا۔ اب میں کیا عرض کروں۔ کاش کہ میری ان باتوں سے ایک فیصد بھی کچھ اثر لے لیا ہوتا تو محبت کے مفہوم سمجھ جاتے۔ ہمیشہ احتساب کا کہا، ہمیشہ ایمانداری کا کہا، ہمیشہ ایک دوسرے کی عزت کا پیغام دیا مگر نہ جی نہ! ہم سب سے عظیم ہیں کا ٹیگ لگا کر سب کو پچھاڑ دو۔ دھونس، دھاندلی، تعلقات، سفارش، شکایتیں، اعلیٰ حکام سے لگائی بجھائی...... واہ رے ساتھیو! کتنا آسان کر لیا ہماری ناک کے نیچے گر نہ کیا تو محنت نہ کی۔ نہ کی تو محبت نہ کی، نہ کی تو کسی کی سیاست، سیکھت نہ کی۔ جتنا وقت غیر ادبی سرگرمیوں میں لگا دیا اتنا وقت اپنی گروپنگ میں لگا دیتے تو کیا ہی بات ہوتی۔ اپنی تحریروں کا محاسبہ کریں۔ کسی کی تحریر پر اپنا نام چپکا دینے سے ایوارڈ یا حوصلہ افزائی آپ کو کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں کچھ غلطیاں ہوئی تھیں مگر مستقبل میں اس طرح کی غلطیوں کی قطعاً گنجائش نہیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ ادب کی دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ جیسا دو مہینے پہلے کہا تھا، آج ثابت بھی ہو گیا۔ پیارو! تم سب میرے اپنے ہو یہ کیوں نہیں مان لیتے۔ تمہاری ذرا سی غفلت نے تمہیں مجھ سے بہت بہت دور کر دیا۔ محنت کرو۔ خدا ہم سب کو پھر سے جوڑ دے گا۔ یہ سب کچھ کہنے سے پہلے یقین کرو میں بہت ہی خاموشی سے گزرا ہوں۔ حقیقت کی چادر اوڑھ کر اک دن سو جاؤ اور پھر دیکھنا آنے والی نئی کرن صرف سکون اور مہربانی کی ہو۔ پودوں پر اڑتی تتلیوں تک کا سرگرم محسوس کرو گے۔ خدا آپ سب کو راہ حق پر چلنے کی توفیق دے اور وحدت والی ہمارے لہو میں دوڑنے لگ جائے۔ (آمین)۔ جلد ایوارڈ کی روداد آپ سب کے روبرو ہوگی۔ اپنے محبتوں سے منظم کر دے احوال کا آغاز کرتے ہیں۔ احوال میں سب سے پہلے ہمارے ساتھ ہیں۔

زمانوں بعد ہمارے پیارے بھائی بشیر احمد بھٹی فوق بھٹی بہاولپور سے۔ لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں کے تمام منتظمین و ممبرز صاحبان کو نیا سال مبارک۔ دعا ہے یہ سال تمام مسلمین کے لیے خوشیاں لائے۔ جنوری 2017ء کا پیارا شمارہ سامنے ہے۔ سرورق پر جنید جمشید صاحب کی تصویر نے دکھی کر دیا۔ اندرونی صفحات میں حج کے موقع پر لی گئی تصویر میں وہ اپنے شہزادوں کے ساتھ موجود ہیں۔ شوبز کی دنیا سے مذہب کی طرف ہجرت بھی بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں پرسکون زندگی عطا کرے۔ اندر قارئین کے لیے دوسرا اعلان موجود ہیں۔ ... فروری

کا شمارہ ''عشق نمبر'' اور مارچ کا شمارہ ''پراسرار کہانی نمبر'' کئی دفعہ تیزی کہانیاں آتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں نے بک اسٹال والے کو 120 روپے دے کر اپنے لیے دونوں شمارے محفوظ کرا لیے ہیں۔ بقول آپ کے کاپیاں بک کرا لیں۔ لو جی ہم نے تو یہ کام کر دیا۔ چند کہانیاں ارسال کی تھیں اور احوال میں کچھ خطوط بھی۔ ان کا کیا ہوا؟ باری کے منتظر ہیں یا ردی کی ٹوکری نے ہضم کر لیے۔ آنے والی کہانیوں کی فہرست ایک صفحے پر شائع کر دیا کریں جو قابل اشاعت ہوں اور جو نا قابل اشاعت ہوں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے۔ اس کے لیے ایک صفحے کی قربانی سے قارئین کا انتظار ختم ہو جائے گا اور وہ مزید اپنی دوسری کہانیوں کی اصلاح کر کے ارسال کرنے میں جلدی کریں گے۔''

بشیر بھائی بشیر! شکر ہے خدا خدا کر کے آپ ہر ماہ اپنی حاضری باقاعدہ بنائیے۔ ادب کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے اگر اچھے لکھنے والے اپنے قلم کو کم استعمال کریں۔ امید ہے اگلے ماہ احوال میں آپ کی شرکت لازمی ہوگی۔

☆ قبولہ شریف سے پیارے بھائی ایم حسن نظامی عرض گزار ہیں۔ ''جنوری 2017ء کا پرچہ صدر بازار ساہیوال سے ملا۔ اچھا، معیاری اور منفرد پایا اور تمام احباب سے نئے سال کی مبارک باد قبول کی۔ منزہ سہام صاحبہ کے پختہ اور پر معنی فقرات برسوں میں اتر تے چلے گئے اور یہی ان کے کامیاب ایڈیٹر ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پھر ''احوال'' میں آئے تو سبھی احباب اپنی شیریں گفتگو سے ایک دوسرے کو مخاطب پائے گئے تو کچھ احباب تحریروں پر پرمغز اور عمدہ تبصرہ فرما رہے تھے۔ اپنائیت اور خلوص کے رشتے کسی موسم اور وقت کے تابع ہرگز نہیں ہوا کرتے اور پھر ہمارا شعبہ ہی سنجیدہ اور حساس ہے۔ تبھی ایک دوسرے کی مسرتوں اور تکلیفوں کو جلد محسوس کر لیا جاتا ہے۔ بہر حال دکھ بانٹنے سے کم تو نہیں ہو جاتے مگر خلوص و محبت کے دو بول زندگی میں نئی روح پھونک دیتے ہیں اور پھر جینے کی امنگ بڑھ جاتی ہے، حوصلے جواں ہو جاتے ہیں۔ میری تحریر کو صفحات پر سجانے اور ساتھیوں کا اسے بے حد سراہنے پر ڈھیروں شکریہ۔ بقیہ میٹر بھی آپ کے پاس ہے باری آنے پر لگاتے ہوئے مشکور فرمائیں۔ اس بار تحریریں سبھی معیاری، منفرد اور آپ کے چناؤ کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ محمود شام اور کاشی چوہان کا منفرد انداز تحریر بلاشبہ پرچے کی جان پایا۔ ایوارڈ پانے والوں کو میری طرف سے مبارک باد قبول ہو۔ اس کے علاوہ مسئلہ یہ ہے، بائیڈ پارک، تیرہ نیم کش اور متفرقات بھی اپنی مثال آپ تھے۔ میری دعا ہے سچی کہانیاں یونہی بلندیوں کے افق پر سدا چمکتا ہوا اپنی تابانی ہزاروں دلوں پر برقرار رکھے، آمین۔''

☆ حسن بھائی! یہ سب تابانی آپ سب کی محبتوں کی وجہ سے ہے۔ احوال میں شریک ہو کر جہاں آپ مان بڑھاتے ہیں وہیں ہمیں مہمیز بھی کرتے ہیں۔

☆ حافظ عابد علی بھٹی پہلی بار شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس محبت بھری محفل میں قبول فرمائیں گے۔ رسالہ 5 جنوری کو اشرف بک ایجنسی سے خریدا۔ واپسی جاتے ہوئے میٹرو میں ہی احوال میں نظر پھیری۔ سب سے پہلے تو شکریہ ادا کروں گا ممتاز احمد، حنا اشرف، مجید احمد جائی، کنزہ ملک اور نازیہ بتول کا جو ہر ماہ میں احوال میں شریک ہوتے ہیں۔ تحسین جوئیہ کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد جنوری کے احوال میں شریک ہوئیں۔ شکریہ۔ رضوانہ کوثر، قرح انیس، بھائی ملازم حسین شیرازی، ایم عاصم حنیف اور صائمہ مجید کے احوال اچھے لگے۔ فیصل ندیم بھٹی اور عظمیٰ شکور کے خطوط بہت ہی اچھے تھے۔ عظمیٰ شکور کی ہر ماہ کہانی اور خط کا انتظار رہتا ہے۔ جنوری کے شمارے میں آپ کی نظم کی کمی محسوس ہوئی۔ کاشی بھائی میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے میری من پسند کہانیوں کا ایوارڈ کے لیے انتخاب کیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ''اے وطن تیرے لیے'' پڑھی۔ بہت اچھی تھی۔ دوسرے نمبر پہ اپنے پیارے بھائی رانا حبیب الرحمٰن کی کہانی پڑھی۔ کہانی میں شروع سے ہی کافی سسپنس تھا۔ کہانی بہت ہی اچھی تھی لیکن آخر میں ''جاری ہے'' پڑھ کر مزہ کرکرا ہو گیا۔ بھائی رانا آپ نے کمال کر دیا۔ امید کرتا ہوں آپ آئندہ بھی کہانی بھیجیں گے۔ عنقریب امتحان کی وجہ سے صرف یہ دو کہانیاں ہی پڑھ سکا ہوں۔ افسوس ہے

ادارہ پرل پبلی کیشنز کے دیرینہ ساتھی اور رفیق

سابق ایڈیٹر "سچی کہانیاں"

"سلیم فاروقی"





اب ہم میں نہیں۔

سلیم فاروقی کی مغفرت اور اہل خانہ کے لیے صبر کی دعا ہے۔

دکھ کی ان گھڑیوں میں ادارہ اپنے قارئین سے سلیم فاروقی کی مغفرت کے لیے بھی دعا کی اپیل کرتا ہے۔

جب رسالے سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اس وقت ''زہر عشق'' کی دسویں یا گیارہویں قسط چل رہی تھی۔ اس وجہ سے یہ ناول نہ پڑھ سکا۔ کاشی بھائی آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ''زہر عشق'' اگر کوئی کتابی شکل وغیرہ میں ہے تو مجھے ارسال کر دیں۔ قیمت اگلے ماہ بھجوا دوں گا۔ ''زہر عشق'' تو نہ پڑھ سکا لیکن آپ کے اگلے ناول کا بے صبری سے انتظار ہے۔ پہلی بار اتنا ہی کافی۔ ایگزام کی فراغت کے بعد میں بھی کہانی لکھنے کی کوشش کروں گا، خدا حافظ۔''

٭ پیارے عابد! خوش آمدید! پرچے کی پسندیدگی پر مشکور ہوں۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا اور ہاں خدا تمہیں امتحانات میں کامیاب کرے۔

☆ ملک شیر تابش شاد گڑھ رحیم یار خان سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ''ماہ جنوری کا شمارہ پڑھ کر جہاں اس خبر سے خوشی ہوئی کہ اس ماہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ وہیں آپ نے ''زہر عشق'' ختم کر کے دل کو دھچکا دیا۔ اختتام شاندار تھا۔ اگلے ناول کا انتظار رہے گا۔ ''اک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا'' مدیرہ اعلیٰ نے جنید جمشید جیسے مہذب اور خوب صورت انسان کو مختصراً خوب خراج عقیدت پیش کیا۔ احوال میں قاسم بلوچ، ایم وارث بیگ اور بہن تحسین جونیجو کے تبصرے زبردست رہے۔ نئے سلسلوں کو شروع کر کے آپ لوگوں نے رسالے کی شہرت میں اور اضافہ کیا جو کہ ایک خوش آئند بات ہے۔ رائٹرز ایوارڈز حاصل کرنے والوں کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جن کی کاوشوں کے نتیجے میں سچی کہانیاں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا ہے۔ اکتالیس کہانیاں ایوارڈ یافتہ قرار پائیں۔ ادارے نے رائٹرز کو ان کی محنت کا ثمر بڑے احسن طریقے سے دیا ہے۔ تحریروں میں سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن مجرم، برف سے شہر، قوس قزح، ٹھوکر، کورٹ مارشل اور امتحان بہترین تحریریں تھیں۔ مسکہ سے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش بھی دلچسپ سلسلے ہیں۔ ''ہائیڈ پارک'' میں انیس فضل کے تین اشعار (تیرے بعد) بہت بھائے۔ ملک علی رضا کی نظم ''حسین شام'' بہت خوب صورت تھی جو دل کو بھی شاد کر گئے۔ ''تیر نیم کش'' میں تقریباً ساری شاعری اچھے ادب پر مبنی تھی مگر عزیز سعید انصاری کے شعر نے دل چیر دیا۔ میری طرف سے تمام ممبران ادارہ کو دلی مبارک باد اور اتنا اچھا جریدہ پیش کرنے پر یہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے تجھے ☆ غبار وقت سے میلا تیرا شباب نہ ہو۔

٭ بہت اچھے بھائی! بس اسی طرح ہمارے ساتھ رہیے۔ احوال تو آپ سب کا اپنا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارا پرچہ آپ کا ہے۔ اس ماہ آپ کے لیے کہانی کی اشاعت ہماری طرف سے تحفہ۔

☆ کراچی سے ہماری بہت اچھی بہن تہمینہ غزالہ نیازی کی آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ''آج کل آپ ایوارڈ کی تقریب کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں گے۔ اس کے باوجود جنوری 2017ء کے ڈائجسٹ کو وقت پر ترتیب اور اشاعت پر آپ کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ میری دعا ہے کہ سچی کہانیاں کا سفر آپ کی سربراہی میں کامیابی سے چمکتا رہے آمین۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ شامل حال رہے، آمین۔ جنوری 2017ء کا شمارہ پہلی تاریخ کو میرے بھائی نے اخبار کے ساتھ ڈال دیا۔ اس میں شامل اپنی کہانی کو دیکھ کر خوشی تو ہونی ہی تھی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ آج کل میں شہر میں پھیلے وائرس کی زد میں آئی ہوئی ہوں۔ کسی کے انتقال پر گئی تھی۔ وہیں سے وائرل انفیکشن کا شکار ہوگئی۔ چونکہ بستر پر پڑی ہوئی تھی اس لیے ایک دن میں ہی تمام کہانیاں پڑھ لیں۔ تمام کہانیوں کی کاوش بہت اچھی تھی۔ خصوصی طور پر ممتاز احمد صاحب کی کہانی ''مجرم'' بہترین تھی۔ ان کو موسٹ پاپولر رائٹر کا ایوارڈ ملا ہے تو یہ ان کا حق ہے۔ آپ کو بہت مبارک ہو ممتاز صاحب۔ جنید جمشید کے بارے میں پڑھ کر دل اداس اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ کاوش صاحب کی کوشش ''خانقاہ'' بہت اچھی لگی۔ دوسری قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ الماس فاطمہ صاحبہ کی کہانی ''امتحان'' بہت اثر انگیز تھی۔ عورت کا خمیر تو محبت ہی سے گوندھا گیا ہے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ عورت ہی میں اللہ نے رکھ دیا ہے۔ اس کا صبر اس کے شوہر کو راہ راست پر لے آیا۔ رقیہ خالدی کی ''دیں'' زندگی کی

پُراسرار کہانی نمبر

خوف اور دہشت میں لپٹی سچ بیانیاں

ارواحِ خبیثہ کا شاخسانہ بننے والوں کی کہانیاں

فراعنہ کی سرزمین سے

اسرار بھرے راز عیاں کرتی خصوصی داستانِ حیرت

پوشیدہ دنیا سے بہت خاص طلسم کدے میں قید کرتی وہ کہانیاں

جو آپ کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔

تو پھر دیر کس بات کی ہے......

ماہِ مارچ میں 'پُراسرار کہانی نمبر' کی کاپیاں آج ہی بک کرالیجیے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

Email : pearlpublications@hotmail.com

سچی کہانیاں کا مارچ 2017 کا شمارہ پُراسرار نمبر ہوگا

حقیقت ہیں۔ سب سے زیادہ ''غیرت کے نام پر'' نے متاثر کیا۔ صنف نازک کا یہ قدم دلیرانہ تھا مگر انسان کو خصوصاً عورتوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے۔ ویسے اب صنف مخالف نازک پر ظلم کرتے ہوئے ضرور سوچیں گے آخر کب تک عورت ہی ظلم کی چکی میں پستی رہے گی۔ ''زہر عشق'' تو بس آپ کے قلم کا کمال۔ ''ہاشمے شاہ کا جادو'' نے یہ بتایا کہ جب انسان اپنے گناہوں سے تائب ہو جاتا ہے تو اللہ اس کو اپنی عافیت میں لے لیتا ہے۔ ''پاسپورٹ'' میں عارف شیخ صاحب نے ایک بڑی حقیقت کی نشاندہی کی۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ خود میرے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ جب ایک دفعہ میرے شہر کی گیس لیک ہو رہی تھی اور مجھے کمپنی والوں نے یہ جواب دیا تھا کہ ''آپ کو کیا فکر یہ تو آپ کے میٹر سے باہر لیک ہو رہی ہے۔'' اور جب میری برٹش پاسپورٹ ہولڈر بہو نے اپنے تعارف کے ساتھ بات کی تو اسی دن کام ہو گیا۔ ''بیوٹی بن باس ٹھہرا'' بھی زندگی کی حقیقت ہے۔ دانا اعوان صاحبہ نے تو مجھے بھی لائف بوائے شیمپو کا گرویدہ کر دیا۔ ورنہ میں پہلے شیمپو کوئی سا بھی استعمال کر لیتی تھی۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت بہت اچھی تھیں۔ اس سال بھی میری کہانی ''اکیلی عورت'' ایوارڈ کی مستحق ٹھہری۔ اس لیے آپ کا بہت شکریہ۔''

☆ پیاری بہن! تبصرے کا شکریہ! آپ کا تبصرہ کمال کا رہا۔ جیتیں اور قلم سے محبت اسی طرح برقرار رکھیں۔

☆ کوہاٹ سے سید ملازم حسین شیرازی لکھتے ہیں۔ ''آپ کو، اسٹاف ممبران کو، لکھاریوں کو، قارئین کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔ انعام یافتگان 2016ء کو بہت بہت مبارک۔ بہت خوشی ہوئی یہ سب ان کی اچھی کہانیاں سے محبت اور اچھی کہانیاں کی طرف سے حوصلہ افزائی کا ثمر ہے جو محنت، لگن اور دلچسپی میں اضافے کا باعث بنی۔ اللہ پاک زور قلم میں مزید اضافہ فرمائے۔ مختصراً عرض ہے۔ سرورق نئے سال کا پہلا شمارہ خاص اچھا نہیں۔ ''اداریہ'' جنید جمشید نیک، باعمل اور عاشقیر شخصیت کے حامل تھے۔ بہت خلا ہوا ہے۔ ''کہانیاں'' ابھی تک جو کہانیاں پڑھی ہیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ''سفرنامہ'' جاننا دلچسپ سلسلے ہیں۔ ''زہر عشق'' بے مثال تحریر کا حسن دوبالا نظر آتا ہے۔ سب احوالیوں نے دلنشیں انداز میں خطوط تحریر کیے۔ امتحانات میں مصروفیات کی بنا پر تفصیلی تبصرہ نہ کر سکا معذرت خواہ ہوں۔ میری تحریریں الماس، انجام بد، کالی راتیں، آپ کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ ایک تحریر ''پچھتاوا'' ارسال خدمت ہے امید ہے شامل اشاعت ہوگی۔ آخر میں گزارش ہے۔ 30/35 سال اپنے شہر سے دور اندرون ملک اور زیادہ عرصہ بیرون ملک کوچ گردی کی۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ زندگی نے بلا مبالغہ بہت امتحان لیے۔ تلخ و شیریں تجربات دامن گیر رہے۔ عجیب و غریب کہانیاں، قصے، واقعات وقوع پذیر ہوتے رہے یہ آپ بیتیاں جنہیں آپ کی خدمت میں کہانیوں کی شکل میں پیش کرتا رہوں گا یہ ذہنی اختراع نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوں گی۔ افسانے نہ ہوں گے جن کے ثبوت اور سچائیاں محفوظ ہیں۔ اگر آپ نے شرف قبولیت بخشی بہت شکریہ۔''

☆ پیارے بھیا! خدا آپ کو جلد قید و بند کی صعوبتوں سے نجات دلائے۔ کہانیاں جلد اشاعت کے مراحل سے گزریں گی۔ فکر نہ کیا کریں اور آپ کے امتحانات میں کامیابی کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔

☆ چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے بھائی اور ریگولر قاری، لکھاری فیصل ندیم بھٹی لکھتے ہیں۔ ''جنوری 2017ء کا شمارہ دو جنوری کو مل گیا۔ یہ تو نئے سال کی شروعات اچھی ہو رہی ہے۔ اشتہارات کو پڑھتے دیکھتے آخر کار منزل مقصود کے اداریے پر جا کر نظر ٹھہری۔ جنید جمشید کے بارے میں ان کے دنیا سے پردہ پوشی کرنے کے بعد ہر آنکھ اشکبار ہے۔ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔ ''احوال'' میں سب سے پہلے کاشی بھیا پچھلے سال 2016ء میں ہم سے بچھڑنے والی شخصیات کا ذکر کر رہے تھے۔ ''طوفان کے خوف سے جڑے رہنا عقل مندی نہیں۔'' کیا خوب صورت مثال پیش کی ہے۔ بے شک کوئی بھی کام ناممکن نہیں، مشکل ضرور ہوتا ہے۔ آئیے سب مل کر عہد کریں کہ 2017ء میں اپنے اندر

نئے سال میں ہم اور آپ ہم قدم

آپ کا اپنا سچی کہانیاں نئے سال میں آپ کے لیے...... اُن نئے سلسلوں کا آغاز کررہا ہے' جو یقیناً آپ کے لیے، بہت کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ صرف آپ کے لیے......

ایک سیلفی ہو جائے:

قارئین کی خوشیوں سے جڑا وہ سلسلہ جس میں آپ اپنی خوشیوں بھرے دن کی ایک یادگار تصویر بھیج سکتے ہیں۔ اُس تصویر کو ہم سچی کہانیاں کی زینت بنا دیں گے۔ جلدی کریں اور ہمیں بھیج دیں اپنا ایک یادگار پل۔

سپر ریڈر ایوارڈ:

نئے سال 2017ء میں سب سے زیادہ سالانہ خریدار بننے یا بنانے والے قاری یا لکھاری کے لیے ایوارڈ تقریب میں...... سپر ریڈر ایوارڈ کا اعلان کیا جائے گا (تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ سوچنا چھوڑیں اور سالانہ خریدار بن جائیں)

I Am The Best

نوجوانوں کے لیے بہترین موقع...... اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سلور اسکرین کے لیے پرفیکٹ ہیں۔ اداکاری آپ کے خون میں شامل ہے تو فوری طور پر اپنی چار مختلف پوز میں تصاویر ہمیں بھیج دیجیے۔ ہم آپ کے اور سلور اسکرین کے درمیان پل کا کام کریں گے۔

مثبت تبدیلی لانے کی کوشش کریں گے۔ دعا ہے کہ ہر سال ہمارے لیے رحمتوں، برکتوں اور خوشیوں کا سال قرار پائے۔ آمین۔ خطوط میں سے رضوانہ کوثر لاہور سے کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔ تبصرہ بھی اچھا ہے۔ نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں جن میں شاہدہ ذاکر دتی، اسد علی خان، ماریہ جاوید، امید ہے کہ آئندہ انہی صفحات پر جلوہ گر ہوں گے۔ حنا بشریٰ، قاسم خان، کرن ناز، بشریٰ کنول، کرن ناز تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ حنا بشریٰ، عظمیٰ شکور، ممتاز احمد، صائمہ مجید، ملازم شیرازی، صائمہ مجید کے تبصرے شاندار تھے۔ تنزیلہ عرف تانی صاحبہ آپ کے کیسے مزاج ہیں؟ کنزہ ملک صاحبہ کچھ ماہ احوال سے کیوں غائب تھیں۔ خیریت تو تھی ناں۔ مسز نوید ہاشمی، غزالہ کرن کو سلام۔ لائف لائے کا کیا کمال ہے، بالوں کو خوب صورت بنانے کے لیے آزمودہ فارمولا ہے۔ احمد سجاد بابر نے جنید جمشید کی زندگی سے جڑے واقعات بیان کر کے رلا دیا۔ پہلی سچ بیانی ''میون من پاس ٹھہرا'' ام منائل دل کو ہلا دینے والی تحریر ہے۔ ''یہ بھٹے کا تیر ہے'' زبردست کہانی ہے۔ ریاض کی قسمت میں حسن کی دیوی کا آنا قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں جو کم لوگوں کو ایسا نصیب ملتا ہے۔ ''اے وطن تیرے لیے'' غضنفر علی اور معصومہ بیگم کی وطن کی محبت کی یادگار کہانی ہے۔ ''پاسپورٹ'' عارف شیخ۔ پولیس اہلکار کی بدمعاشیوں کو بے نقاب کرتی زبردست کہانی ہے۔ ''غیرت کے نام پر'' عورت کا فسانہ حیات بہترین انداز میں لکھا ہے۔ ''زندگی کا دوسرا رخ'' آج بھی معاشرے میں زندگی کا دوسرا رخ دہرایا جا رہا ہے۔ ماشے شاہ کا جادو، پھوپی جان، شانو، جھوک، تھور، کشتیاں سب جاندار، زبردست تحریریں رہیں۔ ناول ''خانقاہ'' کی پہلی قسط تصوف اور محبت سے جڑی لازوال کہانی ہے۔ ''مجرم'' ممتاز احمد زبردست کہانی ہے۔ کہانی میں برائی کا بھیانک انجام بتایا جا رہا ہے۔ اب ''لاری اڈہ سے پلیٹ فارم'' میں کیا کمال کرتے ہو جناب۔ سفر نامہ ''برف کے شہر'' پاکستان کے برف پوش علاقے وادیوں کی سیر کرتے اس کے سحر میں گم ہو گئے۔ انتظار، پارٹی، دل کا چین ڈھونڈ سبق آموز کہانیاں ہیں۔ ''جنت کی چڑیا'' عبدالعزیز جی آپ جنت کی چڑیا کی دکھی حکایت پڑھ کر آنکھیں نم ہوتی چلی گئیں۔ ''کھوالا'' ایمانداری سے جڑی بہترین حکایت ہے۔ ''یادیں'' بھی ٹھیک تھیں۔ ''زہر عشق'' کا اختتام دلچسپی کے ساتھ ہوا۔ کاش بھیا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''مسئلہ یہ ہے'' باباجی کے فیض سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوتے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ ''تیر نیم کش'' میں بہترین اشعار ذوق کے مطابق پڑھنے کو ملے۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔''

☆ پیارے فیصل! تبصرے کا شکریہ۔ بس اسی طرح اپنی محبت ہمارے ساتھ رکھنا۔

☆ چک نمبر 301۔ ج ب گوجرہ سے ہمارے ساتھ ہیں غلام مرتضیٰ علوی، لکھتے ہیں۔ ''جنوری کا شمارہ کچھ لیٹ ملا۔ جس دن شمارہ ملا اس دن گاؤں کی فضا پر دھند ہی دھند تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آ رہا تھا اور میں پاؤں پر چوٹ کی وجہ سے بستر پر بیڈ ریسٹ کر کر کے تنگ آ گیا تھا۔ تب ہی ان مشکل وقتوں میں سچی کہانیاں رحمت بن کر آیا اور بیماری میں میرا وقت بیتا اس طرح سے گزرا کہ پتا بھی نہ چلا دن کا۔ اب میں شمارے کی تعریف کس طرح کروں۔ ہر ہر صفحہ اپنی مثال آپ ہے۔ ''احوال'' میں سب ہی ساتھی بہترین لکھ رہے ہیں۔ دیگر تحریروں میں دل دل پاکستان، پاسپورٹ، پھوپی جان، برف کے شہر، امتحان بہت پسند آئیں۔ ہمارے گھر میں شاکلہ مرتضیٰ علوی اور مشرف اعوان کو یہ شمارہ بہت پسند ہے۔ تمام ساتھیوں سے میری پاؤں کی چوٹ جلد ٹھیک ہونے کی دعا کرنے کی اپیل ہے۔ اب جازت چاہتا ہوں فروری کے شمارے کا انتظار رہے گا۔ شمارہ رجسٹرڈ ڈاک سے آنے کے باوجود بہت لیٹ ملتا ہے۔ اس طرح کیوں ہے ہم انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ بہت ساری نیک دعاؤں کے ساتھ۔''

☆ اچھے بھائی! انشاء اللہ ہماری کوشش ہے۔ رسالہ اب جلد از جلد آپ کے ہاتھوں میں ہو۔ تبصرہ تو دن لائٹ ہی تھا مگر آپ نے ہمت تو کی۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

خواتین کی محبوب قلم کار

”رفعت سراج“ کی بہترین تحریر ”دامِ دل“

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

”دامِ دل“ ...... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

”دامِ دل“ ...... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی ...... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو......

”دامِ دل“ ...... کہانی ہے اُس ماں کی ...... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

”دامِ دل“ ...... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

”دامِ دل“ ...... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ...... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول ”دامِ دل“

آپ کے اپنے ماہنامہ ”دوشیزہ“ ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

☆ کراچی سے پہلی بار احوال میں یہ آمد ہے ہماری نئی لکھاری اور شاعرہ ساتھی مینا خان کی۔ لکھتی ہیں۔ ''کاشی چوہان صاحب سب سے پہلے مبارک باد وصول کیجیے کہ آپ اور ادارے میں کام کرنے والے افراد قابل تعریف اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اتنی خوش اسلوبی سے گئے سال میں دلچسپ اور منفرد سچی کہانیاں ہماری نذر کیں۔ جنہیں پڑھ کر سچ میں دل بہت خوش ہوا کہ آپ کو خط لکھے بغیر رہ نہ سکی۔ گئے سال کا ہر شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ ہر کہانی ایسی تھی کہ گویا وہ واقعات ہمارے ساتھ ہی رونما ہوئے ہوں۔ منزہ سہام ادار یے میں جس طرح لفظوں کا انتخاب کرتی ہیں دل جیت لیتی ہیں۔ جنوری 2017 کے شمارے میں جس طرح جنید جمشید صاحب کا زندگی نامہ لکھا بہت دل گداز تھا۔ اللہ تعالیٰ سب کی بخشش، مغفرت فرمائے آمین۔ ''ہائیڈ پارک'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس میں شاعری، اقوال، نصیحت آمیز گفتگو کافی کچھ سکھاتے ہیں۔ اس شمارے میں تمام کہانیاں منفرد اور اعلیٰ اہمیت کی حامل ہیں۔ کاشی صاحب کا مستقل سلسلہ ''زہر عشق'' کی آخری قسط بہت کمال کی تھی۔ یہ سلسلہ ہمیشہ یاد رہے گا جس طرح آپ نے ایک حقیقی داستان بیان کی ہے سچ میں تعریف کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح اور نئے سلسلے لکھنے اور قارئین کو خوش رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ اسی طرح کامیاب اور اچھی پرکشش کہانیاں ہمارے لیے لکھتے رہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے آمین۔ آخر میں تمام لکھنے والوں کو مبارک باد اللہ تعالیٰ آپ سب کو بھی سلامت رکھے اور آپ اسی طرح حقیقت بیان کرتے ہمیں زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں سے آگاہ کرتے رہیں۔''

☆ اچھی گڑیا! خوش آمدید! بس گڑیا تم لوگ جب اتنی محبت دیتے ہو تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد تم بھی اچھے لکھاریوں میں شمار ہو گی۔ یہ ہمارا یقین ہے۔

☆ فیصل آباد، نثار کالونی سے ہمارے بھائی علی رضا لکھتے ہیں۔ ''رب کریم کے فضل و کرم سے سچی کہانیاں رسالہ جنوری شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ گھڑیاں، دن، مہینے گزرتے پورا سال گزر گیا۔ 2016، اب ماضی کا حصہ بن گیا اور بفضل خدا نیا سال 2017 شروع ہو گیا۔ آپ سب کو ہمارے ملک پاکستان کو اور عالم انسانیت کو اس نئے سال کی آمد بہت بہت مبارک ہو۔ اس بار کہانیوں میں ام متاہل، میر پرویز دولو، کنزہ ملک، ممتاز قادری نے اچھا لکھا۔ خاص کر میرے جگری دوست کی کہانی شائع ہوئی۔ رانا حبیب صاحب آپ اس اچھی تحریر لکھنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ باقی قاسم خان بلوچ اور صداقت حسین کو ایوارڈ بہت بہت مبارک ہو۔ خطوط میں خالد فاروق، دیا آفرین، صدف آصف، فریدہ فری، حنیف عاصم بلوچ، غلام مرتضیٰ، ذیشان ریاض، نشی عزیز، ریاض حسین شاہد، ممتاز قادری اور عائشہ نور عاشی کی تحریریں بہت اچھی تھیں۔ امید ہے لاہور شہر میں ادبی احباب سے ملاقات ہو گی۔''

☆ پیارے علی رضا! بس سب کچھ تم سب کو خوش دیکھنے کے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔ ایوارڈ تو بھائی مل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہے۔

☆ رحیم یار خان سے ہماری پیاری سی بہن سیاس گل مختصر سے نامے کے ساتھ یاد کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''السلام علیکم! امید ہے کہ بفضل خدا مزاج بخیر ہوں گے۔ سچی کہانیاں حاضر ہے۔ جادو ٹونوں والی کہانی کبھی لکھی نہیں ہے پہلی کوشش ہے امید ہے پسند آئے گی۔ بھائی! ہم نے کہانی کا اینڈ سسپنس رہنے دیا ہے ہمارے خیال میں ایسی کہانیوں کا اینڈ قارئین پر چھوڑ دینا چاہیے۔ سسپنس اچھا ہوتا ہے۔ شاعری بھی بھیج رہے ہیں۔ کالم کے نام یاد نہیں تھے سو ایسے ہی بھیج رہے ہیں۔ جزاک اللہ۔ آپ کی صحت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا گو۔''

☆ اچھی سی بہن! سلامت رہو۔ انشاء اللہ کہانی جلد شائع ہو گی۔ کبھی کبھی اسی طرح یاد کر لیا کرو۔ بھائی کا مان رہ جاتا ہے۔

☆ فیصل آباد، امین ٹاؤن سے ذیشان ریاض لکھتے ہیں۔ ''کیسے مزاج ہیں، بہت بہت مبارک باد رائٹرز ایوارڈ

کی۔ زندہ دلان لاہور کے شہر میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ مجھے بھی دعوت نامہ درکار ہے۔ کاشی بھائی بہت عرصے بعد عبدالعزیز جی آنکل کی اسٹوری لگی ہے۔ ماں کے بارے میں لکھنے سے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اب ہم خود ماں باپ بنے ہیں تو ان کی قدر و منزلت کا احساس ہوتا ہے۔ ابو دنیا سے رخصت ہوئے چھ سال گزر گئے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن یا رات کا کوئی پہر ان کی یاد کے بنا گزرا ہو۔ اللہ سب مرحومین کی مغفرت فرمائے۔''

☆ پیارے بھائی! دعوت نامے کے لیے آپ کی سفارش کر دی گئی ہے مگر آپ کو دعوت نامے کی کیا ضرورت۔ تم تم آؤ۔

☆ کراچی ہی سے پہلی آمد ہے ایڈ وکیٹ احمد بلال کی۔ لکھتے ہیں۔ ''گزشتہ دنوں موسم سرما کی چھٹیوں میں سچی کہانیاں ڈائجسٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مصروفیت کے باعث کبھی پڑھنا نہیں ہوا مگر اب جو پڑھا تو سوچا کہ کچھ تبصرہ کر لیا جائے۔ واقعی آپ اور آپ کا ادارہ تعریف کے مستحق ہیں۔ آپ کا ادارہ بہت اچھا کام کر رہا ہے جس طرح آپ سب مختلف لوگوں کی سچی بیتیاں بیان کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ہمیں لوگوں کے ساتھ پیش آئے واقعات کا علم ہوتا ہے بلکہ ہم ان واقعات اور تجربات سے اپنی زندگی کو مزید بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ ایک مقولہ ہے نا کہ ''عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے'' عقلمند انسان وہی ہے جو دوسروں کے تجربات سے سیکھتا ہے اور ان تجربات کو اپنی آئندہ زندگی کی لیے مشعل راہ سمجھتا ہے اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے کے اصول مرتب کرتا ہے۔ ایسا ہی کچھ کام آپ اور آپ کا ادارہ کر رہا ہے جو واقعی قابل تعریف ہے۔ دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے اس ادارہ کو یونہی کامیابیوں سے نوازتا رہے۔ آپ کے اس کام کو اللہ تعالیٰ یونہی جاری و ساری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ سب اسی طرح لوگوں کے تجربات اور معلومات میں اضافہ کرتے رہیں، آمین۔''

☆ پیارے ایڈووکیٹ صاحب! خوش آمدید! قانون اور صحافت کا یہ ساتھ اللہ کرے اسی طرح برقرار رہے۔ آپ کے تبصرے کا اب ہر ماہ انتظار رہے گا۔

☆ کراچی سے آپی نفیسہ قتیل اپنے پیارے سے تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ ''ان سب کا بہت شکریہ جنہوں نے میرا تبصرہ پسند کیا۔ قاسم خان بلوچ بیٹا بہت شکریہ۔ مازم حسین شیرازی شکریہ بیٹا خوش رہو۔ جی تو پہلی کہانی ''جیون بنا بائی ٹھہرا'' ام مناہل دکھی کر گئی۔ بے حد دکھ ہوا۔ ''یہ بچنے کے تھے'' مفتی محمد عزیز کے اچھی ہے۔ ''اے وطن تیرے لیے'' سید ابو محمد آزاد زبردست تحریر ہے۔ ''پاسپورٹ'' عارف شیخ بہت خوب کامران نے اچھا قدم اٹھایا۔ غیرت کے نام پر تحسین انجم انصاری آج کل یہی کچھ ہو رہا ہے۔ زندگی کا دوسرا رخ خالد نذیر خالد ان کی کہانی بھی رلا گئی۔ بادشاہ کا جاد و مہر پرویز ہود۔ ''زہر عشق'' سب سے پہلے پڑھی ڈر بھی تھی کہ سلمان جن دیجاد ین کے مگر واہ کاشی بیٹا کیا زبردست اختتام کیا۔ بہت خوب۔ سلمان جن کا عشق کامیاب رہا۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ قمر علی حاجی صاحب کا سفرنامہ پہلے بھی شوق سے پڑھتی تھی، دلچسپ ہے۔ میری کہانی ''پھوپی جان'' اور ''ہائیڈ پارک'' میں ''تیرے بغیر'' کے لیے شکریہ۔ جنید جمشید کی اللہ مغفرت فرمائے، آمین۔ لاکھوں قارئین کو رلا گئے۔ ''خانقاہ'' کاشی صدیقی اچھا ناول ہے۔ کچھ کہانیاں باقی ہیں میری طرف سے منیزہ بھی، بھابی رخسانہ کے لیے بہت سی دعائیں سلام و پیار۔''

☆ آپی جی! بس آپ کی محبت ہمیں ہمیشہ مہمیز کرتی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ہاں! تبصرے کے لیے شکریہ نہیں بلکہ آپ کی محبت کے دل سے مقروض ہیں۔

☆ لاہور سے ۔۔۔ عرصہ دراز بعد ہمارے بھائی رانا محمد شاہد کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''تقریباً دو سال کے بعد سچی کہانیاں اپنی تمک اعزازی کاپی کی صورت ملا تو حیرت ہوئی۔ کہانی کی اشاعت پر آپ کا مشکور ہوں۔ خوشی بھی ہوئی کہ آپ کہانیوں کو ... رکھتے ہیں ... جنید

مارچ 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام:..

مکمل پتا:..

....

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مارچ 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی:...................................... تعداد صفحات:..................

نام:..

مکمل پتا:..

....

فون/سیل نمبر:..

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مارچ 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اول، عنوان:.............................. مصنف:..............................

دوم، عنوان:.............................. مصنف:..............................

سوم، عنوان:.............................. مصنف:..............................

نام:.............................. شہر:..............................

جمشید کی تصویر دیکھی تو طیارہ حادثے کے وقت کے لمحات تازہ ہو گئے۔ منزہ سہام کا اداریہ آنکھیں نم کرنے کے لیے کافی تھا۔ کاشی چوہان بھائی بہت خوشی ہوئی یہ پڑھ کر کہ سچی کہانیاں کے رائٹرز کے لیے تقریب کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ میں تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ وہ اپنے محبوب رسالے کے لیے بہتر سے بہترین لکھیں گے۔ احمد سجاد بابر نے جنید جمشید کے حوالے سے بہت خوب صورت انداز میں لکھا۔"

بھائی کاشف بھائی! آپ کو اعزازی کاپی ملی آپ نے سوچا کہ چلو شرکت کر لیتے ہیں۔ مسلسل رسالہ پڑھنے والے کل اور آج کا فرق اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم کہانیاں ہی نہیں رشتے بھی بہت سنبھال کر رکھتے ہیں۔

☆ ہماری بہت پیاری بہن حنا اشرف لاہور سے اپنی محبتیں لیے حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ "سال نو تمام عالم اسلام کے لیے نئی امیدوں اور کامیابیوں کا سال ہو۔ 2016ء جہاں تلخ یادیں دے گیا وہیں یہ سوچ چھوڑ گیا کہ اب وہ غلطیاں اگلے سال نہ ہوں۔ ہمیں ہمت کرنی ہے اور صرف دعائیں نہیں کرنی ہمیں عمل بھی کرنا ہے۔ اللہ رب العزت سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔ بھائی پہلی ایوارڈ تقریب منعقد کرنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مجھے اتنے اعزاز کے قابل سمجھا یہ میرے رب کی مہربانی، میرے والدین کی دعائیں اور پیار سے بھیا آپ کی حوصلہ افزائی ہے ورنہ ہم کیا ہماری اوقات کیا، جنہیں قلم پکڑنے کا سلیقہ نہ تھا انہیں یہ اعزاز بخشا۔ میں آپ کی اور سچی کہانیاں کی بہت بہت مشکور ہوں۔ میری کہانی "عشق زادہ" کو جنہوں نے پسند کیا ان کی شکر گزار ہوں۔ آپ لوگوں کی دعائیں اور یہ حوصلہ افزائی تو ہے کہ میں بھی اس ایوارڈ تقریب کا حصہ ہوں جو شامل ہیں۔ ان سب بہن بھائیوں کو بہت بہت مبارک باد اور جو منتخب نہ ہو سکے وہ دل چھوٹا نہ کریں ہمت کریں اگلی ایوارڈ تقریب اپنے نام کر لیں ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ "احوال" کا آغاز کاشی بھیا کی بہت خوب صورت باتوں کے ساتھ ہوا۔ خطوط میں رضوانہ کوثر صاحبہ کا خط بے حد محبت بھرا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیاں اور صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ تحسین جونیجو کی دوست کے لیے مغفرت کی بہت سی دعائیں۔ اللہ پاک آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ فرح انیس، تحسین جونیجو، عظمیٰ شکور، بھائی محمد قاسم خان، سی ساتھی، مراد خان، کرن ناز، بھیا ممتاز احمد، غزالہ کرن، تنزیلہ عرف تانی، بشریٰ کنول، تازیہ بتول رضا، احسن ابرار رضوی، کنزیٰ ملک، سائرہ مجید، بھیا عاصم حسین شیرازی، ماریہ جاوید، بھائی حنیف عاصم بلوچ، نیلمان ندیم بھٹی، ملک علی رضا۔ ان سب کے خطوط بہت زبردست اور محبت بھرے تھے۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ ممتاز احمد صاحب کا میری کہانی پر تبصرہ میرے لیے اعزاز تھا۔ کرن ناز آپ کی حوصلہ افزائی پر بے حد ممنون ہوں، خوش رہیں۔ بھائی حنیف عاصم بلوچ آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ آپ سب کی دعائیں اور حوصلہ افزائی ہمارے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔ صائمہ بشیر صاحبہ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ ذیشان آصف خان اور دلشاد نسیم کے ماموں کی بخشش ومغفرت کے لیے بہت سی دعائیں۔ "احوال" میں ذوالفقار صاحب نے بریک لگائی بھیا اس جملے نے بہت مزہ دیا۔ خوش رہیں۔ شمارہ 661 پر فرح انیس نے خوب لکھا۔ ملک علی رضا کی شاعری بھی بہت خوب صورت تھی۔ "زہر عشق" نے ابتداء سے جو سحر قائم کیا تھا وہ آخری قسط میں ماند نہیں پڑا تھا۔ بھیا اتنا ہی اچھا ناول ہمیں دوبارہ پڑھنا ہے۔ کہانیوں میں ٹھوکر، بھوک، مجرم، خانقاہ، شادی، انتظار، پھوپی جان، آگر والی، امتحان، مسیحا کون، بہت لاجواب تھیں۔ "جنت کی چڑیا" عبدالعزیز جی آر صاحب کی ایک حساس سی تحریر ایک باپ کے دل کی آواز دل بہت رنجیدہ رہا۔ "برف کے شہر" کی سیر بھی بہت مسحور کن تھی۔ "قوس قزح" اچھی کاوش ہے۔ عظمیٰ شکور کی عبدالرحمن کے ساتھ ہمدردی پر بہت ہنسی آئی۔ احمد سجاد بابر نے قلم سے جنید جمشید مرحوم کو قابل تحسین انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، اب اجازت۔"

☆ پیاری حنا! خوش رہو! محنت کرنے والے ہی انعام پاتے ہیں۔ اعزاز دولت اور مرتبے سے نہیں ملتے۔ جزبہ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
- ایڈ فری لنکس
- ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
- ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
- کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



کاٹنے والے ہمیشہ خود گر جاتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ پیار، عزت اور احترام بھی قسمت والوں کو ملتا ہے۔ تم ڈیزرو کرتی تھیں اس اعزاز کے لیے۔

☆ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے محمد اعجاز احمد کی آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں۔ ”میں خیریت سے ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی خیر خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے آپ کو بہت بہت مبارک باد دیتا ہوں۔ میں کراچی میں ایک پرائیویٹ فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کسی کو خط نہیں لکھا۔ یہ پہلا خط میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ یہ سب آپ کی محبت کا ثمر ہے۔ اس سے پہلے میں پرانی ڈائجسٹ پڑھتا تھا۔ ان سب ڈائجسٹوں میں مجھے سچی کہانیاں بہت پسند آیا۔ اس میں بہت اچھی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے دل نے بہت چاہا کہ آپ کو خط لکھوں مگر نہیں لکھ سکا۔ آج ٹائم نکال کر آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میری ڈیوٹی کبھی دن کو ہوتی ہے کبھی رات کو اگر آپ میرا یہ خط شائع کریں گے تو میں بہت مشکور ہوں گا۔ پھر میں آپ کو اپنی زندگی کی کہانی لکھ کر بھیجوں گا۔ ماہ دسمبر کی تین والی کہانیاں مجھے باکل بھی اچھی نہیں لگتیں۔ ماہ نومبر کی کہانیاں اچھی تھیں۔ ان میں ”دیمک زدہ محبت“ اور ”عشق کے کوہسار“ بہت اچھی تھی۔ دیمک زدہ محبت میں زہرا نے سچی دوست وفادار بیوی بن کر ساتھ نبھایا ایسی بیوی دنیا میں کبھی کبھی انسان کے مقدر میں آتی ہے۔ اعجاز احمد قمر ال صاحب خوب صورت کہانی کا بہت بہت شکریہ۔ ”عشق کے کوہسار“ سید غلام حسین شیرازی اچھی کہانی لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔“

☆ پیارے بھائی! خوش آمدید! آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے مگر آج کے زمانے میں بھروسا مشکل سے ہوتا ہے۔ نور صاحبہ تک آپ کا پیغام دیا مگر انہیں کسی پر بھروسا نہیں۔ آپ ہمارے بابا جی کے توسط سے ان کے لیے جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

☆ خواجہ حسین جاوید، منچن آباد سے احوال بن رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ ”دو جنوری کی صبح بھائی سرور شاہ صاحب نے مجھے کال کر کے بتایا کہ میری کہانی ”گھر اور عزت“ شائع ہوگئی ہے۔ پیارے کاشی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری تحریر کو نوک پلک سنوار کر قابل اشاعت بنا دیا۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پیارے بھیا میں نے سوچا تھا کہ میری کہانی کا نمبر دو تین سال بعد آئے گا لیکن آپ نے تو مجھ پر خصوصی مہربانی فرما دی۔ بھیا آپ کا احسان مجھ پر قرض ہے۔ بھیا جی تین جنوری کی صبح میری آنٹی وفات پاگئی تھیں۔ تمام احباب سے دعائے مغفرت کی پرزور اپیل ہے بھیا جی اس بار میں تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری مجبوری سمجھیں گے۔ بھیا جی آپ کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض بنتا ہے۔ اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ بھیا جی! میں سچی کہانیاں کے ساتھ سن 2006ء سے وابستہ ہوں۔ سچی کہانیاں نے میری ہر خواہش پوری کی ہے۔ سلسلہ ”تیر نیم کش“ جو سے پہلے ”پسند اپنی اپنی“ تھا میں ادارہ نے میری منتخب کردہ اشعار لگائے تو کبھی سلسلہ ”خیال آرائی“ میں میری سوچ کو جگہ عطا فرمائی۔ بندہ خاکسار پر آپ کے بہت احسان ہیں۔ کاشی صاحب! مجھے اس بات کا بہت اندازہ ہے کہ آپ کو میری کہانی پر کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ اس کو قابل اشاعت بنانے کے لیے اور آپ میرے تبصرے پر بھی بڑی محنت کرتے ہیں۔ سچی کہانیاں اینڈ ٹیم آپ کا بہت بہت شکریہ۔ جنوری 2017ء والا رسالہ لے کر میں اپنے ٹیچر کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا سر میری کہانی لگی ہے۔ تو وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ یہ تو کافی معیاری رسالہ ہے۔ اس میں تمہاری کہانی لگنی بڑی بات ہے۔ بھیا جی یہ سب آپ کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ سچی کہانیاں کی سچی یاری سب پہ بھاری!“

☆ اچھے بھائی! انتظار کا پھل بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ فی الحال تو اب میرا انتظار کر ... والا معاملہ ہے۔

☆ مجید احمد جائی ملتان شریف سے۔ ”مزاج گرامی! اس امید کے ساتھ اپنے خط کا آغاز کرتا ہوں کہ جہاں بھی ہوں گے صحت و تندرستی کے ساتھ ہنستے مسکراتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ رحمتوں نعمتوں کے سائے تلے ہمیشہ شاد

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا

کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو

ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ

سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

اور آباد رکھے آمین۔ سال 2016ء داغ مفارقت دے کر چلا گیا، اس سال نے جہاں اُداسیاں پھیلائی وہاں کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار بھی کیا۔ ہم سے ہمارے اپنے چھین لے گیا اور نامور شخصیات کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام وفات پانے والوں کی مغفرت فرمائے اور اُن کے درجات بلند فرمائے آمین۔ یہ خط لکھ رہا ہوں تو سال نو کی 8 جنوری ہے۔ دل افسردہ سا ہے، میری چچی جان اپنے ننھے ننھے معصوم بچے چھوڑ کر اپنے پیارے رب کے پاس چلی گئیں۔ میں اس صدمے اور دُکھ سے مغموم بیٹھا ہوں۔ بچے تو پل ہی جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے وہ بہتر جانتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ دُعا گو ہوں اور دُعا کی اپیل کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میری چچی کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔ سچی کہانیاں کئی دنوں سے میرے بیڈ پہ پڑا شاید اب اُداس سا ہو گیا ہے۔ ایوارڈ تقریب کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تمام ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ قبول ہو۔ سچی کہانیاں میں بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں جو کہ ترقی کے لئے اچھے اقدام ہیں۔ کہانیوں میں جو پڑھی ہیں مسیحا کون، کورٹ مارشل، قوس قزح، پارٹی بازی، انتظار، اگر وادی، جنت کی چڑیا، مجرم، شافی، جیون بن باس ٹھہرا، یہ پڑھنے کے چشمے کے بہترین ہیں۔ اب اجازت چاہتا ہوں جہاں رہیں خوشیاں پھیلائیں، کیونکہ محبت ہی کے دم سے دُنیا آباد ہے۔

پیارے مجید! تم نے سچ کہا محبت کے دم سے ہی دنیا آباد ہے۔ کامیاب وہی ہوتا ہے جو صرف ایک ہی کام میں اپنی یکسوئی لگا دیتا ہے۔ زندگی تمہاری، فیصلے تمہارے جو دل چاہے کرو بھائی...... اعلان کیوں؟

ساجدہ مجید ملتان شریف سے: آداب! امید کرتی ہوں خیریت سے ہوں گے اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو آمین ثم آمین! سال نو اپنا آغاز کر چکا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں امن اور سکون والی زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور صراط مستقیم پر چلائے آمین۔ سال نو کی مبارک باد دیتا سچی کہانیاں ملا۔ سرورق بہت اچھا تھا۔ منزہ سہام کا اداریہ جنید جمشید کے بارے میں عمدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ سچی کہانیاں سال نو میں بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ موجود ہوا ہے۔ اللہ کرے ترقی کی تمام منزلیں جلد طے کرے، ہر شمارہ اچھے انتظام سے شائع ہو، [illegible] اور ناول ہمارے بصیرت کے لئے تیار ہے۔ یقیناً یہ ناول کی کمی کو پورا کرے گا۔ احمد سجاد بابر نے جنید جمشید کے بارے سچے واقعات کے ساتھ جا [illegible] ہیں۔ سال 2016ء بڑے بڑے ادیب نامور شخصیات کو لے گیا۔ کہانیوں میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ غیرت سے زندہ رہو، اے وطن تیرے لیے، چھوٹی جان، شہر، رشتوں کی ناقدری، مجرم، برف کے شہر، انتظار، وادی، قوس قزح، جنت کی چڑیا، امتحان، دیوتا، مسیحا کون، حسن اور ذات، جیسی تمام کہانیاں شامل اشاعت تھیں۔ یہ چھوٹی کہانیاں سچی کہانیوں کے پیٹ، مرچ، انچی گئی تھیں۔ [illegible] شامل تھیں۔ اس سے آگے اس ایوارڈ تقریب کا انتظار ہے۔ مستقل سلسلے اچھے ہیں۔ اب اجازت زندگی رہی تو پھر ملاقات۔

پیاری بہن! مستقل سلسلوں کی تعریف کا بہت شکریہ۔ خدا تم سب کو اپنی امان میں رکھے۔

[illegible] شہر سے ہمارے ساتھی شاہ حسین [illegible] 3 [illegible] بے حد پسند آیا۔ جنوری پر چہ سال نو کی مبارک باد [illegible] کہانی کا مکمل احوال اپنے عروج پر تھی۔ ممتاز احمد صاحب آپ سلامت رہے۔ شہر [illegible] آپ کی کہانیوں میں بہت پسند کی ہیں۔ محمد راشد [illegible] کی اشاعت پر مبارک باد۔ شہان کوب بھائی کی والدہ کے لیے دعا ہے مغفرت ہو۔ اعوان کی لائف [illegible] بے حد پسند آئی۔ ممتاز احمد "راز داری شرط ہے" اور "بڑی آپا" بے مثال تھیں۔ رضیہ مہدی

''سہیلی'' ارم ناز ''جوگی'' فرح انیس ''بے چین روح'' سیدہ تبسم زہرہ ''محور قص سرمہ دانی'' ملک این اے کاشی ''خونی خزانہ'' اچھی تھیں۔ افتخار چوہدری ''بچ گیا ایمان بس'' محمد بلال فیاض ''لوہاری گیٹ کا وہ مکان'' مہتاب خان ''وہ چتل کا دیا'' بہت شاندار تھیں۔ ایم اے راحت کی ''زرد لومڑی'' زبردست ہے۔ حنا بشریٰ کی ''عشق زادہ'' بہت عمدہ تھی۔ مجید احمد جائی ''ایک راز'' نزہت جبیں ضیاء ''گاؤں والا مندر'' صداقت حسین ساجد ''خواب کے زخم'' سید وجاہت علی ''ماہر'' بنت حوا ''زہر بھرا انتقام، صائمہ عروج ''ناگن'' حدیقہ سیٹھی ''پیاس ادھوری ہے'' خوب صورتی سے پیش کی گئیں کہانیاں تھیں۔ محمود شام نے معلومات کا خزانہ دیا۔ بے حد شکریہ۔ شاہد ذاکر ''نیلی امداد'' کنزہ ملک ''بابا میرا محسن'' عظمیٰ یوسف عظمی ''جنوں والا مکان'' جواد احمد ''اکتالیسویں رات'' مختصر مگر دلچسپ کہانیاں تھیں۔ ''زہر عشق'' کاشی چوہان بھیا کا ناول رسالے کی جان ہے۔ جاوید راہی ''نگری کی ملکہ'' احمد سجاد بابر ''درگاہ کا مجذوب'' منفرد تھیں۔ اب تھوڑا سا تبصرہ جنوری کے شمارے پر۔ سچی کہانیاں 2017ء کو پورا شمارہ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک بے مثال ٹھہرا۔ ممتاز احمد، فیصل ندیم بھٹی، عبدالعزیز جی آپ کو بہت سلام اور دعا۔ اور تحسین جونیجو اجوال میں آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپی زرینہ کو سلام۔ زہر عشق جیسے بے مثال ناول کاشی بھائی آخری قسط دل موہ لیا۔ واہ کیا اختتام کیا ہے آپ نے زبردست۔ باقی تمام کہانیاں بھی اے ون رہیں۔ طبیعت ناساز ہے لہٰذا مزید تبصرے کے لیے معذرت۔ نیا سال سب کو مبارک ہو۔

کاشی پورے دورا سلامت رہو۔ جلدی سے اچھے ہو جاؤ پھر جم کر تبصرہ کرنا۔

لیجیے ساتھیو! بھائی سور کے خط کے ساتھ ہی ہماری محفل احوال اپنے اختتام کو پہنچی۔ میری کسی بھی بات سے اگر آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو معذرت۔ مگر اتنا ضرور یاد رکھیے۔ میرے دل میں آپ کے لیے بہت محبت ہے۔ اپنی سوچ کو ہمیشہ مثبت رکھیے۔ ہر میدان میں کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اچھے دن انشاء اللہ اگلی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ خدا نگہبان آپ کی بہاروں کو رونق ہر بات۔ اپنی ... سے ضرور نوازیے گا۔ اجازت سے پہلے ایک نظم آپ کی نذر۔

Sweet Eyes

شرارت بھرے نین!
ٹھنڈے ٹھنڈے [illegible]
شاموں کے سائے جیسے
مرتے دلوں کی [illegible]
قدموں کے [illegible] منزل میں جیسے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
نیند [illegible]
شرارت [illegible]
[illegible]
[illegible]
میری جان!
[illegible]

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2016ء کے ایوارڈ یافتگان

شہر	مصنف/مصنفہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	ایوارڈ ماہ
شور کوٹ سٹی	صداقت حسین ساجد	اجنبی مسیحا	جنوری 2016ء
ملتان	مجید احمد جائی	یاد رکھے گی دنیا	
ملتان	فصیحہ آصف خان	آخری دعا	
ٹوبہ ٹیک سنگھ	محمد قاسم خان بلوچ	آپ اپنے دام میں	فروری 2016ء
کراچی	ثمینہ فیاض	روایات کی دلدل	
حاصل پور	فوزیہ احسان رانا	حرام خور	
کراچی	شانی خانان	گم شدہ چہرہ	مارچ 2016ء
کراچی	نفیسہ سعید	کمرہ نمبر 607	
اسلام آباد	شائستہ انور	باندی	
کراچی	الماس فاطمہ ارمان	نجات	
چیچہ وطنی	عبدالغفار عابد	کرم کے فیصلے	اپریل 2016ء
کراچی	عقیلہ حق	دوکوڑی کی عورت	
کراچی	نزہت جبیں ضیاء	پکا پھل	
قبولہ شریف	ریاض حسین شاہد	انگاروں پہ رقص	مئی 2016ء
کراچی	ام عادل	محلہ کی بیٹی	
میاں چنوں	مہر پرویز احمد ولو	خانہ برباد عشق	
اسلام آباد	عظمیٰ شکور	کتنی محبت باقی ہے	
کراچی	شمس قمر	کس نے کھیل کھیلا ہے	جون 2016ء
لاہور	راحت وفا راجپوت	[illegible]	

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2016ء کے ایوارڈ یافتگان

	جولائی 2016ء	ہیرو	ریحانہ آفتاب	کراچی
		زربخت اور شب گل	سیدہ عطیہ زہرہ	لاہور
		مان	جیجل میتلو	کراچی
	اگست 2016ء	جائز	وقاص حسین	رحیم یار خان
		دو تنکے	شیما عبدالقیوم	لاہور
		VICTIM کون؟	مادوش طالب	لاہور
		آخری فرعون	ملک غضنفر عباس اعوان	جہانیاں
		فرعون کے مجرم	بنت حوا	لیہ
	ستمبر 2016ء	جرس	محمد بلال فیاض	ملتان
		اکیلی عورت	تمیس غزالہ نیہاں	کراچی
		اصلی چہرہ	نادیہ ملک	اوکاڑہ
		رفوگر	نسیم سکینہ صدف	ڈسکہ
	اکتوبر 2016ء	ابلیس	ضرغام محمود	کراچی
		مرد اور عورت	عطیہ ہدایت اللہ	پشاور
		روشنی والا رستہ	رئیسہ خالد	اسلام آباد

سچی کہانیاں رائٹر ایوارڈ حاصل کرنے والے لکھاریوں کی مکمل فہرست

2016ء کے ایوارڈ یافتگان

ایوارڈ ماہ	ایوارڈ یافتہ کہانی	مصنف / مصنفہ	شہر
نومبر 2016ء	بے غیرت کہیں کی	ایڈیسن ادریس مسیح	کراچی
	عشق کی شاخ کا الو	ثمینہ طاہر بٹ	لاہور
	نجم، سحرش اور حسینہ	ایم حسن نظامی	قبولہ شریف
دسمبر 2016ء	بچ گیا ایمان بس	سید افتخار چوہدری	گوجرانوالہ
	سہیلی	رضیہ مہدی	کراچی

سچی کہانیاں اسپیشل ایوارڈز

☆ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔ سید نور (لاہور)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر۔ احمد سجاد بابر۔ (لودھراں)

☆ بیسٹ رائٹر آف دی ایئر۔ حنا بشریٰ (لاہور)

☆ موسٹ پاپولر رائٹر آف 2016ء ممتاز احمد (سرگودھا)

☆ موسٹ پاپولر رائٹر آف 2016ء ارم ناز (کراچی)

☆ قارئین! ان تمام ایوارڈز کے نتائج کے بعد جیوری نے حتمی طور پر اس برس دو ایوارڈز مزید دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ Best Critic Award Of 2016

ان ایوارڈز کو پانے والے لکھاری جاوید راہی اور اقبال بانو ہیں۔

ساتھیو! کچھ دوستوں کی پُرزور اپیل پر اس ماہ پھر سے ایوارڈز لسٹ شائع کر دی گئی ہے۔

لائف بوائے... ہر وعدہ وفا کرائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

"نازنین! ارے گڑیا ذرا باہر تو دیکھو کتنی دیر سے دروازہ بج رہا ہے۔" رانی دادی نے پاندان سے کتھا چونا انگلی کی پوروں پر لگا کر چاٹا اور دیر سے ہوتی دستک پر متوجہ ہوتے پوتی کو پکارا۔

"دادی اماں بس میری دو روٹیاں رہ گئی ہیں۔ جب تک پوری نہ کرلوں میں نہیں آنے کی ہاں۔" نازنین نے کچن سے ہی تیز آواز میں دادی کو جواب دیا۔

"ہاں جھلے سے دروازے کی ساری چولیں ہلا دے کوئی۔" رانی دادی دہل کر رہ گئیں۔

"ارے دادی اماں کچھ نہیں ہونے کا دروازے کو..... بڑے مضبوط دروازے ہیں۔ اور ویسے بھی ہمارے برنس روڈ کے قدیم دروازے تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جھلنے سے جافری کی ساری جالی نکل جانے چوکھٹا کبھی نہ نکلے گا۔" نازنین بھی حرفوں سے بنی تھی کہاں باز آتی۔

"اچھا تو چلو میں آپ ہی دیکھ لیتی ہوں۔"

نازنین کی شوخی اور بچپنے سے وہ بخوبی واقف تھیں۔ لہٰذا دروازہ کھولنے چلی آئیں۔

"اے لو! بھلا یہ کیا مذاق ہوا۔ اتنی دیر سے دروازہ پیٹے جا رہے تھے اور دروازہ کھولا تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب...... ارے کیا زمانہ آگیا ہے۔" رانی دادی دروازے پر کھڑی تفصیحہ کرنے لگیں۔

"دادی آجائیں! جانے والے جاچکے۔"

"ہاں سب جاچکے' میں رہ گئی کلیجہ پیٹنے کو اے میں کہتی ہوں کیا تھا اگر تو ذرا کی ذرا آکر دروازہ کھول جاتی..... مگر بھیا تجھے تو اپنی دو روٹی پوری کرنے کی جلدی تھی۔ بھلا ہم دو کے علاوہ کون سا ٹبر ہے جس کے لیے تو چولہے کو آگ لگائے بیٹھی تھی۔"

"روٹی تو آگ پہ ہی بنتی ہے۔ آگ جلے گی تو روٹی بنے گی۔" نازنین نے نخرے سے ہنسنا شروع کردیا۔

"چپ کر جا..... آئی بڑی میا کو سکھانے والی۔

تیرا باپ بھی تیری ہی طرح تھا۔ اللہ بخشے میرا بچہ ہر وخت (وقت) بس ماحول کو زعفران زار ہی بنائے رکھتا تھا۔ ہائے باد!" دادی نے سرد آہ بھری۔

"جنے کہاں سے چیپ کی ڈلی پلے پڑ گئی اور خاموش ہو گیا میرا لعل!" رانی دادی نے بہو کی شان میں قصیدہ گوئی ضروری سمجھی۔

"خبردار دادی جو میری اماں کو کچھ کہا تو...... ہاں نی تو...... ابا نے لاکھوں میں سے چنا تھا میری امی کو! مذاق ہے کیا اور ایک آپ ہیں روایتی ساس......"

"اری چپ...... دادی کو چپ کرانے کی تو ہے کون...... آخر بتا ہی دیتی ہے کہ ثروت آرا کی لونڈیا ہوں۔" دادی نے اس کی بات قطع کی اور گویا تنبیہہ کر دی کہ وہ بہو کی حمایت میں کچھ سننے کی روادار نہیں ہیں۔

"ارے میری پیاری سی دادی...... جب آپ بولتی ہیں نا ایسے تو قسم سے جی چاہتا ہے کہ آپ کو چبانے میں گھول کر پی جاؤں۔" اور یہ سب مسکراتے ہوئے کہہ کر وہ دادی کے گلے کا ہار ہو گئی۔

"میری گڑیا! میری رانی! تو بالکل اپنی ماں کی طرح پیاری ہے۔ بس وہ تو میرے منہ سے بس ایسے ہی نکل جاتا ہے کبھی کبھی۔ مگر واقعی میری بہو ہیرا تھی۔ اللہ میرے بیٹے کو اور بہو کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ بس بٹیا میں تو تیرے دم سے جی رہی ہوں۔ کاش کہ تجھے بالوں کا یہ عیب نہ لگا ہوتا۔" رانی دادی نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اسے حسرت سے دیکھا۔

"دادی آپ بھی نا! ارے دادی میرے بال بڑھتے ہی نہیں تو شکوہ کیسا...... چلیے میرے ساتھ تو پھر تھوڑا مسئلہ ہوا مگر ہمارے علاقے میں اکثر لڑکیاں ان ہی مسائل کا شکار ہیں۔ میں نے تیل والے بھائی سے کدو کا تیل منگوایا ہے نا...... وہ کہہ رہا تھا کہ بیٹی کدو کے تیل سے بالوں کا ہر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔

انگلی پھیری پر لیتا آؤں گا۔"

"ارے کتنے کا تیل منگوا لیا تو نے؟" رانی دادی کے ماتھے پر اچانک ہی بل پڑ گئے۔

"ساڑھے تین سو کا آئے گا دادی۔" وہ اٹھلائی۔

"ارے تھو ساڑھے تین سو کا آئے گا...... اور اگر ساڑھے تین سو بال نہ اگا سکے تو پیے کار گیا نا کدو کا تیل۔" بات تو دادی نے پتے کی کی تھی۔

"اوہو دادی...... وہ لوگ نیا شیمپو بھی بنا رہے ہیں۔ وہ ضرور کام دکھائے گا۔" نازنین خوش ہوتی بولی۔

"بھیا کہیں ان کا شیمپو واقعی 'کام' نہ دکھا جائے۔" یہ کہہ کر دادی نے کھٹاک سے پاندان کھولا اور پان کی چھوٹی سی کترن نکال کر تیار کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

نازنین کے ماں باپ حادثاتی طور پر زمین کی گود میں جا سوئے تھے اور نازنین اپنی دادی کی گود میں آ گئی تھی۔ حادثے کے وقت نازنین چار برس کی تھی۔ کوچ کو آگ لگی تو قدرت نے نازنین کو بچا لیا۔ اس کے بال بری طرح جھلس گئے تھے جو ناگا ساکی اور ہیروشیما کی طرح آج بھی اپنی بربادی کی داستان سناتے تھے۔ بالوں کی افزائش رک سی گئی تھی۔ قدیم علاقے میں رہائش کے سبب باہر کی ہوا اب تک ان کے تیسرے مالے پر نہ آئی تھی۔ نازنین کو دادی نے قیمتی خزانے کی طرح سنبھالا ہوا تھا۔ نہ خود کہیں جاتی تھیں نا اسے ہی کہیں جانے دیتی تھیں۔ یہی ڈر لگا کرتا تھا انہیں کہ اگر نازو باہر جانے لگی تو بیٹے بہو کی طرح سوختہ واپس نہ آ جائے۔ نازنین اسکول کی بھی ابتدائی تین کلاسوں کے بعد آگے نہ پڑھ سکی تھی کہ دادی کے خدشات بہت تھے اور اس کی سوچیں محدود...... گھر میں نہ ٹی وی تھا نا

دیگر آسائشات ...... وہ وقت کی رانی کے بھی لالے تھے۔ میاں کی پنشن میں گھر چلتا تھا۔ بس کسمپرسی میں گزربسر ہورہی تھی۔ نازنین اب چودہ برس کی ہوچکی تھی۔ مڈل کلاس کا المیہ ہے کہ وقت سے پہلے بچے شعور کی منازل طے کرلیتے ہیں۔ چودہ برس کی عمر میں نازنین گھرداری میں طاق ہوگئی تھی۔ اپنا اور دادی کا ہرکام خودبخود ذمہ داری بنتا چلا گیا تھا۔

دروازہ پھر سے بجنے لگا اور کھانا کھاتے دونوں دادی پوتی کے ہاتھ رُک گئے۔

''جاؤ جاکر دیکھو کون ہے، دروازہ بجانے کا انداز تو وہی ہے جو پہلے تھا۔'' رانی دادی نے فوراً اس کی دروازے پر دوڑ لگوادی۔

''اُفوہ! کیا مصیبت ہے؟ کھانا تک کھانے نہیں دے سکتے لوگ۔ ہونہہ! خدا پوچھے ان کو۔'' وہ بکتی جھکتی دروازہ کھولنے لگی۔

''کیا ہے؟ کون بے صبرا ہے جو دروازہ توڑ ڈالے گا آج۔'' اور دروازہ کھولتے ہی ایک نازک سی لڑکی ہاتھ میں بیگ لیے کسی پروڈکٹ کی سیل کے لیے موجود تھی۔

''جی فرمایئے۔ کیا لائی ہیں آپ؟''

''آپ میری بات تو سن لیں...... میں نیا لائف بوائے شیمپو آپ کے لیے لے کر حاضر ہوئی ہوں۔''

''بیچنے کے لیے لائی ہو ناں! تو اتنا انداز دکھانے کا فائدہ' سیدھا بولو کہ شیمپو خریدلیں۔''

''ارے کیا دروازے پر شور مچارہی ہے۔ اندر بلالے۔ میرے گھر میں کون سے مَرد ہیں۔'' دادی نے اُسے جھڑکا اور وہ لڑکی کو اندر لے کر آگئی۔

''بیٹھو بٹیا! تین منزلیں چڑھ کر آئی ہو' پیاس تو لگی ہوگی۔''

''آنٹی آپ تو شرمندہ کررہی ہیں۔ میں بالکل نہیں تھکی اور ہاں میں آپ کے حکم پر آتو گئی ہوں اندر، مگر گھروں کے اندر جانے کی ہمیں اجازت نہیں ہوتی۔''

''ارے میری گڑیا! ہمارے ہاں ہم دو دادی پوتی کے علاوہ کون ہے۔ خیر اللہ رکھے تم بتاؤ' کیا لیے لیے گھوم رہی ہو؟''

''دادی میں نیا لائف بوائے شیمپو لے کر آئی ہوں۔ آپ ایک بار استعمال کریں۔ ہمارا لائف بوائے شیمپو آپ کے بالوں کے تمام مسائل ختم کرکے نئے بال اُگاتا ہے اور آپ کے بالوں کو گھنا اور طاقت ور بناتا ہے۔''

''بٹیا سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ کیمیکل والے شیمپو کہاں بالوں کو بہتر کرتے ہیں۔''

''دادی آپ جو بات بھی کہہ رہی ہیں قبل از وقت ہے۔ آپ نیا لائف بوائے شیمپو ایک بار استعمال کرکے دیکھیں۔ اگر آپ کے بالوں کا مسئلہ حل ہوجائے تو پھر جو فیصلہ آپ کریں مجھے منظور۔'' لڑکی نے اعتماد سے کہا تو دادی کو اس کے اعتماد نے صدرجہ متاثر کیا۔

''چندا...... میری پوتی کے بال جھلس گئے تھے ایک حادثے میں' تب سے اس کے بال متاثر ہوئے اور افزائش رُک سی گئی ہے۔ تمہارا اعتماد مجھے پسند آیا ہے مگر اس مسئلے کا حل تو بس اللہ میاں سے دعا ہی ہے۔''

''ارے دادی! اللہ میاں نے ہی انسان کو عقل دے کر نئی نئی سہولیات کے قابل بنایا ہے۔ آپ خیال نہ کریں۔ اللہ میاں پر بھروسا کرتے ہوئے ہمارے لائف بوائے شیمپو کو آزما کر دیکھ لیں۔''

''آپ پھر نظر کب آئیں گی۔'' نازنین نے طنز کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''ارے میری چھوٹی بہن! میں پورے ایک مہینے بعد خاص طور پر اپنی بہن کے بالوں پر اپنے نئے

لائف بوائے شیمپو کا اثر دیکھنے آؤں گی۔ میرا یقین ہے کہ اللہ میاں نے لائف بوائے شیمپو کی صورت آپ کے لیے مسیحا بھیج دیا ہے۔"

"سچ!" نازنین نے فرطِ مسرت سے لڑکی کے ہاتھ تھام لیے۔

"بالکل! وعدہ! اعتماد کا وعدہ' تم استعمال تو کر کے دیکھو۔" لڑکی نے بیگ سے دو لائف بوائے شیمپو کی بوتلیں نکال کر نازنین کو تھما دیں۔ دادی نے پیسے دینے کے لیے پاندان کھولا تھا۔

"ارے بٹیا کتنے پیسے ہوئے۔"

"ارے دادی! یہ تو اعتماد کا سودا ہے۔ میں اپنی بہن کے لیے بطور تحفہ دے کر جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر لڑکی تو چلی گئی مگر دادی پوتی کو حیرت کی دنیا میں ڈال گئی۔

☆......☆......☆

باقاعدگی سے نازنین نے سنے لائف بوائے شیمپو کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ پہلے پہل تو اُسے اپنے بالوں میں کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی بلکہ بال شیمپو کرنے کے بعد مزید اُلجھ جاتے تھے۔ ایک دن وہ اسی مسئلے سے دوچار تھی کہ دادی نے دیکھ لیا۔

"کیوں بالوں کے پیچھے پڑی ہے۔ ارے میں کہتی ہوں وقع کر دے اسے۔"

اُلجھے بالوں کو کھینچتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور دادی کس طرح پوتی کو تکلیف میں برداشت کر سکتی تھیں۔

"دادی اماں! مجھے لگ رہا ہے پہلے سے کچھ بہتری آئی ہے۔ دادی یہ دیکھیں پہلے میرے بالوں کے کنارے تانبے کی تار جیسے تھے مگر اب ان میں کچھ حد تک نرمی آئی ہے۔ دیکھیں نا آپ۔" نازنین اُلجھے بالوں کو لیے دادی کے پاس آ گئی۔

"ارے..." دادی نے بال ہاتھوں میں لے کر چیک کیے۔

"کوئی نرمی نہیں آئی ہے۔ بس چھوڑ دے بٹیا یہ سب...... دیکھ تو! بالوں میں کنگھا کرتے کرتے تیری آنکھیں کیسی لال ہو گئی ہیں تکلیف سے۔" دادی نے اُسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"دادی اماں! مجھے لائف بوائے شیمپو پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔ ایک دن کمال ضرور ہوگا۔ شیمپو والی باجی کا اعتماد ضرور رنگ دکھائے گا۔" یہ کہہ کر نازنین بال سلجھانے لگی اور رانی دادی پوتی کے اعتماد کو لے کر صدقِ دل سے دعا مانگنے لگیں۔

☆......☆......☆

چند ماہ کے باقاعدہ استعمال سے نازنین کے بال واقعی اپنی اصل حالت میں آنے لگے تھے۔

آج اُس کی شیمپو والی باجی اُس سے ملنے خاص طور پر آئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے اُسے گلے سے لگا لیا۔

"کیوٹ گرل! دیکھ لو اللہ میاں نے مسیحا بھیجا نا لائف بوائے شیمپو کی شکل میں۔" وہ لائف بوائے شیمپو کے کمال پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

"سچ ہے باجی! بات ہے اعتماد کی اور لائف بوائے شیمپو پر اعتماد نے میرے بالوں کے مسائل ہی حل نہیں کیے بلکہ مجھے بھی ایک پُراعتماد زندگی دوبارہ سے دے دی ہے۔ آپ کی اور لائف بوائے شیمپو... تم نے تو واقعی میں کمال کر دکھایا۔"

"ہاں سارا کمال لائف بوائے شیمپو کا ہے۔ اگر میں اُس دن دروازہ کھٹکھٹانے پر شرمندہ ہو جاتی تو بھلا یہ کمال ہوتا۔ اسے کہو بٹیا۔" دادی ماں بھلا پیچھے کیوں رہتیں۔

"بالکل! ہمارا کمال تو دادی ماں کا ہے۔ جن کی بدولت لائف بوائے شیمپو کی شکل میں مسیحا ہمارے گھر کو آیا تھا۔" نازنین یہ کہہ کر کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کی شیمپو والی باجی بھی مسکرانے لگی تھیں۔

☆☆☆

امنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں میں ڈوبی عشق کی وارداتیں

10 نمک پاش، شکر فشاں داستانیں

وہ تحریریں جن کی سادگی ہی ان کا حسن ہے

حق



اقبال بانو

اقبال بانو کے قلم سے، محبت کرنے والے ایک مرد اور عورت کی یادگار داستان

''اماں بی بس آپ جواب دے دیں۔''
''کیا؟''
''یہی کہ میں نے شادی نہیں کرنی۔''
''وہ کیوں؟'' اماں بی نے حیرت سے کہا۔

''بس موڈ نہیں۔'' زہرہ نے مسکراہٹ ہونٹ بھینچ کر چھپائی۔
''یہ کیا بات ہوئی۔ لوتھا کی لوتھا ہوگئی ہو.... اور بی بنو کا موڈ ہی نہیں ہو رہا۔'' اماں بی نے چشمے میں سے گھورا۔



''بس میں نے کہہ دیا کہ مجھے نہیں کرنی شادی۔'' زہرہ منہ بنا کر بولی۔

''وجہ؟''

''سیدھی سی بات ہے مجھے پڑھنے دیں۔ اماں بی مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے، یہ تو آپ کو بھی پتہ ہے نا؟'' زہرہ منت کرنے لگی۔

''اب یہ سارے شوق سسرال جا کر پورے کرنا۔'' اماں نے ننانوے فیصد ماؤں والا جملہ دہرایا۔

''ہاں سسرال والے کولھو کے بیل کی طرح کام میں جوتے رکھیں گے یا مجھے پڑھائیں گے؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''وہ صرف اکیلا ہے، بہنیں اور دو بھائی شادی شدہ ہیں۔ اپنے گھروں کے ہیں۔ تو سارے شوق پورے کر لیجیو۔'' اماں نے باتوں ہی باتوں میں اسے تفصیل بتائی۔

''وہ پاگل میرے شوق کیا پورے کرے گا۔'' زہرہ منہ بنا کر بولی۔

''زبان کو لگام دے بدذات۔ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔''

''تو آپ بھی آئندہ میری شادی کی بات زبان سے مت نکالیے گا۔'' زہرہ سدا کی منہ پھٹ تو تھی ہی۔

''اب تو میرے سامنے بھی بکواس کرنے لگی ہے۔'' اماں بی نے زہرہ کے دو تھپڑ جڑ دیے۔

اور تھپڑ کھا کر بھی وہ ہنسنے لگی اور اماں بی کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

''اماں بی..... میری پیاری اماں بی۔''

''اب اب مجھے مکھن نہ لگا۔''

''میں آپ کو مکھن بھلا کیسے لگاؤں گی۔ کب سے تو میں نے مکھن کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' زہرہ نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

مگر زہرہ کا یہ جملہ اماں بی کے دل میں کھب کر رہ گیا۔

ہائے کس قدر ترسے ہوئے ہیں میرے بچے۔ خدا غریبوں کے گھر اتنی فیاضی سے ڈھیر ساری روحیں کیوں بھیج دیتا ہے۔

''اماں بی۔'' زہرہ نے انہیں سوچوں میں غرق دیکھ کر پکارا۔

''بس تیری شادی ہو جائے تو اپنے گھر میں مکھن کی صورت بھی دیکھ لینا۔ بھلا اتنے بچوں میں کیسے تیری خواہش پوری کی جائے۔'' اماں بی دکھ سے بولیں۔

''اف آپ تو بات کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں۔ اماں صرف دو سال اور صبر کر لیں۔ بس میں گریجویشن کر لوں۔'' زہرہ اپنے مطلب کی بات پر آگئی۔

''زہرہ تو دو سال کہہ رہی ہے۔''

''اماں یوں گزر جائیں گے۔'' زہرہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے تو دو سال دو صدیاں ہیں بیٹا۔ دیکھ تو ضد نہ کر۔ اچھا رشتہ ہے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آج کل اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں۔'' اماں بی نرم لہجے میں بولیں۔

''مجھے نہیں ضرورت..... اماں بی میں ابا جی کا بازو بننا چاہتی ہوں۔ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''گریجویشن کے بعد کہیں نوکری کر لوں گی۔''

''بکواس نہ کر۔ ہمارے خاندان میں کبھی کسی لڑکی نے نوکری کی؟'' اماں بی کا پارہ ہائی ہو گیا۔

''ارے کون سا ہمارا خاندان ہے۔ ہم بھوکے ہیں تو کسی نے لا کر روٹی دی ہے ہمیں۔ امجد بیمار ہو گیا تھا تو ہزار، پانچ سو تک کسی نے نہیں دیے تھے ادھار۔ آپ خاندان کی بات کرتی ہیں۔'' زہرہ نے خاندان والوں کی پول کھول دی۔

''زبان کو لگام دے زہرہ۔ جو تیرے بابو جی اور میں چاہوں گی وہی ہوگا۔ آخر جمیلہ اور ثریا بھی تو ہیں۔ چودہ کا سن لگتے ہی بیاہ دیا گیا اور اف نہ کی انہوں نے۔ ایک تو ہے جو ہمارے منہ پر کالک ملنا چاہتی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''ایسی کون سی بات کر دی ہے میں نے۔ جمیلہ آپا اور ثریا باجی آئے دن تو لڑ جھگڑ کر آجاتی ہیں اپنی میوں سمیت اور آپ ان کے سسرال والوں کو کوستی ہیں۔''

''مگر تجھے تو مجھے گھر کے ساتھ نہیں جھٹنا پڑے

گا۔ کمبخت۔ وہ تو ساس سسر، نندوں کے ہمراہ رہتی ہیں تو لڑائی ہوتی ہے نا۔'' اماں بی نے اسے سمجھایا۔

''تو آپ نے اب داماد گونگا ڈھونڈا ہے۔'' زہرہ نے شوخی سے پوچھا۔

''شرم تو تُو نے بالکل بیچ دی ہے۔''

''اماں بی! بس آپ بابو جی کو بھی بتا دیں کہ مجھے نہیں کرنی شادی۔ میں پڑھ کر نوکری کروں گی ہاں!''

زہرہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

''ہونہہ، جیسے اسی کی بات تو مانی جائے گی نا۔'' اماں بی بڑبڑانے لگیں۔

زہرہ نے چند ہی روز ہوئے مڈل کا امتحان دیا تھا اور آج کل چھٹیاں گزار رہی تھی۔ اسے بہت شوق تھا پڑھنے کا۔ زہرہ نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔ جب وہ دیکھتی آپا اور بجیا آئے دن اپنے روتے بسورتے بچوں کے ہمراہ کمھلائے ہوئے چہرے لئے آموجود ہوتیں تو اس کا فیصلہ اور پکا ہو جاتا۔ حالانکہ زہرہ اب پورے پندرہ برس کی ہو چکی تھی۔ کلاس میں سب لڑکیوں میں بڑی تھی کیونکہ اماں بی نے پڑھنے دیر سے بٹھایا تھا۔ جب سات سال کی تھی تو پہلی جماعت میں داخل کروایا تھا۔ وہ بھی بہت ضد کی تھی۔

زہرہ نے۔ محلے کی بچیوں کو جب پڑھنے جاتے دیکھتی اجلے یونیفارم پہنے تو اس کا دل بھی للچاتا۔ اب اتنی حیثیت تو نہ تھی کہ اسے پڑھایا جاتا۔ پورے سات بچے تھے اماں بی کے۔ بڑی جمیلہ آپا، پھر ثریا بجیا اور پھر زہرہ تھی۔ تین لڑکیوں کے بعد اللہ میاں نے بیٹا دیا تھا۔ احمد، پھر سرور، راشد اور پھر امجد۔ اب بھی بڑی دونوں لڑکیوں کی شادیاں کر دینے کے باوجود اماں بی پریشانی میں گھری تھیں کیونکہ جب بھی زہرہ کے دونوں بہنوئی ذرا لڑتے آپا فوراً میکے آجاتیں۔ اماں بی کا جی جلانے حالانکہ ہزار بار زہرہ نے جمیلہ آپا سے کہا تھا۔

''آپا تم آیا کرو تو بچے ان کے باپ کے پاس چھوڑ آیا کرو۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے کہ تم چاروں کو لیے آجاتی ہو۔''

تب اماں بی اور جمیلہ آپا مل کر اسے خوب کوستیں اور زہرہ ایسا چکنا گھڑا تھی کہ اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اور جمیلہ آپا جب بھی آتیں وہ ضرور انہیں کہتی۔ زہرہ کی یادداشت میں ایسا کوئی دن نہ تھا جب کہ جمیلہ آپا، ثریا باجی ہنسی خوشی میکے آئی ہوں۔ بس اسی لیے اس کی جان جلتی تھی۔ ابا میاں کی پرچون کی دکان تھی۔ اب بھلا وہ کہاں تک پورا کرتے۔ اب اماں بی اسے دیس نکالا کرنا چاہتی تھیں۔

اور اماں بی نے محلے کی نصیبن خالہ سے جو کہ رشتے کرواتی تھیں صاف کہہ دیا تھا کہ اے بہن ایسا کوئی رشتہ تلاش کرنا جو اکیلا ہو۔ ورنہ یہ پٹاخہ تو ساری عمر میری دہلیز پر بیٹھی میرے سینے پر مونگ دلتی رہے گی۔''

اب نصیبن خالہ نے ایسا ہی رشتہ دکھایا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ تو اس کے بچپن ہی میں خدا کو پیارے ہو گئے تھے، بڑی بہن نے پالا پوسا تھا۔ ایک فیکٹری میں مزدور تھا۔ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا۔ تیسری کلاس سے ہی بھاگا تھا تو پھر پڑھ کر نہ دیا۔ ویسے بھی بہنوئی تک کچھ نہ کہتے کہ بیوی کہے گی کہ میرا بھائی کھٹکتا ہے۔ شکل صورت کا اچھا تھا۔ اماں بی اور بابو جی کو پسند بھی آگیا تھا۔ مگر نہ جانے کیا اماں بی کے دل میں آئی کہ زہرہ کو بھی بتا دیا۔ اس نے تو ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔

اماں بی نے تو ابھی اس رشتے پر نہ ہاں کی تھی اور نہ نا..... مگر ان کا جی چاہتا تھا کہ زہرہ راضی ہو جائے کیونکہ ایسا رشتہ مشکل سے ہی ملتا۔ لڑکے کو فیکٹری کی طرف سے کوارٹر ملا ہوا تھا۔ سب سے اہم بات کہ اکیلا تھا اور وہ اس پٹاخہ کو ایسے ہی گھر بھیجنا چاہتی تھیں۔ وہی ہوا جو اماں بی نے چاہا۔ زہرہ کی بھوک ہڑتال اور ناراضگی، رونا دھونا کچھ بھی کام نہ آیا.... اور ایک روز وہ ہاتھوں میں مہندی رچائے سہاگ کا جوڑا پہنے صادق کی ہو گئی۔

اور صادق نے گھونگھٹ الٹتے ہی جو بات زہرہ سے کہی وہ اس کے دل کی تہوں میں شور مچانے کو کافی تھی۔

''دیکھو زہرہ، مجھے پتہ ہے کہ تو نے بہت جماعتیں پڑھی ہیں اور سنا ہے کہ تو زبان دراز بھی ہے پر میرے

ساتھ سیدھی رہنا ورنہ چوٹی پکڑ کر باہر کردوں گا۔ بیویاں بہت۔''

زہرہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

یہ جملہ سنتے ہی من کی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔

دل کی سمندر میں طغیانی سی آگئی تھی۔

ہائے وہ جو سہاگ رات کے بارے میں باتیں سنی تھیں سب جھوٹ۔ سب بکواس۔ وہ نرم نرم لفظوں کی پھوار۔ کہ تن من بھیگتا جائے۔ یہ کیسے الفاظ تھے کہ نشتر کی طرح دل میں کھبے جارہے تھے۔

تمہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں زبان دراز ہوں۔ میں تو سوائے اماں اور ابا کے کبھی کسی سے اونچا بھی نہیں بولی۔

''کیا سمجھی .... مجھے شکایت کا موقع نہ دینا۔''

زہرہ کو خاموش دیکھ کر صادق نے پھر رعب جھاڑا۔

زہرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر بھر آئے۔ دل تھا کہ ٹوٹ سا گیا اور اس کی کرچیاں زہرہ کو آنکھوں میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہائے تمہیں خالہ کون سے جنموں کا بدلہ لیا ہے تم نے۔'' آنسوؤں کو پلکوں میں پروتے ہوئے زہرہ نے دل ہی دل میں شکوہ کر ہی ڈالا۔

☆......☆

صادق اچھا نہیں تھا تو برا بھی نہیں تھا۔ زہرہ بھی اس کا حد سے زیادہ خیال رکھتی۔ شروع سے ماں باپ کی محبت کو ترسا ہوا تھا۔ اور محبتوں کی کمی دل میں بہت بڑے خلا پیدا کر دیتی ہے۔ اب زہرہ اپنی محبت سے صادق کے دل کے خلا کو بھرنا چاہتی تھی۔ صادق اسے یوں تو بہت چاہتا تھا مگر مردوں والا رعب بھی رکھتا تھا۔ مہینے کی پوری تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور صبح جاتے سے روز کرائے کے لئے پیسے لے جاتا۔ ہفتے میں ایک دن میرے لیے بھی لے جانا تھا۔ حالانکہ زہرہ کو گھومنے پھرنے کا شوق نہیں تھا۔ مگر صادق کی وجہ سے جانا پڑتا۔

زہرہ کے دل میں بہت ہڑک اٹھتی آگے پڑھنے کی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ صادق سے اجازت مانگتی۔ وہ تو اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔ پہلے دن والا خوف کچھ ایسا بیٹھا تھا کہ کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔ اماں کے ہاں بھی جاتی تو صادق کے ہمراہ ہی واپس آجاتی۔ اماں کا کتنا جی چاہتا کہ اس تیز طرار لڑکی کو روک لیں۔ جس کی شادی کے بعد ساری تیزی دھری رہ گئی تھی۔ جو دشت کی ہرنیوں کی طرح کبھی رہتی۔ سب باتیں کرتے اور وہ چپ چپ بیٹھی رہتی جیسے کہ بولنا ہی بھول گئی ہو۔ اماں نے کئی بار اکیلے میں اس سے پوچھا بھی۔

''بیٹا تو صادق کے ساتھ خوش نہیں؟''

''ارے نہیں اماں بی، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ ہنس کر کہتی۔

''پھر تو اتنی چپ کیوں رہتی ہے؟''

''میں جب بولا کرتی تھی تو آپ کہتی تھیں کہ کبھی زبان بھی تالو سے لگا لیا کر۔ اب چپ رہتی ہوں تو آپ کہتی ہیں کہ بولا کروں۔''

''پھر بھی ....'' اماں بی کو تو جاننے کی پڑی ہوئی تھی۔

''اماں بی آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بہت خوش ہوں۔''

زہرہ ہر طرح اماں بی کو مطمئن کر دیتی اور بات بھی ٹھیک تھی۔ کوئی پریشانی ہی نہیں تھی۔ صادق سے کبھی تو تو میں میں نہیں ہوئی۔ ہر بات اس کی چپ چاپ مان لی۔ اسے عادت تھی رات کے پچھلے پہر چائے پینے کی اور زہرہ اسے چائے بنا کر دیتی۔ پندرہ روز قبل ہی اس نے کئی ماہ خرچ میں سے پیسے بچا کر ایک تھرماس صادق سے منگوا لیا تھا، مگر اس کے آنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ چائے بھر کر تو رکھ دیتی مگر تھرماس سے کپ میں ڈال کر صادق کو دینا اسی کی ذمہ داری تھی۔ تب بعض مرتبہ گئے دنوں کی زہرہ سر اٹھاتی۔ کہ کہہ دے صادق تم خود ہی پی لیا کرو چائے۔ تھرماس سے انڈیلنی تو ہوتی ہے۔''

پر وہی جملہ یاد آجاتا۔ ''چوٹی پکڑ کر باہر کردوں گا، بیویاں بہت۔'' اور وہ خاموشی سے کام میں لگ جاتی۔ آنسو دل میں موتیوں کی طرح گرتے رہتے۔

اسے یوں لگتا جیسے کہ اس کی روح پر لاتعداد چھالے ہو گئے ہوں۔

وقت دبے پاؤں گزرنے لگا۔ صادق کی محبت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ اسے خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ زہرہ بھی اسے شکایت کا موقع نہ دیتی۔

اس روز صادق بہت خوش تھا۔ فیکٹری سے آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''زہرہ.... اے زہرہ.....'' صادق کی آواز سن کر اندر بیٹھی زہرہ چونک گئی۔ آج وہ خلاف توقع جلد ہی آ گیا تھا۔

''خدا خیر کرے۔'' زہرہ جلدی سے باہر آئی۔

''آج جلدی آ گئے۔''

''ہاں۔'' صادق نے اسے پرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوش نظر آ رہے ہو۔'' زہرہ کے لب مسکائے۔''کوئی خزانہ مل گیا ہے کیا؟''

''ظاہر ہے غریب کی خوشی تو پیسے سے ہوتی ہے۔ آج مجھے بونس ملا ہے۔''

زہرہ نے دیکھا اس سے خوشی چھپ نہیں رہی تھی۔

''اچھا۔'' زہرہ بولی۔

''ہاں.... یہ لو۔'' صادق نے جیب میں سے ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔

تب زہرہ نے ہاتھ بڑھایا۔

''ایسے نہیں۔'' وہ شوخ ہو گیا۔

''کیا مطلب؟'' زہرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

اور اس کی آنکھوں میں شرارتی چمک دیکھ کر آنکھیں جھکائیں اور صادق ہنس دیا۔

''آج تو جو بھی خواہش کہے گی پوری کروں گا۔'' صادق اس کا ہاتھ تھامے کمرے میں آ گیا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟'' زہرہ نے بہت آس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''واقعی؟'' زہرہ بے یقینی سے بولی۔

''تجھے اعتبار نہیں زہرہ؟'' صادق کا لہجہ بجھ گیا۔

''تم پر تو مجھے خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے صادق!'' زہرہ نے صادق کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اچھا اب بتا۔'' صادق نے ہاتھ کھینچ کر قریب بٹھا لیا۔

''تم ناراض تو نہیں ہو گے؟'' زہرہ کو اب بھی خدشہ تھا۔

''نہیں'' صادق بولا۔

''وعدہ!'' زہرہ نے کہا۔

''پکا وعدہ..... لو!'' صادق نے اس کا ہاتھ دبایا۔

''صادق..... مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ آٹھ جماعتیں تو میں نے پڑھ لیں مگر ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خلا میں لٹکی ہوئی ہوں۔'' وہ بغیر رکے بولے گئے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' صادق حیرت سے بولا۔

''میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ بس تو کرا ہی لوں گی۔'' زہرہ نے نظریں ملائے بغیر ہی سب کچھ کہہ دیا۔

''زہرہ میں مرد بچہ ہوں اور میں وعدے سے نہیں مکرنا چاہتا۔ میں تجھے ضرور پڑھاؤں گا۔ مگر ایک شرط ہے۔'' صادق کا لہجہ بڑا الجھا الجھا سا تھا۔

''کیا؟'' زہرہ کے لب کپکپائے۔ وہ تو سمجھ رہی تھی صادق بھڑک اٹھے گا، طوفان آ جائے گا مگر ایسا تو نہ ہوا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے زیادہ نرم گفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھے گئی۔

''دیکھ زہرہ میں جاہل ہوں، بالکل گنوار۔ یہ تو نہیں ہو گا کہ تو پڑھ لکھ کر مجھ سے علیحدہ ہو جائے۔ مجھے ان پڑھ ہونے کے طعنے دے گی...؟''

''نہیں صادق نہیں۔ یہ خیال ہی تمہارے دل میں کیوں آیا؟'' زہرہ چیخ پڑی۔

''صادق! تم میرے مجازی خدا ہو۔ میرا چھتر سایا ہو اور تم تو میرا شوق پورا کرو گے۔ میں اتنی کم ظرف نہیں کہ کسی اور کی ہو جاؤں، بالکل نہیں۔ میں نہیں پڑھوں گی۔ میں اپنے اس شوق کو ذہن سے کھرچ

ڈالوں جی۔ بس تم کوئی غلط خیال دل میں مت لانا صادق۔'' زہرہ اس کے کندھے سے سر ٹیک کر رو دی۔

''پھر بھی میں نے کہا کیا ہے؟'' صادق اس کے رونے سے پریشان ہو گیا۔

''بس اب کوئی ذکر نہیں ہوگا۔'' زہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بہتر سرکار۔ اب جلدی سے کھانا لاؤ بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔'' صادق نے شرارت سے کہا تو وہ روتے روتے مسکرا دی۔

☆......☆

ان کی شادی کو پورا سوا برس بیت گیا تھا اور وہ صادق کے سنگ بہت خوش تھی۔ آپا اور باجی بھی ان کے گھر آتیں تو اس بیاہتی زہرہ کو اتنی خوش اسلوبی اور سگھڑاپے سے گھر سنبھالے دیکھ کر حیران رہ جاتیں۔ جو کبھی بھی لڑ بھڑ کر اماں کے پاس نہیں جاتی تھی۔ اماں روکتیں بھی تو اسے صادق کے ڈھیروں کام یاد آ جاتے اور بالکل نہ ٹھہرتی۔

اس روز تو زہرہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ صادق نے اسے میٹرک کی کتابوں کا پورا کورس لا کر دیا تھا۔ اور بورڈ سے جا کر رجسٹریشن فارم اور ایگزامینیشن فارم بھی لے آیا تھا۔ حالانکہ زہرہ انکار کرتی رہ گئی مگر اس نے زبردستی اس سے فارم پر کروائے اور خود ہی جا کر جمع بھی کروا آیا۔ اس کا اب زیادہ سے زیادہ خیال رکھتا۔ ہاتھ بٹاتا۔ دونوں مل جل کر کام کرتے اور جب فارغ ہو جاتے تو وہ زہرہ کو پڑھنے بٹھا دیتا اور خود بیٹھا بس اسے تکتا رہتا اور زہرہ اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا گھبرا جاتی۔

امتحان کے دنوں میں بھی جب وہ پڑھتی تب صادق اس کے لیے بار بار چائے بنا کر لاتا اور وہ منع کرتی رہ جاتی۔ جس صبح پیپر ہوتا صادق خود ہی ناشتا تیار کرتا اور وہ مارے شرم کے گڑ گڑ جاتی۔ مگر کیا کرتی۔ وہ ہاتھ ہی نہ لگانے دیتا تھا۔ صبح وہ اسے خود سینٹر چھوڑ کر آتا اور لے بھی جاتا۔ فیکٹری سے اس نے چھٹی لے رکھی تھی اور بس زہرہ کی نوکری کر رہا تھا۔

اس روز زہرہ کا آخری پرچہ تھا۔ وہ پیپر دے کر باہر نکلی تو صادق ہمیشہ کی طرح باہر گیٹ پر اس کا منتظر تھا۔

''کیسا ہوا پرچہ؟'' وہ ہمیشہ کی طرح بے صبری سے پوچھ رہا تھا۔

''بہت اچھا۔'' زہرہ نے جواب دیا۔

''یعنی سب پرچے اچھے ہو گئے اس سال میری زہرہ دس پاس کر ہی لے گی۔ بلے بلے۔'' وہ شوخی سے بولا تو وہ مسکرا دی۔

''آج تم کو آئس کریم کھلاؤں گا۔''

''نہیں صادق چلیں۔''

''کیوں؟'' وہ غرایا۔

''لوگ کیا کہیں گے۔ ہاتھ میں کتابیں بھی ہیں۔'' زہرہ نے کہا۔

''لوگوں کی ایسی تیسی۔ آخر ہم میاں بیوی ہیں۔'' صادق نے تیز لہجے میں کہا۔

''نکاح نامہ تو ماتھے پر لگانے سے رہے۔'' زہرہ نے سمجھانا چاہا۔

''یہ تو ہے۔'' صادق پرسوچ لہجے میں بولا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ گھر چل کر تم کھیر پکا کر کھلاؤ۔ سچ اپنے ہاتھ کا پکا کھا کھا کر تو پریشان ہو گیا ہوں۔ آج سے میرا کام ختم ہاں۔'' صادق نے کہا۔

''میں بھی یہی کہنے والی تھی۔'' زہرہ نے کہا۔

''چل جھوٹی۔'' صادق نے شوخی سے کہا اور پھر گزرتے رکشے کو آواز دے کر روکا۔ اور دونوں گھر آ گئے۔

☆......☆

زہرہ کی نظریں اب بھی احساس تشکر کے طور پر صادق کے سامنے جھکی رہتیں۔ وہ جو اماں سے کہتی تھی وہ پاگل کا پٹھا میرے کیا شوق پورے کرے گا مگر وہ تو اس کے خیالوں سے بھی بلند نکلا۔ صادق کے بس میں نہیں تھا کہ اس کے لیے آسمان سے تارے توڑ لائے۔ بس کبھی کبھی وہ ایک دم سنجیدہ ہو جاتا اور کہتا۔

''تو پڑھ لکھ کر مجھ سے دور تو نہیں ہو جائے گی؟''

تب زہرہ عقیدت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگتی اور

صادق ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

''بس تو ہنستی رہا کر میری بڑھیا تو تو ہنسنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔'' اور وہ اس کے بڑھیا کہنے پر بہت خوش ہوتی۔

جس روز اس کا میٹرک کا رزلٹ نکلا تو صادق نے لڈو پورے محلے میں بانٹے تھے۔ حالانکہ زہرہ نے منع بھی کیا تھا کہ سیکنڈ ڈویژن تو آئی ہے۔ کون سا میں نے ٹاپ کیا تھا۔

''اب تو آگے بھی پڑھنا زہرہ۔'' وہ نہایت محبت سے بولا۔

''جو حکم۔''

''یہ حکم نہیں ہے میری خواہش ہے۔'' صادق نے کہا۔

''تمہاری خواہش مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے صادق۔'' زہرہ نے اس کے کندھے سے سر ٹیک کر محبت سے چور لہجے میں کہا۔

''صادق مجھے ٹیچر بننے کا بہت شوق ہے۔ اسکول میں بچوں کو پڑھانے کا۔''

''کوئی ضروری نہیں۔ میں نوکری نہیں کروانا چاہتا۔'' وہ چمک کر بولا۔

''تمہیں میرے شوق کا احساس نہیں۔'' زہرہ نے منہ بنایا۔

''ہے بابا۔ اب نا رو دو تم۔ لے لینا داخلہ۔ بس تو رویا نہ کر۔'' صادق اس کی آنکھوں میں جھلملاتے موتی دیکھ کر ہمیشہ تڑپ کر رہ جاتا۔ ''ویسے تم تو ابھی خود پڑھ رہی ہو کیا خاک پڑھاؤ گی؟'' وہ شوخی سے بولا۔

...... اور پھر یوں زہرہ نے ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ساتھ انٹر کی تیاری بھی کرنے لگی۔ صبح دونوں میاں بیوی اکٹھے ہی گھر سے نکل جاتے۔ زہرہ کی دو بجے واپسی ہوتی اور صادق تو وہی پانچ بجے ہی واپس آتا تھا۔

دونوں کی زندگی مخصوص رفتار سے گزرنے لگی۔

زہرہ نے ضد کر کے صادق سے بہت سی باتیں منوالیں۔ پی ٹی سی کرنے کے بعد گھر سے قریب پرائمری اسکول میں وہ پڑھانے لگی۔ بہت مشکل سے اس نے صادق کو راضی کیا تھا اور اسے بھی زہرہ کی خوشی عزیز تھی۔ وہ بھی اس کی ہر بات ماننا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اسکول میں وہ ننھے ننھے بچوں کو پڑھاتی تو انجانا من انہونی سی خواہشات کرنے لگتا۔ ایک دم ہی سے بچوں کی خواہش اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اسے اب شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ چار سال سے اوپر ہونے کو آئے تھے۔ اس کی گود پھولوں سے محروم تھی۔ البتہ ان چار سالوں میں وہ چار جماعتیں پڑھ لی تھی۔ پی ٹی سی کرلی تھی مگر وہ جو عورت کی ازلی خواہش ہے وہ بار بار چٹکیاں لیتی۔ اسے اپنا آنگن سونا لگتا اور اس سونے آنگن کا اسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ اسے گم صم دیکھ کر صادق اس پر اپنی محبت کے بے تحاشا پھول نچھاور کرتا مگر وہ گم صم رہتی۔ اس کی محبت کی شدتوں کا جواب بھی بڑی بے دلی سے دیتی اور وہ کچھ بھی نہ کہتا۔

اور پھر ایک روز اس نے اپنی عمر کا حساب لگایا خود ہی شرما گئی۔

''ابھی عمر ہی کیا ہے ابھی۔ ابھی تو بیسواں سن لگا تھا اور لڑکیوں کی تو اس عمر میں شادی بھی نہیں ہوتی۔ لو میں تو یوں پریشان ہوگئی جیسے چالیس سال کی ہوگئی ہوں۔'' اس نے خود کو سرزنش کی اور پھر پہلے جیسی ہنستی مسکراتی زہرہ بن گئی۔

اب بھی وہ صادق کی محبت کے پھول بہت گرم جوشی سے سمیٹتی۔

☆...☆

اس روز وہ بہت بے قرار تھی۔ اسکول میں بھی اس نے نہایت بے دلی سے پڑھایا۔

گھر آئی تو بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ پھر بھی کھانا تیار کیا۔ بس بار بار دل بھر آرہا تھا۔ اس بے چینی اور بے قراری کی وجہ اس کی بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی۔ سہ پہر کو گلی میں ایک شور سا مچ گیا اور دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ تڑپ کر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر دھمک ماری ہو۔

لرزتے کانپتے قدموں سے وہ دروازے پر گئی۔

''کون صاحب؟'' اس کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔

''بیگم صادق ہیں؟''

اور زہرہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ڈھیروں لوگ کھڑے تھے اور سامنے ہی ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔

''ہمیں نہایت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اسپتال پہنچایا گیا مگر وہ کوئی طبی امداد پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئے۔ ان کی جیب کے شناختی کارڈ۔۔۔''

وہ شخص نہایت دکھے دکھے لہجے میں بول رہا تھا مگر وہ کب سن رہی تھی۔ وہ تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسٹریچر کو تک رہی تھی جس پر سفید چادر سے منہ ڈھانپے اس کا صادق ابدی نیند سویا ہوا تھا۔ دل میں تو خون کی ندیاں بہہ گئیں، روح میں دراڑیں پڑ گئیں۔

اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اس کا چھوٹا سا آنگن بھر گیا بہنیں بھی آ گئیں اور جب اماں آئیں تو وہ ان سے لپٹ کر اس طرح روئی جیسے اس کا اپنا آپ آنسوؤں میں بہہ جائے گا۔

جب اس کی چوڑیوں کو توڑا گیا اور سفید دوپٹہ اوڑھایا گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

صادق اسے کبھی سفید لباس نہیں پہننے دیتا تھا اور اب اسے تمام عمر کے لئے اس نے سفید لباس پہنا دیا تھا۔ پھر اسے اپنا ہوش نہ رہا۔ کب صادق کو آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا گیا۔ وہ بھی پھٹی پھٹی نظروں سے سب تکے گئی۔

سوئم، دسواں، چالیسواں ہوا اور وہ نہایت اجڑی اجڑی سی سب کچھ دیکھتی رہی۔

صادق کی فیکٹری کے مالک سیٹھ نوید خود آئے تھے اور اس عین جوانی کی دہلیز پار کرنے والی بیوہ کو دیکھ رہے تھے۔ اس بیوہ سے تو ان کی ارم ہی بڑی تھی اور یہ اپنی ازدواجی زندگی کے صرف پانچ سال گزار کر بیوہ بھی ہو گئی تھی۔

سیٹھ نوید سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتے تھے۔ بس یہ ہے کہ اور مزدوروں کی بیواؤں کی نسبت زہرہ کو معاوضہ زیادہ دیا گیا۔ پورے پانچ لاکھ کا چیک انہوں نے بھجوایا تھا۔

عدت گزرنے کے بعد زہرہ نے کوارٹر خالی کر دیا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اماں بی کے ہاں آ گئی۔ یہاں تو اس کا دل ہی نہ لگتا تھا۔

وہ پیچھے دیکھتی تو ہمیشہ اپنی روح کو اسی چھوٹے سے کوارٹر کے لئے بے قرار پاتی۔ صادق کی یاد تو کسی لمحے بھی اسے نہ بھولتی۔

اس نے فیکٹری سے ملنے والی رقم صادق کی آپا کو دے دی تھی جنہوں نے تمام مصیبتیں صادق کے لئے سہی تھیں اور اسے پال پوس کے بڑا کیا تھا۔ زیادہ حق تو انہی کا بنتا تھا۔

اور زہرہ تو خود سروس کرتی تھی۔ پھر بھلا کیسے وہ سب اپنے پاس رکھتی۔ حالانکہ بہنوں نے بہت سمجھایا تھا مگر وہ پھر وہی گئے دنوں کی اکھڑ سی زہرہ بن گئی تھی، جو سب کے سامنے بولتی تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ یہ پیسہ مجھے میرا صادق تو نہیں دے سکتا۔ آپا کی ضروریات تو اس رقم سے پوری ہو سکتی ہیں۔ کسی بھی لمحے صادق کی یاد اس کے دل سے محو نہ ہوئی۔ روح کی گہرائیوں تک میں اس کی یادیں اتری ہوئی تھیں، اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا صادق کے نقوش دل پر انمٹ ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی تنہا ہوتی صادق کے متعلق ہی سوچتی۔ لاشعوری طور پر شام کو پانچ بجے کے بعد صادق کا انتظار کرتی یہاں تک کہ شام بھی رات کا لبادہ اوڑھ لیتی۔ تب اسے خیال آتا کہ صادق ایسی جگہ گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

پھر اس نے خود کو کتابوں میں گم کر لیا۔ صادق کو بھی تو شوق تھا کہ وہ پڑھے اور وہ پڑھ رہی تھی..... اور وقت خود اس کا زخمی لاشہ اٹھائے گزر رہا تھا۔

اماں اب دبے دبے الفاظ میں اس سے کہتیں بھی کہ وہ شادی کر لے۔ پہاڑ جیسی جوانی بھلا کیسے کاٹنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



گی مگر وہ ہمیشہ انکار کر دیتی۔ اماں بی خاموش ہو جاتیں۔ وہ کہتی۔

’’اماں بی! لڑکی صرف ایک بار سہاگن بنتی ہے۔ ایک ہی شخص کی مہندی اُس کے ہاتھوں پر رچتی ہے۔

اور دل کی دیواروں پر ہر خانے میں صرف ایک ہی نام چسپاں ہو سکتا ہے۔ اور اب کوئی بھی صادق کا نام میرے دل سے نہیں کھرچ سکتا۔‘‘

’’آخر اور لڑکیوں کی بعض مرتبہ دو شادیاں بھی تو ہوتی ہیں۔‘‘ اماں بی کہتیں۔

’’اماں وہ تا عمر خود کو اور اپنے شوہروں کو دھوکا دیتی ہیں۔ ان کے دلوں سے ان کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کا نام کبھی نہیں مٹتا۔ اور میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ میں دوہری زندگی نہیں گزار سکتی آپ مجھے آئندہ کبھی مت کہیے گا۔‘‘ زہرہ رسان سے کہتی۔

اور پھر واقعی اماں بی نے اسے پھر کچھ نہ کہا۔

زہرہ نے اپنی زندگی بہن بھائیوں کے لئے وقف کر دی۔ ہر ماہ پوری تنخواہ اماں کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتی۔ اب وہ اپنے بابو جی کا بازو تھی۔

بعض مرتبہ زہرہ کے گرد سوچیں ناگ کی طرح پھن پھیلائے آجاتیں۔

گئے دنوں کی ٹپ کھٹ زہرہ بھی تو بابو جی کا بازو بننا چاہتی تھی۔ تب تک کسی صادق کا نام اس کے من کے کورے کاغذ پر نہیں لکھا گیا تھا۔ یہ تبھی کی بات تھی۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کا شوق پورا بھی کیا تو کب۔ اس کا گھر اجڑ گیا تھا۔ سہاگ انجانے دیس چلا گیا تھا۔

شاید صادق سے میری شادی محض میری پڑھائی کی وجہ ہی سے ہوئی تھی۔ وہ شدت سے یہ سوچتی نہ جانے خدا کی کیا مصلحت تھی۔

اس نے بی ایڈ کر لیا تو اپنے ہی اسکول میں اسے ہیڈ مسٹریس بنا دیا گیا۔ کیونکہ پہلے والی ہیڈ مسٹریس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ قطر جا رہی تھی۔

پھر ڈھیر سارا وقت گزر گیا۔

اماں بی اس کا گھر بسنے کا ارمان لئے قبر کی تاریکیوں میں گم ہو گئیں اور وہ اپنے صادق کی یاد دل کو سینے سے لگائے رہی۔

☆......☆

اس روز وہ اسکول کا راؤنڈ لے کر اپنے آفس میں بیٹھی ہی تھی کہ چپڑاسی نے اطلاع دی کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔

’’بھیج دو۔‘‘ زہرہ نے کہا۔ ان دنوں اسکولز میں داخلے ہو رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی اسی وجہ سے آیا ہوگا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اور پھر آنے والا چق اٹھا کر اندر آگیا۔

’’آداب۔‘‘

’’آداب! تشریف رکھئے۔‘‘ اس نے بدستور رجسٹر پر نظر جمائے کہا۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔

’’ہاں تو آپ......‘‘ سر اٹھایا اور پھر اسے یوں لگا جیسے کہ وہ بولنا بھول گئی ہو۔ مارے حیرت کے اس کا چشمہ ڈھلکا جا رہا تھا اسے اپنا کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

سامنے ہی وہ جدید تراش کا سوٹ پہنے نفاست سے بال سنوارے، متبسم ہونٹ اور آنکھوں میں خیرہ کر دینے والی چمک لئے...... وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تک رہا تھا۔

’’پہچانا نہیں؟‘‘ وہ مسکرایا۔

’’صا......د......ق......‘‘ زہرہ کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

’’زہرہ...... میری زہرہ تم بہت گریٹ ہو۔ خدا کی قسم تم جیسی کوئی عورت بھی نہیں ہو سکتی۔ زہرہ...... تم آزمائش پر پوری اتری ہو۔ مجھے فخر ہے۔‘‘ وہ بہت خوش تھا۔

’’آزمائش......‘‘ زہرہ کے لب کپکپائے۔ وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

’’ہاں زہرہ میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ جب میں نے تم کو تمہارا شوق دیکھتے ہوئے پڑھانا شروع کیا تو میرے ساتھیوں نے مذاق اڑایا انہوں نے کہا

کر دو سنت تم مت پڑھواؤ۔ وہ تم جیسے جاہل کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہے گی۔ مگر میں نہ مانا۔ مجھے تم بہت پیاری تھیں۔ پھر تم نے نوکری کی، جب دوستوں نے کہا کہ اب تو تمہاری بیوی یقیناً چلی جائے گی کیونکہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی ہے۔ میں ہمیشہ ان کی بات کی ان سنی کرتا۔ سب کہتے تم بھی آزماؤ، وہ نت نئے طریقے تمہیں آزمانے کے مجھے بتاتے۔ اور میں سوچتا کہ عمل کروں یا نہ۔ جس روز وہ حادثہ ہوا تھا، میں اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ جب منی اور بس ٹکرائی تھیں۔ زخمیوں کو ہسپتال لے جایا گیا تو میں بھی ساتھ چلا گیا۔ جس شخص کی لاش تمہارے پاس آئی تھی اس کا چہرہ بالکل مسخ ہو چکا تھا۔ اس کا کوئی نشان نہ تھا۔ میرے ذہن میں آزمائش.... آزمائش کی تکرار ہونے لگی۔ تب میں نے اپنا شناختی کارڈ چپکے سے اس کی خون آلود جیب میں ڈال دیا۔ اور یہ کسی نے نہ دیکھا۔ پھر میں نے قریب کھڑے وارڈ بوائے سے کہا کہ اس کی جیب میں دیکھو شاید کوئی کارڈ وارڈ مل جائے اور اس کی شناخت ہو سکے اور جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا کیونکہ کارڈ پر میری تصویر تھی اور پھر یوں وہ لاش صادق کی لاش بنا کر دفنا دی گئی۔ میں سب سے چھپ گیا۔ حتیٰ کہ دوستوں سے بھی۔ سیٹھ نے تم کو رقم دی اور تم نے وہ آپا کو پہنچا دی تو مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ تم واقعی عظیم ہو، ورنہ تم یہ کچھ نہ کرتیں۔ پھر میں آپا سے جا کر ملا۔ انہوں نے بہت چاہا کہ تمہیں بتا دیں مگر میں نے انہیں یہ کہہ کر باز رکھا کہ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں اور ان سے پانچ لاکھ لے کر میں ایجنٹ کے ذریعے باہر چلا گیا۔ آپا کو میں ہر ماہ خط لکھتا اور وہ مجھے ہر تمہارے متعلق پوری تفصیل سے خط لکھتیں۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں نے خود بھی پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا کیونکہ انسان صحبت سے بہت کچھ سیکھتا ہے نا... تم بہت عظیم ہو زہرہ.... بہت عظیم.... واقعی جیسا تم کہتی تھیں تم اس سے بھی بڑھ کر ہو۔'' صادق جذب سے بولتا چلا گیا۔

''صادق میں تو ایک ذرہ ہوں جسے تم نے آفتاب بنا دیا تھا مگر مجھے بہت افسوس ہے تم مجھے سمجھ سکے نہ سمجھ سکے۔'' زہرہ آہستہ سے بولی۔

''تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔'' صادق آگے بڑھا۔

''صادق تم کو معاف کرنے سے مجھے گزرے ہوئے سال واپس مل جائیں گے۔ میں نے جو تمہاری یاد میں آنسو بہائے ہیں اور ان آنسوؤں نے میری روح میں چھالے ڈال دیئے ہیں وہ مٹ جائیں گے؟ میں نے جو سرما کی طویل راتیں..... جاگ جاگ کر کاٹی ہیں کیا ان کروٹوں کا حساب مجھے مل سکتا ہے۔ بتاؤ صادق تمہیں معاف کرنے سے میں وہی نٹ کھٹ سی زہرہ بن سکتی ہوں۔'' زہرہ خود پر بہت ضبط کر رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ روئے نا۔

''زہرہ! ہم نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' صادق نے کہا۔

''نئی زندگی۔'' زہرہ تلخی سے ہنسی۔ ''صادق نئی زندگی کا تو میں نے سولہ سترہ برس پہلے آغاز کیا تھا۔ اب کون سی زندگی۔''

''زہرہ۔'' صادق کا لہجہ بجھ سا گیا۔

''نہیں صادق۔ میں اب کسی آزمائش کے لیے خود کو دار پر نہیں لٹکا سکتی۔ مجھے تم سے شدید نفرت ہے صادق۔ مجھے..... نفرت ہے تم سے۔''

''کیوں..... کیوں؟'' صادق چیخ پڑا۔

''عورت کا جو مان ہوتا ہے شوہر پر، جو اعتماد ہوتا ہے وہ اٹھ جائے تو کچھ نہیں رہتا۔ کاش صادق تم روپوش رہتے۔ میں تمہیں مردہ سمجھ کر تمہاری پوجا کرتی رہتی۔ تمہاری یاد میں آنسوؤں کے ہار پرو پرو کر تمہاری لحد پر چڑھاتی رہتی۔ تم نے جو مجھ پر احسان کیا تھا، مجھے پڑھایا تھا۔ صادق..... جن پر احسان کیا جاتا ہے ان کو اتنی بڑی آزمائش سے تو نہیں گزارا جاتا؟'' زہرہ کا لہجہ نہایت ٹوٹا ہوا تھا۔

''زہرہ!'' حیران و ششدر اسے دیکھے گیا۔

''ایک بار تم نے مجھے آزمایا تھا صادق..... اب میں تمہیں آزماؤں گی۔ جب ہم دونوں کے حقوق مساوی ہیں تو کیوں نہ میں بھی اپنا حق آزماؤں۔ تم بھی اتنے ہی سال کی سزا بھگتو۔ صادق اگر تم میری

آزمائش پر پورے اترے تو میں تمہارے ہاں آجاؤں گی۔'' زہرہ نے فیصلہ سنادیا۔

''زہرہ!'' صادق کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ہاں صادق میں بھی مرد کے ظرف کو آزما تو لوں۔'' زہرہ چٹانوں کی سی سختی سے بولی۔

''میں نے اتنے برس تم بن گزارے تو ہیں۔'' صادق نے یاد دلایا۔

''مگر تمہیں یہ امید تھی کہ جب تم اچانک میرے پاس آؤ گے تو میں بانہیں پھیلا کر تمہیں سمیٹ لوں گی۔ تم نے تو انتظار نہیں کیا۔ کانٹوں کے بستر پر نہیں سوئے۔ آنسو نہیں بہائے۔ تم تو اب یہ کام کرو گے۔ پہلے تو میری آزمائش تھی اب تمہاری آزمائش ہے۔'' زہرہ ہنس دی۔

صادق اسے دیکھتا رہ گیا۔ کبھی اس کے سامنے نہ بولنے والی زہرہ نے کس آزمائش میں ڈالا تھا اسے۔

''اب تم جا سکتے ہو۔'' زہرہ نے کہا اور صادق کچھ بھی نہ بول سکا۔ چند لمحے اس پتھر کو دیکھتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔

اور.... اور.... تب زہرہ میز پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسے یوں لگا جیسے آج واقعی اس کا صادق آج ہی اور ابھی مرا ہو۔

پھر کیا کچھ نہ ہوا۔ بابو جی نے گھر کا۔ بھائیوں نے سمجھایا۔ صادق نے کئی بار آکر معافی مانگی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہاں اب اس نے رنگین لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا شوہر زندہ تھا۔ اور اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔ اس روز چھٹی تھی اور صادق پھر اسے منانے آیا تھا۔

''صادق میں کہہ چکی ہوں کہ سات سال میرا انتظار کرو۔ میں خود تمہارے پاس آجاؤں گی۔'' زہرہ تلخی سے بولی۔

''زہرہ میری پہلی غلطی معاف نہیں کرو گی۔ پہلی غلطی تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔'' صادق گڑگڑایا۔

''پہلی غلطی جو کہ مسلسل سات برس تک ہوتی رہی ہے۔'' وہ تمسخر سے ہنسی۔

''خدا کے واسطے زہرہ!''

''اگر تم نے مجھے زیادہ پریشان کیا نا صادق.... تو.... تو میں تم سے طلاق کا مطالبہ کر دوں گی۔'' وہ نہایت سفاکی سے بولی۔

''ز.... ہر.... ہ'' صادق حیرت سے اسے دیکھے گیا اور پھر سینے پر ہاتھ رکھے جھکتا چلا گیا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی اور وہ یک ٹک زہرہ کو دیکھے جا رہا تھا۔

زہرہ نے اس کی حالت دیکھی لیکن بڑی بے رحمی سے منہ موڑ لیا۔ اس کا من کسی صورت اس بات پر آمادہ نہ تھا کہ وہ صادق کو اپنا لے۔ محبت کی دیوار تو اعتماد کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ جب اعتماد ہی نہ ہو تو محبت کا کیا کام؟

''ٹھیک ہے زہرہ جیسے تمہاری مرضی۔'' صادق نے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھا.... زہرہ بے حسی سے دیکھتی رہی۔ دروازے تک جاتے جاتے نہ جانے صادق کو کیا ہوا، وہ ایک دم تیزی سے مڑا اور زہرہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''مان جاؤ زہرہ مان جاؤ۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔

''نہیں نہیں۔'' زہرہ ہذیانی پن سے کہتی رہی۔ نہیں نہیں۔ صادق کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اچانک ہی اس کا ہاتھ اٹھا اور زہرہ کے چہرے پر پانچ انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔

زہرہ کو ایسا لگا جیسے ایک دم زلزلہ آگیا ہو۔ وہ ایک دم ہی چکرا گئی۔ اسے صادق سے یہ امید نہیں تھی۔

صادق بھی محجوب سا کھڑا تھا۔ اسے اب تو بالکل ناامیدی ہو چکی تھی۔ زہرہ تو پہلے ہی نہیں مان رہی تھی۔ اب تو وہ اور زیادہ ناراض ہو گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ نظریں اٹھائیں اور ڈرتے ڈرتے زہرہ کی طرف دیکھا۔

لیکن یہ کیا....!

زہرہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ صادق کی طرف بڑھی اور اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

عاشقوں کے امتحان



ایم قاسم بلوچ

خلوص پر محبت کو قربان کردینے والوں کی ایک داستان ٹوبہ ٹیک سنگھ سے

یہ تقریباً اٹھارہ سال پرانی باتیں ہیں مگر یادیں آج بھی زندہ ہیں۔

بسا اوقات انسان کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات اور حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن کو بھلانا اذیت بن جاتا ہے چاہے ان حالات و واقعات کو گزرے صدیاں ہی کیوں نہ گزر گئی ہوں اور کبھی کبھی یہ یادیں اتنا تڑپانے لگتی ہیں کہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے انسان ایک بار پھر ان گزرے حالات میں چلا گیا ہو۔

میٹرک کرنے کے بعد میں نے تین چار جگہوں پر نوکری کے لیے کوشش کی لیکن وہاں بات نہ بن سکی اور یوں انہی کوششوں میں چار سال گزر گئے۔ آخر میں نے اپنے ایک دوست کے مشورے سے اس کے گاؤں میں ایک پی سی او بنا لیا جس کا نام میں نے احسان PCO رکھا۔ PCO کو میں نے بہت ہی خوب صورت بنایا تھا۔ کیونکہ میں اس چھوٹے سے کام کو مستقل کرنا چاہ رہا تھا۔ جس پر میں نے بہت محنت کی میری محنت کی بدولت میرا یہ کام اچھا خاصا چلنے لگا تھا اور میں اس سے مطمئن ہو گیا۔ جس گاؤں میں میرا PCO تھا وہ ایک بہت بڑا گاؤں تھا جو ایک چھوٹے سے شہر کے ساتھ منسلک تھا جس کا نام یہاں لکھنا میں ضروری نہیں سمجھتا۔

یوں میں اپنے کام سے بہت مطمئن تھا اور اس کام کو میں لگن سے نبھا رہا تھا۔ PCO میں بہت زیادہ رش رہتا یہاں تک کہ کبھی کبھی رات کے بارہ بھی بج جاتے اور میں اپنے گھر جانے کے بجائے PCO میں ہی سو جاتا۔

زندگی کا یہ سفر بڑے سکون سے گزرنے لگا میں اکثر فارغ وقت میں اپنے دوست شکیل کو PCO میں بلا لیتا اور ہم گپ شپ لگاتے اور کبھی میں اس کے گھر چلا جاتا۔ شکیل میرا جگری دوست بھی تھا اور بھائی بھی۔ ہم دونوں کی دوستی اسکول کے زمانے کی تھی۔ پانچویں کلاس سے لے کر میٹرک تک ہم اکٹھے ہی پڑھے، میٹرک پاس کرنے کے بعد ہم دونوں نے اسکول چھوڑ دیا۔ میں شکیل کے گھر بلا جھجک چلا جایا کرتا کبھی بھی اس کے والدین نے اس بات کو برا محسوس نہ کیا تھا۔ شکیل کی طرح وہ بھی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ حالانکہ شکیل کی دو بہنیں بھی تھیں۔ اس طرح دن گزرتے رہے اور تین ماہ کا عرصہ گزر گیا تو اچانک مجھ پر ایک صدمہ آن پڑا جس نے مجھے اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔

میں صبح صبح PCO میں آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک ابو جان کی حالت خراب ہوئی اور پھر ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بھی مہلت نہ ملی اور ابو جان مجھے اس دنیا



میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ ماں تو پہلے ہی مجھے چھوڑ کر اس فانی دنیا سے جا چکی تھی اب باپ کا آخری سہارا بھی چھن گیا تھا۔ میں بہت رویا یہاں تک کہ اس صدمے کی وجہ سے مجھے پورا ایک ہفتہ بخار رہا۔ یہ صدمہ میں نے بہت اذیت اور مشکل سے برداشت کیا۔

انسان اپنی زندگی میں سب کچھ فتح کر سکتا ہے جب اس کے سر پر ماں باپ کا سایہ اور ان کی نیک دعائیں ہوں۔

میرے دوست شکیل نے اس دکھ میں میرا بہت ساتھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اب اکیلا رہ گیا ہوں تو اس نے مجھے کہا کہ احسان خود کو کبھی تنہا مت سمجھنا۔ میں جس طرح آج تمہارے ساتھ ہوں، ہمیشہ اسی طرح دوست اور بھائی بن کر رہوں گا۔

تقریباً اس صدمے کے گزرنے کے بیس دن بعد میں دوبارہ اپنے PCO پر آیا۔ دن گزرنے لگے اور ساتھ ساتھ باپ کی جدائی کا جو غم میرے سینے میں تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا تھا۔ میں روز اپنے والدین کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعا مانگتا۔

ایک دن صبح میری پھوپو کے بیٹے سہیل کا مجھے فون آیا سلام دعا کے بعد سہیل کہنے لگا۔ ''احسان تم کچھ دنوں کے لیے ہمارے ہاں آجاؤ۔ ایک تو ہم مل لیں گے دوسرا ہم دونوں نے کہیں جانا ہے۔''

میں نے سہیل سے پوچھا کہ جانا کہاں ہے۔ تو اس نے اس بات پر معذرت کر لی اور کہنے لگا کہ جب تم یہاں آجاؤ گے تو بتا دوں گا۔ میں نے چپ رہنا ہی بہتر جانا اور اس کو ہاں کر دی کہ میں کل صبح آجاؤں گا اور فون بند کر دیا۔

یوں میں نے PCO جگری دوست شکیل کے حوالے کیا اور اگلی صبح اپنے کزن کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆

دو گھنٹے کا سفر تھا جو جلد ہی گزر گیا اور میں سہیل کے گھر جا پہنچا۔ سبھی گھر والے بڑی محبت سے ملے۔ پھوپو جی تو میرے گلے لگ کر روئیں، مجھے بھی اس وقت ابو کی یاد آ گئی۔ پھوپو نے مجھے تسلی دی اور کہنے لگیں۔ ''بیٹا صبر کرو یہ دن تو ہر انسان پر آتا ہے۔ ہم اس کو روک تو نہیں سکتے ناں۔''

میں چپ ہوا تو بولا میں سہیل بڑی گرم جوشی سے مجھے

ملا۔ وہ بہت خوش تھا میرے آنے سے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم گپ شپ کے لیے بیٹھے تو میں نے سہیل سے کہا۔ ''سہیل تم نے فون پر مجھے کہا تھا کہ ہم نے کہیں جانا ہے تو اب بتاؤ کہ کہاں جانا ہے؟''

وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ''میرے دوھیالی رشتے دار ہیں۔ ان کے ہاں ایک شادی ہے وہاں جانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے یار پر مجھے ان لوگوں نے کون سا شادی میں بلایا ہے اور مجھے تو عجیب سا لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔''

سہیل کہنے لگا۔ ''یار احسان تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ تم میرے ساتھ جاؤ گے اگر میں اکیلا جاتا تو مزا نہیں آتا۔ میں نے یہی سوچ کر آپ کو فون کیا تھا کہ مل کر جائیں گے تو مزا آئے گا اور دوسری بات یہ ابو کے عزیزوں سے آپ کی واقفیت بھی ہو جائے گی۔''

مجبوراً مجھے ہاں کرنی پڑی اور پھر ہم دونوں ان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم دونوں ایک اڈے پر اترے تو سہیل نے ایک PCO سے اپنے ایک عزیز کو فون کیا اور پھر چند منٹ بعد ایک لڑکا ہمیں بائیک پر لینے آ گیا اور ہم بہت بڑے گھر کے پاس جا کر اترے۔ وہ لڑکا ہمیں اندر لے گیا۔ یہاں پہلے ہی بہت سارے مہمان موجود تھے۔ ہم دونوں بھی ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔

پھر کچھ لوگ ہم سے ملنے آئے تو سہیل نے ان لوگوں سے میرا تعارف بھی کروا دیا۔ سہیل مجھے ایک اور کمرے میں لے گیا جہاں صرف لڑکیاں موجود تھیں جو ایک دوسرے کے ہاتھوں پر مہندی لگانے میں مصروف تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ چونک گئیں۔ سہیل ان سب لڑکیوں کو ملا۔ وہ اس کی کزنز تھیں میں نے سلام پر ہی اکتفا کیا کیونکہ میں ان کو جانتا نہیں تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھیں۔

ہم پھر واپس آ کر بیٹھ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ ایک لڑکی ہمارے لیے چائے بسکٹ لے کر آئی۔ ہم چائے پینے لگے تو اسی دوران ایک لڑکا جو شاید سہیل کا کزن تھا وہ اندر آیا اور ہمیں بتانے لگا کہ کھانا کھلانے کے بعد ہم سب نے یہاں سے بڑی کوٹھی میں چلے جانا ہے، جہاں پر شادی کا پروگرام ہو گا اور کل وہیں پر مہندی کی رسم بھی ہوگی۔

سہیل نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

جب ہم نے کھانا کھا لیا تو وہ لڑکا ہمیں لے کر اس کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ یہ کوٹھی گاؤں سے باہر ان کی زمین میں تھی اور بہت ہی خوب صورت اور بہت بڑی کوٹھی تھی۔ خاص طور پر یہ کوٹھی کے اردگرد ہرے بھرے کھیت ہونے کی بدولت کوٹھی اور بھی پیاری لگ رہی تھی جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں اور بھی زیادہ مہمان موجود تھے جن میں زیادہ تر لڑکیاں ہی تھیں اور ان ہی میں وہ لڑکی بھی موجود تھی جو ہمارے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ بے حد حسین لڑکی تھی۔

میں نے سہیل سے پوچھا۔ ''یہ لڑکی آپ کی عزیزہ ہے؟''

سہیل نے بتایا۔ ''نہیں میں تو خود آج اس کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ پتا نہیں کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔''

وہ لڑکی سب لڑکیوں سے جدا لگتی تھی۔ گوری رنگت، درمیانہ قد، گھنے سیاہ بال، گول سا چہرہ اور سادگی پسند۔ اس نے ہلکی سی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی میری نظروں کو اس کی یہ تمام ادائیں بھا گئی تھیں۔ وہ جہاں بھی جاتی میری نظریں اس کے ساتھ ساتھ ہوتیں۔

ایک بار وہ لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی تو میں اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ بال سنوار کر پیچھے ہٹی تو اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی تو وہ ایک دم مسکرائی اور پھر شرماتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا خوب صورت چہرہ چھپا لیا اور ایک کمرے میں تیز قدموں کے ساتھ چلی گئی۔

میری بھی ہنسی نکل گئی۔ اس حسین منظر نے میرے دل میں ہلچل سی پیدا کر دی۔ میرا دل تیز دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکنے لگا اور آنکھیں تھیں کہ مدہوش ہو کر رہ گئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار ایسا پیارا اور حسین منظر دیکھنے کو ملا تھا۔

شام ہوئی تو کوٹھی کو رنگ برنگی روشنیوں سے سجا دیا گیا۔ روشنیوں سے کوٹھی کی رونق اور بھی بڑھ گئی تھی جو دل کو بہت اچھی لگ رہی تھی دل کر رہا تھا کہ یہ سجاوٹ یونہی سجی رہے اور کبھی ختم نہ ہو اور پھر اس میں موجود خوب صورت سے لوگ جو اس رونق کا حصہ بنے ہوئے تھے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ہر کوئی بات اخلاق سے بات کر رہا تھا ایک بار تو

میں اپنے سارے غم بھول گیا تھا اور مجھے زندگی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ سبھی لوگ اپنی اپنی محفل سجا کے بیٹھے ہوئے تھے جب کہ میں اور سہیل بھی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ تھوڑی دیر بعد سہیل کی ایک کزن ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس سے گھر کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا اور چوری چوری اس لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا بس کبھی کبھی اس کی جھلک نظر آ جاتی۔ ایک دو بار مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ بھی چور نظروں سے مجھے دیکھتی ہے۔ باتوں باتوں میں جب وہ لڑکی ہمارے سامنے سے گزری تو سہیل نے اپنی کزن سے پوچھ لیا کہ خالدہ یہ پیاری سی لڑکی کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ پہلے تو میں نے کبھی اس لڑکی کو آپ کے گھر میں نہیں دیکھا۔"

خالدہ کہنے لگی۔ "یہ میری دوست ہے پہلے یہ ہمارے گھر میں رہتی تھی اپنی نانی کے ساتھ۔ اب یہ اوکاڑہ شہر میں چلی گئی ہے اپنے ابو کے پاس۔ اس کی امی بے چاری کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی ہے۔ اب اس کے ابو نے دوسری شادی رچالی ہے لیکن اس کی دوسری امی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی اور یہ بے چاری اپنے ہی گھر میں خود کو اکیلا محسوس کرتی ہے۔ ابھی بھائی کی شادی پر میں نے اس کو بلایا ہے۔ میرا بھی اس کو ملنے کے لیے بہت دل کر رہا تھا۔ اب یہ کچھ دن یہاں رہے گی پھر ہم اس کو چھوڑنے اس کے گھر جائیں گے۔"

اس لڑکی کے بارے میں یہ سب جان کر مجھے بہت دکھ ہوا۔

اس لڑکی کے لیے میرے دل میں اب ایک کشش سی پیدا ہونے لگی تھی۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اس لڑکی سے دکھ درد باتوں جب کہ میں بھی تو ان ہی دکھوں میں گھرا ہوا انسان تھا۔ اب مجھے اپنی پروا بھول رہی تھی اور دل اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اپنی کزن سے باتیں کرتے ہوئے سہیل نے اس خوب صورت لڑکی کا نام بھی پوچھ لیا تو خالدہ نے حیران کن نظروں سے سہیل کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

"سہیل کیا بات ہے تم اس لڑکی کے بارے میں کیوں اتنا کچھ پوچھ رہے ہو۔ کیا تم کو وہ لڑکی پسند آ گئی ہے؟"

یہ سن کر میرا دل بھی [illegible] میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور ان کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرے تب ہی سہیل ہنس کر اپنی کزن خالدہ کو کہنے لگا۔

"خدا معاف کرے میں ایسا کیوں سوچوں اس کے بارے میں، میں نے ویسے ہی نام پوچھا ہے۔"

خالدہ نے بتایا۔ "اس کا نام کرن ہے۔" میں بھی اس کا نام جاننا چاہ رہا تھا۔ میری یہ مشکل سہیل اور خالدہ نے حل کر دی تھی۔ پھر خالدہ کو ایک لڑکی نے آواز دے کر بلا لیا اور ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میں کرن کے خیالوں میں گم تھا کہ سہیل آ گیا اور کہنے لگا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ تھوڑی دیر بعد مہندی کی رسم شروع ہونے والی ہے۔ تم نے اس رسم میں برابر کا شریک ہونا ہے۔"

میں اٹھا اور آدھے گھنٹے بعد طرح تیار ہو کر آ گیا۔ یوں مہندی کی رسم شروع ہوئی امجد کو صحن میں ایک کرسی پر بٹھایا گیا۔ سب نے باری باری اس کو مہندی لگائی اور پھر گانوں اور ناچ گانا شروع ہو گیا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور تھوڑا شرما رہا تھا اس لیے میں ان لوگوں سے الگ ہو کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک سہیل اور خالدہ کی مجھ پر نظر پڑ گئی وہ دونوں میری طرف آئے اور کہنے لگے۔ "احسان حیرت ہے تم یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو، چلو تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ۔" دونوں زبردستی کھینچ کر ان لوگوں کے پاس لے گئے۔

کافی دیر تک ناچ گانا چلتا رہا۔ کچھ لوگ تو تھک کر بیٹھ گئے اور کچھ ابھی بھی ناچ گا رہے تھے۔

یوں خالدہ، کرن، سہیل اور میں ایک الگ جگہ پر جا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ سہیل نے خالدہ کو کہا۔ "ہم اب بہت تھک گئے ہیں لہٰذا ہمیں چائے پلائی جائے تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔"

"چائے کے نام پر خالدہ کہنے لگی۔ "میں کرن کو کہتی ہوں، آپ کو اچھی سی چائے بنا کر دے اور اس کو چائے بنانے کا ویسے ہی بہت شوق ہے اور اچھی چائے بناتی ہے۔"

میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "خالدہ تم ٹھیک کہتی ہو کرن جی تو چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔ دوپہر کو جو چائے ہم نے پی تھی وہ بہت مزیدار تھی۔" یہ سن کر کرن مسکرا دی اور اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی۔

چائے پینے کے بعد ہم سب سو گئے اگلی صبح بارات جانی تھی یوں صبح ہوئی تو سب لوگ بارات کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ سہیل نے مجھے کہا کہ تم بھی تیار ہو جاؤ بارات کے ساتھ جانا ہے لیکن میں نے معذرت کر لی اس نے وجہ پوچھی تو میں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر لیا۔ پھر سب لوگ تیار ہوئے اور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ میں اس وقت کوٹھی کے مین گیٹ کے باہر کھڑا سب کو دیکھ رہا تھا۔

اصل میں، میں صرف کرن کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ وہ سب سے آخر میں تھی اس کو دیکھ کر میں گیٹ کے اندر کی طرف چلا گیا اچھا موقع تھا اور میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی تو کہنے لگی۔ ''آپ یہاں کیوں کھڑے ہو کیا بارات کے ساتھ نہیں جانا۔''

میں نے اس کو بتایا۔ ''نہیں میں یہاں پر ہوں دراصل میرا دل نہیں کر رہا اور ویسے بھی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' دل چاہ رہا تھا کہ اس کو بھی روک لوں یہاں اکیلے میں اس سے بہت ساری باتیں کر سکوں لیکن ایسا کہاں ممکن تھا شاید سوچوں اور خیالوں میں جہاں انسان بہت کچھ سوچتا ہے۔

میری بات سن کر کرن کہنے لگی۔ ''تو یہاں اکیلے کس طرح وقت گزارو گے۔''

میں نے کہا۔ ''وقت کو اگر ہم نہ بھی گزارنا چاہیں تو بھی گزر جاتا ہے بس اسی طرح میرا بھی وقت یہاں گزر جائے گا۔''

کرن نے خدا حافظ کہا اور گاڑی کی طرف چل دی۔

اب یہاں میں واقعی اکیلا تھا اگر ساتھ کچھ تھا تو کرن کی سوچیں اور اس کی یاد اس کی خوب صورتی نے میرے جسم و جان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس کی خوب صورتی نے مجھے مکمل طور پر اپنی قید میں جکڑ لیا تھا۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ جو بھی ہوگا کرن کے ساتھ تعلق بڑھاؤں گا اور اس کے دکھ بانٹوں گا اور اپنے دکھ اس کو سناؤں گا۔

ہم دونوں نے دولہا کو کچھ تحفے وغیرہ دیئے جو ہم ان کے لیے لائے تھے۔ اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور یوں شادی کا یہ مختصر سا سفر ختم ہو گیا۔

☆......☆

اگلی صبح بہت سارے مہمان رخصت ہو گئے اور تھوڑے سے مہمان ابھی بھی یہاں موجود تھے جن میں ہم دونوں بھی تھے اور خوشی کی بات یہ بھی تھی کہ کرن بھی موجود تھی۔ کرن کے خیالوں میں، میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ سارے غم، ساری پریشانیاں یہاں تک کہ اپنے جگری دوست شکیل کو بھلائے بیٹھا تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ فون کر کے اس کی خیریت ہی معلوم کر لیتا۔ بس مجھے ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح کرن کو اپنا فون نمبر اور ایڈریس دے سکوں تاکہ چلے جانے کے بعد ہم رابطہ کر سکیں۔

وہ تقریباً بارات کے دس بجے کا ٹائم تھا سبھی لوگ دلہن والے کمرے میں موجود تھے کہ اچانک میں نے کرن کو کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا یہی مناسب وقت ہے اور میں بھی نظریں چرا کر اس کے پاس کچن میں چلا گیا۔ میں نے اس کو سلام کیا تو وہ چونک گئی پھر نظر مجھ پر پڑی تو مسکرا دی۔ میں نے پوچھا۔ ''کرن کیسی ہو۔''

وہ کہنے لگی۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کرن میں تمہیں کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر تم برا نہ محسوس کرو تو۔''

وہ کہنے لگی۔ ''آپ کہو جو کہنا چاہتے ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کرن سے کہا۔ ''کیا تم جانے کے بعد مجھ سے رابطہ کرو گی۔''

کرن میری اس بات پر حیران ہوتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا میں آپ سے کس لحاظ سے رابطہ کروں۔ ہم تو ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں۔''

کرن کا جواب بالکل درست تھا۔ وہ بالکل سچ کہہ رہی تھی میں کچھ دیر کو خاموش رہا۔ پھر میں نے کرن کو اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کرن میں جانتا ہوں کہ ہم ایک دوسرے کے لیے

شام سے تھوڑی دیر پہلے بارات واپس لوٹ آئی۔ چھٹی ضرور تھی لیکن ایک دوست ہونے کے ناتے تو ہم

ایک دوسرے سے رابطہ کر سکتے ہیں۔"
میرے ان الفاظ سے وہ اور بھی حیران ہوئی۔ میں پھر اس سے مخاطب ہوا اور میں نے اس کو بتایا۔" کرن میں حقیقت میں تمہارے لیے اپنے دل میں ہمدردی دیکھتا ہوں۔ وقت بہت کم ہے کہیں کوئی دیکھ نہ لے اس لیے میں تمہیں اپنا فون نمبر اور ایڈریس لکھ کر دے دیتا ہوں اگر تم چاہو تو ضرور مجھ سے رابطہ کرنا میں انتظار کروں گا۔" وہ خاموش رہی تو میں نے جلدی سے اپنا فون نمبر اور خط کا پتا لکھ کر اس کو دے دیا۔ میری کسی بھی بات پر اس نے انکار نہیں کیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگا اور کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہو گئی تھیں کہ جیسے دل میں ہلچل سی مچ گئی ہو۔
میں سوچنے لگا کہ اب کیا کرن مجھ سے رابطہ کرے گی یا نہیں میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ خدا کرے وہ مجھے اپنا دوست مانتے ہوئے مجھ سے رابطہ کرے گی۔ کتنا عجیب اتفاق ہو گیا تھا کہ چند لمحوں کی قربت اور اس کی خوب صورتی نے مجھے اس کے کتنا قریب کر دیا تھا کہ میں اپنے اور اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنے لگا تھا۔ رات انہی خیالوں میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو ہم واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جاتے ہوئے میں کرن کو دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ میری اداس آنکھوں نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئی تھی۔ کاش میں جاتے ہوئے آخری بار اس کو دیکھ سکتا۔
پورے راستے میں بس میں خاموش ہی رہا تھا۔ سہیل نے کئی بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں چپ ہی رہا۔ آخر سہیل سے رہا نہ گیا اور اس نے خاموشی کی وجہ پوچھی تو میں نے سر درد کا بہانہ کر دیا۔
ہم تقریباً تین بجے واپس پہنچ چکے تھے۔ میں ایک رات سہیل کے پاس رہا اور اگلے دن اپنی منزل کی روانہ ہو گیا اور جلد ہی میں اپنے PCO میں موجود تھا۔
جہاں دل میں والدین کے بچھڑنے کا غم تھا۔ اب اس کے ساتھ ساتھ کرن کی یاد بھی شامل ہو گئی تھی۔ وہ رونقیں، وہ محفلیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں اور کرن کا بن سنور کے سامنے آنا اور اس کی خوب صورت مسکراہٹ میں جب اس کو تصور کی دنیا میں سوچتا تو جی کرتا کہ ابھی اس کے پاس چلا جاؤں اور پھر کبھی لوٹ کے واپس نہ آؤں بس ہم دونوں ہی ہوں ایک دوسرے کے پاس پر یہ صرف سوچیں اور خیالات تھے کیونکہ پریمی لوگ خیالات کی دنیا میں بہت کچھ سوچا کرتے ہیں۔
شکیل اس وقت پی سی او میں ہی موجود تھا وہ مجھے ایسے گلے لگ کے ملا جیسے ہم صدیوں بعد ملے ہوں۔ آخر ہم جگری دوست تھے۔ شکیل کہنے لگا۔
"احسان تم تو اچانک ہی چلے آئے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آپ وہاں اور کچھ دن رہو گے۔"
میں نے شکیل کو بتایا۔" یار وہاں رہنا تو کوئی مشکل نہیں تھا لیکن مجھے تمہاری فکر تھی کہ تم پورے ہفتے سے میرا کام ذمے داری سے نبھا رہے ہو۔" شکیل اس بات پر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔
"واہ احسان بھائی کیا بات کرتے ہو۔ ہم دونوں میں کوئی فرق ہے بھلا۔ تم اگر ساری زندگی بھی نہ آتے تو میں آپ کا کام پوری ذمہ داری سے کرتا اور یہ تو پھر ہفتے کی بات تھی۔"
"خیر چھوڑو ان باتوں کو اور دو اچھی سی چائے لے آؤ۔ کافی تھک گیا ہوں سفر کی وجہ سے۔" میری بات سن کر وہ چائے لینے چلا گیا بعد میں نے سات دن کی محنت کا حساب لگایا اور جب شکیل چائے لے کر آیا تو اس کو اس کی محنت کے روپے میں اس کو دینے چاہیے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا۔" احسان اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم مجھے اس کام کے روپے دو گے تو میں کبھی تمہارے PCO پر نہ بیٹھتا۔" لیکن میں نے اس کی کی بات پر دھیان نہ دیا اور اس کو زبردستی پیسے دے دیے۔ شکیل نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔
"احسان کل میں لاہور جا رہا ہوں آرمی میں بھرتی کے لیے۔ تم میرے لیے دعا کرنا کہ میں آرمی میں بھرتی ہو جاؤں۔ اب فارغ رہنا اچھا نہیں لگتا۔ میں اب ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔" مجھے اس کی بات سن کر بہت خوشی ہوئی۔
میں نے دعا دیتے ہوئے کہا کہ انشاء اللہ تم کامیاب ہو کر لوٹو گے۔" شکیل نے میرا شکریہ ادا کیا اور گھر چلا گیا۔

☆......☆

دن گزرتے ہیں اور پھر گزر جاتے ہیں انسان کتنا ہی مضبوط جسامت کا مالک کیوں نہ ہو، وقت کو کبھی نہیں روک سکتا اور نہ روک پائے گا۔ کیوں کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں۔ ویسے تو انسان بڑے بڑے دعوے کرتا پھرتا ہے۔ دو ماہ گزر گئے لیکن نہ کرن نے فون کیا اور نہ اس کا کوئی خط آیا۔ میں ناامید ہو چکا تھا لیکن کرن روز میری یادوں میں موجود رہتی تھی۔ میں سوچنے لگا بس وہ ایک اتفاق تھا جو گزر گیا بعد میں کون کسی کو یاد کرتا ہے۔ مجھے امید تو تھی کہ وہ ضرور یاد کرے گی اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ گھر میں اپنی سوتیلی ماں کے ہوتے ہوئے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ وہ ایک مجبور لڑکی تھی میں چاہتا تھا کہ ایک بار وہ مجھ سے رابطہ کر لے پھر میں اس کو اس قید سے آزاد کر لوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔

ان گزرے دنوں میں شکیل کو فوج میں نوکری بھی مل گئی تھی اور اب وہ ٹریننگ کر رہا تھا۔ اس کے والدین بہت خوش تھے لیکن میں اس کے جانے کے بعد اکیلا ہو گیا۔ مجھے اس کے ہوتے ہوئے کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ہم مجبوریوں کے غلام ہیں بس۔

میں کبھی کبھی شکیل کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ اس کی بہنوں اور امی نے مجھ سے بہت ساری شکایتیں کی تھیں کہ آپ شکیل کے جانے کے بعد کبھی ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم نے آپ کو دوسرا بھائی سمجھا ہوا تھا لیکن شاید تم ہمیں غیر ہی سمجھتے ہو جو شکیل کے جانے کے بعد گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔''

ان کی باتوں میں حقیقت تھی وہ مجھے بھائی ہی کہتی تھیں۔ انہوں نے کبھی مجھے غیر نہیں جانا تھا۔ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بلا تکلف مجھے دے دیتے تھے۔ میں نے پچھلی غلطیوں کی ان سے معافی مانگ لی اور وعدہ کیا کہ اب میں لازمی آیا کروں گا۔'' وہ میرے وعدے پر خوش ہو گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

☆......☆

زندگی میں جہاں ناامیدی آجاتی ہے وہیں امید بھی ساتھ چلی آتی ہے۔ وہ شاید منگل کا دن تھا میں شکیل کے گھر گیا ہوا تھا جب میں واپس آیا تو ساتھ والی دکان کے مالک نے مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا۔

''پوسٹ مین آپ کے نام کا ایک خط دے کر گیا ہے۔ آپ تو تھے نہیں یہاں اس لیے میں نے وصول کر لیا۔''

اس نے مجھے وہ خط دیا تو میں ایکدم حیران ہو گیا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ خط کس نے بھیجا ہو گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پی سی او میں چلا آیا اور بے صبری اور بے چینی کے عالم میں خط کو کھول دیا اور اس کے اندر موجود تحریر پڑھنے لگا۔ یہ خط کرن نے مجھے لکھا تھا۔

پیارے دوست احسان!

السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ خیریت سے ہوں گے پھر بھی اللہ سے دعا ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہو آمین۔

پیارے دوست میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ بس جو ٹوٹے پھوٹے لفظ ساتھ دے رہے ہیں وہ آپ کی نذر کر رہی ہوں۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کو بہت دیر بعد یاد کیا۔ بس میری کچھ مجبوریاں ہیں جو مجھے بہت کچھ کرنے نہیں دیتیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کو جلدی خط لکھوں لیکن سوتیلی ماں کی ستم ظریفی کی وجہ سے نہیں لکھ سکی۔ اب بھی بہت مشکل سے آپ کو یہ خط لکھا ہے۔ بس دوست وہ گزرا ہوا وقت بہت یاد آتا ہے جب شادی پر پہلی بار ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا اور آپ نے مجھے اپنے دل کی بات بتائی تھی کہ ہم دونوں دوست بن جائیں۔ مجھے آپ کی یہ ادا اچھی لگی اور یہ کہ آپ میرے لیے اپنے دل میں ہمدردی رکھتے ہو۔ اب ہمیشہ اچھے دوست بن کر رہنا۔ میں نے اپنا بہت کچھ آپ کو سمجھا ہے اور آپ کو دل سے دوست کہا ہے۔

اب مجھے ایک سہارا مل گیا ہے تو آپ مجھے کبھی تنہا مت چھوڑنا۔ میں اپنے گھر میں اور ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔ میرا باپ میری سوتیلی ماں کی محبت میں مجھے بھلائے بیٹھا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں اپنی سگی ماں کو یاد کرتی ہوں تو اگر آج وہ زندہ ہوتی تو میرے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوتا بس اب میں سوائے رونے کے اور کیا کر سکتی ہوں۔ اب سب امیدیں آپ سے ہیں۔ آپ چاہو تو

مجھے اس ستم ظریفی سے آزاد کرا سکتے ہو۔''

یوں کرن نے خط میں بہت ساری باتیں اپنے بارے میں لکھی تھیں اور کرن نے اپنی ایک دوست کے گھر کا ایڈریس بھی لکھا تھا اور ساتھ میں اس نے تاکید کی تھی کہ میں اس کو خط کا جواب لازمی لکھوں۔ کرن کا یہ پہلا محبت نامہ تھا جو صرف دکھوں سے بھرا ہوا تھا۔ جہاں مجھے اس کا خط ملنے کی خوشی تھی تو ساتھ میں انتہائی دکھ بھی ہو رہا تھا۔ میں نے کئی بار کرن کے محبت بھرے خط کو پڑھا۔ میں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا کہ کرن نے مجھ سے رابطہ کرلیا ورنہ میں تو ناامید ہو چکا تھا۔

کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے خط کا جواب بڑی لمبی چوڑی تفصیل کے ساتھ لکھا اور اگلی صبح پوسٹ کردیا۔ خط میں، میں نے کرن کو بہت ساری تسلیاں اور حوصلے دیئے اور ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ بھی کیا اور ساتھ میں لکھا کہ کرن کبھی خود کو تنہا مت محسوس کرنا۔ ہر دکھ سکھ میں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔

یہ بات حقیقت تھی کہ میرے وعدوں اور حوصلوں میں کرن کے لیے ایک سچا خلوص موجود تھا۔ اب دل میں ایک فکر تھی کہ کرن کو میرا خط جلدی مل جائے اور اس کو بھی حوصلہ ہو اور ہم دونوں کا رابطہ ہوتا رہے۔

ایک شام مجھے جگری دوست شکیل کا فون آ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے خوب گلے شکوے کرنے لگے۔ کیوں کہ ہماری بہت دنوں بعد بات ہو رہی تھی۔ شکیل نے مجھے کہا کہ ضروری چیزیں ہیں یعنی کپڑے اور کچھ چیزیں وہ تم لے کر میرے پاس آ جاؤ مجھے یہاں اشد ضرورت ہے تم میرے گھر جاؤ اور امی سے میری بات کرادو۔ میں ان کو بتا دیتا ہوں وہ آپ کو یہ چیزیں لے کر دے دیں گی تو تم لے کر میرے پاس آ جاؤ۔ یوں ہم مل بھی لیں گے اور دل کی اداسی بھی دور ہو جائے گی۔ میں نے شکیل سے آدھے گھنٹے کا ٹائم لیا اور اس کے گھر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے شکیل کی امی کو فون کے بارے میں بتایا تو وہ اور اس کی بہن غزالہ میرے ساتھ پی سی او میں چلی آئیں۔ فون پر بات کرنے کے لیے پھر شکیل کی امی اور اس کی بہن غزالہ نے آدھا گھنٹے اس سے فون پر بات کی بعد میں شکیل کی امی کہنے لگیں۔

''احسان کل تم ہمارے ساتھ بازار چلنا اور اپنی پسند کے کپڑے شکیل کے لیے خرید لینا اور بھی کچھ چیزیں لینا ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے آنٹی میں کل آپ کے ساتھ بازار چلوں گا۔'' یوں وہ رخصت ہوگئیں اور پھر ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔

اگلے روز وعدے کے مطابق میں ان لوگوں کے ساتھ بازار چلا گیا اور اپنی پسند کے اچھے سے تین کپڑوں کے جوڑے خریدے اور بھی کچھ سامان تھا اور پھر شکیل کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب میں وہاں پہنچا تو شکیل مجھے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ مجھے بار بار گلے مل رہا تھا۔ میں بھی بہت خوش تھا اس سے مل کر۔ پھر میں نے اس کو اس کا سامان وغیرہ دیا۔ شام ہوئی تو شکیل مجھے شہر کے ایک خوب صورت پارک میں لے گیا۔ وہاں ہم کافی دیر تک بیٹھے گپ شپ لگاتے رہے اور ایک ہوٹل سے کھانا کھانے کے بعد ہم واپس لوٹ آئے۔

اس طرح تین دن شکیل کے پاس رہا۔ جب میں نے اجازت چاہی تو شکیل بہت دکھی ہو گیا کہنے لگا۔ ''یار احسان حیرت ہے تم آئے اور جانے کا بھی جلدی ارادہ کرلیا۔ کیا یہاں دل نہیں لگ رہا یا میری خدمت میں کوئی کمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں یار شکیل بھلا میں کب ایسا سوچ رہا ہوں۔ میرا بھی دل نہیں چاہ رہا کہ آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ دراصل مجبوری ہے کام بھی تو کرنا ہے نا۔''

پھر بڑی مشکل سے اس کو راضی کیا اور اس سے وعدہ کیا کہ پھر کبھی وقت ملا تو لازمی آؤں گا۔ بڑی اداس اور دکھی طبیعت کے ساتھ شکیل مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑنے آیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے لیے کتنا اداس ہے۔ آخر ہم بچپن کے جگری دوست تھے اور پھر کافی مدت بعد ملے تھے تو دکھ تو ہوتا ہی تھا۔ یوں میں واپس لوٹ آیا اور جب پی سی او میں پہنچا تو ایک اور خط میرا منتظر تھا۔ خط کو دیکھتے ہی میری ساری پریشانیاں اور جسمانی تھکاوٹ دور ہوگئی تھی۔ دل میں بے پناہ خوشی چھلکنے لگی تھی اور آنکھیں خط کو پڑھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی خط

کو کھولا اور پڑھنے لگا۔

یہ خط پہلے سے بھی زیادہ دکھ اور پیار بھرا تھا۔ ہر ہر لفظ درد اور محبت سے تحریر شدہ تھا۔ کرن کی پریشانیاں اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کرتی تھی۔ ماں تو سوتیلی تھی ہی اب اس کا باپ بھی اس کی سوتیلی ماں کی محبت میں آ کر اپنے جگر گوشے کو بھلائے ہوئے تھا۔ اس کو کوئی فکر نہیں تھی کہ اس کی جوان بیٹی کس حال میں ہے۔ بس وہ تو ہر وقت اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملانے کا عادی تھا۔

مجھے بہت غصہ آنے لگا۔ اس کے بے رحم باپ پر مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ اگر میرا ان لوگوں سے خونی رشتہ ہوتا تو میں اپنی جان پر کھیل کر بھی کرن کو ان ظالموں سے دور لے جاتا اب سوائے افسوس اور دعاؤں کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دل میں کرن کے لیے محبت اس قدر پھوٹ رہی تھی کہ جی چاہا کہ اس کے سارے دکھ اپنی زندگی میں شامل کر لوں اور اپنی خوشیاں اس کو دے دوں۔

موسم کوئی بھی ہو امید کا دامن نہ چھوٹے
خبر آئے نہ آئے پر صبا آتی رہے

میں نے کرن کے اس محبت بھرے خط کا بھی جواب ارسال کر دیا۔ میں نے کرن کو لکھا تھا۔ ”دوست تم کیوں ہمت ہار رہی ہو۔ تم شکر کرو کہ تمہارے ساتھ کچھ اپنے لوگ تو ہیں ناں۔ چاہے وہ تم پر ستم کرتے ہیں اپنے تو ہیں نا۔ میں بھی ہوں جس کا اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں اپنوں کی کمی کس قدر محسوس کر رہا ہوں شاید تم کبھی نہ جان پاؤ۔ میں بھی تو جی رہا ہوں اکیلا بس تم صبر کرو اور میرا ساتھ دو اور میری سچی دوستی اور محبت کو کبھی مت ٹھکرانا۔ انشاء اللہ میں تم کو ایک نہ ایک دن ضرور ان ظالموں سے دور لے جاؤں گا۔“

اسی طرح ہم دونوں میں پیار بھرے خطوط کا سلسلہ چلتا رہا اور ہماری محبت نے ہم دونوں کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں قید کر لیا تھا۔ اب یہاں سے واپسی کا تصور بھی ناممکن تھا۔ کرن کی دوری سے یوں لگتا تھا کہ جیسے میرے وجود کے دو ٹکڑوں کر دیئے گئے ہوں اور دونوں ایک دوسرے سے جڑنے کو تڑپ رہے ہوں۔ یہ کیسا اتفاق تھا ہم دونوں کے درمیان کہ بس چند لمحوں کی باتیں اور چند لمحوں کا ساتھ ہم دونوں کو کہاں تک لے آیا تھا۔ کرن کی خوب صورت آنکھوں اور گھنی سیاہ زلفوں کی چھاؤں میں، میں اپنا جیون گزارنا چاہ رہا تھا۔

یوں دن گزرتے گئے اور میں پی سی او تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ میری سوچیں، میرے خیال، میرے ارمان اب صرف کرن کی ذات تک ہی محدود ہو گئے تھے۔ مجھے اس کے علاوہ اور کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں اپنے جگری دوست شکیل کے گھر والوں کو بھی بھول گیا حالانکہ ان لوگوں سے میرا ایک گہرا رشتہ تھا۔ ان لوگوں کے ہزاروں احسان تھے مجھ پر، جو میں چاہ کر بھی نہیں اتار سکتا تھا۔ معلوم نہیں وقت اور حالات انسان کو کہاں سے کہاں لا پھینکتا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے کبھی کبھار تو میں ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا پھر جب کرن کی یادوں نے اپنی قید میں مجھے جکڑا تھا تو میں کبھی کبھار جانا بھی بھول گیا تھا۔ اس میں میرا شاید کوئی قصور نہیں تھا، محبت چیز ہی ایسی ہوتی ہے جو بہت سارے قریبی رشتوں سے بھی دور کر دیتی ہے۔

☆......☆

ایک روز میں پی سی او میں لیٹا ہوا تھا کہ شکیل کی امی اور اس کی بڑی بہن غزالہ پی سی او میں چلی آئیں۔ اچانک ان کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرانگی تو ہوئی پر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے آنٹی کا حال چال پوچھنا شروع کیا تو وہ ایک دم رو پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ خیر ہو ایسا کیا کچھ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے آنٹی رونے لگ گئیں۔ پھر آنٹی چپ ہوئیں تو میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگیں۔

”اب بھی پوچھتے ہو کہ میں کیوں رو رہی تھی۔ احسان بیٹا کیوں پتھر دل ہو گئے ہو۔ کیا شکیل تک ہی تمہاری دوستی تھی۔ جب وہ ہم سے دور ہو گیا تو تم نے بھی ہمیں بھلا دیا اور ہمارے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ کبھی تم نے پوچھا تک نہیں کہ ہم کیسے ہیں، کس طرح وقت گزر رہا ہے۔“ آنٹی کی ان ساری باتوں میں حقیقت تھی۔ میں تو سچ میں ان لوگوں کو بھلا چکا تھا۔ میری آنکھوں میں ندامت سی آ گئی اور دل

افسوس اور شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ کتنا مقدس رشتہ تھا ہم سب کا جس کو میں اس انسان کی خاطر بھلا رہا تھا، جس کو صرف چند پل دیکھا تھا اور چند باتیں کی تھیں۔ وہ چند پل ہماری کئی سالوں کی سنگت کو ناکام کر رہے تھے۔ میں نے آنٹی سے کہا۔

''آپ ایسا مت سوچیں اور نہ دکھی ہوں، میں آپ لوگوں کو بھلا کیسے بھلا سکتا ہوں۔ وہ تو بس کچھ کام میں مصروف تھا۔ دل تو میرا بھی اداس تھا آپ لوگوں کے بغیر۔ بس کئی بار سوچا تھا کہ آپ کے ہاں جاؤں پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔ انشاءاللہ آج شام میں لازمی آؤں گا اور کھانا بھی آپ کے ہاں کھاؤں گا۔'' پھر میں نے غزالہ کو کہا کہ ''غزالہ تم میری پسند سے اچھی طرح واقف ہو کہ کھانے میں مجھے کیا پسند ہے۔ بس آج وہی پکانا۔''

غزالہ کہنے لگی کہ ''احسان تم آ جانا لازمی۔ جو تم کہو گے وہ آپ کو کھانے میں ملے گا۔ پلیز تم آیا کرو، ہم سب گھر والے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ آج امی نے مجھے کہا کہ احسان کو خود مل کر آئیں اور اس سے پوچھیں کہ وہ کیوں نہیں آتا۔ کیا ہم سے کوئی ناراضگی ہو گئی ہے؟''

میں نے غزالہ کو تسلی دی کہ ''نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں، آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ میں ہر شام آپ کے ہاں گزارا کروں گا، ان رشتوں سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی چیز زیادہ اہم نہیں۔'' پھر میں نے ان کو کولڈ ڈرنک پلوائی اور پھر وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ میں ان کو کیا بتاتا کہ میں کسی اور انسان کی سنگت میں ایسا کر رہا تھا اور اس کی ذات تم لوگوں سے بھی زیادہ مجھے عزیز ہونے لگی تھی۔

پھر شام ہوئی تو میں وعدے کے مطابق شکیل کے گھر چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر سب بہت خوش ہوئے۔ غزالہ کہنے لگی۔ ''احسان بھیا! مجھے امید تھی کہ تم لازمی آؤ گے اس لیے میں نے آپ کی پسند کا کھانا بنایا ہے۔'' میں نے شرارتاً کہا۔

''ہاں کیوں نہیں بھئی۔ مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے اور اب جلدی سے کھانا دو مجھے۔'' یوں غزالہ میرے لیے اور اپنے لیے پلیٹ لے کر آئی۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا اور پھر سب مل کر باتوں میں گم ہو گئے۔ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق، گلے شکوے اور کئی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ ابھی رات کے بارہ بج گئے تو میں نے جانا چاہا لیکن آنٹی نے کہا۔

''بیٹا اب تم یہاں ہی سو جاؤ رات کافی ہو چکی ہے۔'' میں نے آنٹی کی بات مانی اور وہاں ہی سو گیا۔ صبح ہوئی تو ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد معمول کے مطابق اپنے کام میں مگن ہو گیا۔

دن گزرتے رہے اب میں ہر شام شکیل کے گھر جاتا تھا۔ وہ لوگ حقیقت میں میری کمی محسوس کرتے تھے، پھر شکیل کے سوا ان کا کوئی اور بیٹا بھی تو نہیں تھا۔ ان کے بعد اب میں ہی ان لوگوں کے لیے شکیل کا دوسرا روپ تھا۔

ادھر کرن کا خیال اور اس کی یادیں مجھے تڑپانے لگتیں تو میں اس کے محبت بھرے خط دوبارہ پڑھنے لگ جاتا اور دل کو کچھ سکون مل جاتا۔ اب بھی کرن کے خط کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ مجھے اس کی فکر اپنی جان سے بھی زیادہ تھی۔ پھر اس کا خط مجھے پوسٹ مین دے ہی گیا۔ دھڑکتے دل اور بے تاب آنکھوں سے خط کو کھولا اور اس کی تحریر پڑھنی شروع کی۔

''جان سے پیارے دوست احسان!

سلام محبت!

دعا ہے کہ تم پھولوں کی طرح کھلتے رہو، کبھی کوئی دکھ نہ ملے آپ کو۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ احسان! میں تم کو بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں کہ میں اب آپ کو ملنا چاہتی ہوں۔ میری آنکھیں بے حد اداس ہیں آپ کو دیکھنے کے لیے۔ میں چاہتی ہوں آپ مجھے قریب آ کر ملو، میں وہ پیار اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں جو آپ اتنی دور رہ کر کرتے ہو۔ اب دوری برداشت نہیں ہو رہی۔ احسان! آپ میرے پاس چلے آؤ اور اپنی بے پناہ محبت سے میرے دل کو پیار اور وفا کا یقینی سکون دو۔ ہم دونوں کب تک ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔ بس اگلی جمعرات کو میں اپنی دوست نازیہ کے ساتھ شہر جانے والی ہوں۔ آپ جمعرات کو بارہ بجے سے پہلے آ جانا۔ ہم وہاں مل لیں گے۔ بس یہ اچھا موقع ہے پھر شاید مشکل ہو۔ وقت نکالنا، میں شدت سے آپ کا انتظار کروں گی اور میں

امید کرتی ہوں آپ لازمی آؤ گے۔۔۔ میرے لیے۔''
خط پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ دل کرن کی سچی محبت سے مطمئن ہونے لگا تھا۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ اداس تھی میرے لیے۔ اس کی باتوں سے وفا کی سچی خوشبو آرہی تھی جو ہر انسان کے مقدر میں نہیں ہوتی، ایسی محبت نصیب والوں کو ملتی ہے۔

☆.....☆

جمعرات کا دن آیا تو میں مکمل تیاری کے ساتھ اس سے ملنے چلا گیا۔ جس جگہ کا کرن نے کہا تھا میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے وہاں موجود تھا۔ اب ان کے آنے کا انتظار تھا۔ میری آنکھیں ان راہوں کو غور سے تک رہی تھیں جن راہوں سے ان کے آنے کی امید تھی۔ وقت گزرتا جارہا تھا لیکن وہ نہیں آرہی تھی۔ جب زیادہ وقت گزرا تو میں ناامید سا ہو گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب وہ نہیں آئیں گی۔ شاید کرن کو اس کی سوتیلی ماں نے نہ آنے دیا ہو مگر نازیہ کو تو آنا چاہیے تھا۔ وہ بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں بہت پریشان سا ہو گیا تھا۔ میں کہاں سے کہاں چلا آیا دوست کی خاطر اور دوست کو بھی نہ مل سکا۔ میں واپسی کا ارادہ کر کے اٹھنے ہی لگا تھا کہ ایک رکشہ میرے قریب آکر رکا اور دو لڑکیاں رکشے سے اتر کر میری طرف آنے لگیں۔ دل میں امید کی کرن جاگ گئی کہ ہو نہ ہو یہ کرن اور اس کی دوست نازیہ ہے۔ وہ دونوں نقاب میں تھیں۔ پھر جب وہ میرے قریب آگئیں تو انہوں نے مجھے سلام کیا اور کہنے لگیں۔
''تم احسان ہی ہو نا؟'' میں نے کہا۔ جی! میں احسان ہی ہوں۔''
''اوہ! اچھا میں نازیہ ہوں اور یہ آپ کی دوست کرن ہے۔'' اس نے اپنا اور کرن کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا۔
''جی ہاں، مجھے بھی یقین تھا کہ رکشے سے اترنے والی تم دونوں ہی ہو اور تم اتنی دیر سے کیوں آئیں۔ میں تین گھنٹوں سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ یقین کرو اگر ان چند لمحوں میں تم نہ آتیں تو میں اب جانے ہی والا تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ تم میرے جانے سے پہلے آگئیں۔''
میں نے شکایتی انداز میں کہا تو نازیہ اور کرن نے معذرت کی اور مجھے نازیہ بتانے لگی کہ دراصل اس کی امی نہیں مان رہی تھیں۔ پھر بڑی مشکل سے ان کو راضی کیا۔ بس اب آپ صرف چند منٹ ہمارا اور انتظار کرو، ہم ہسپتال سے ہو کر آجائیں پھر کہیں الگ جگہ پر چلتے ہیں۔
''ٹھیک ہے کرن اور نازیہ جی۔ میں آپ کا مزید اور بھی انتظار کر لیتا ہوں لیکن جلدی آنا۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں نے واپس بھی جانا ہے۔'' میں نے دونوں کو تاکید کرتے ہوئے کہا تو کرن کہنے لگی۔
''آپ پریشان نہ ہوں، میں ہوں نا میں اس کو جلدی لے آؤں گی۔'' پھر وہ دونوں اسی رکشے پر بیٹھ کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئیں اور میں ان کا انتظار کرنے لگا۔
ان کو واپس آنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگا اور پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک ہوٹل میں چلی گئیں۔ ہم تینوں ایک الگ جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے نازیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی خیر خیریت پوچھی اور اس سے یہ بھی پوچھا کہ وہ خیر سے ہسپتال گئی تھیں تو نازیہ نے مجھے بتایا۔
''میری شادی کو تین سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک قدرت نے اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ مجھے اس لیے یہاں مہینے میں ایک بار لازمی آنا پڑتا ہے۔ بس دعا کرو کہ اللہ میری جھولی ہری کر دے اولاد سے۔''
میں نے آمین کہتے ہوئے نازیہ کو دل سے دعا دی اور پھر اپنی محبوبہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ابھی بھی نقاب میں ہی تھی۔ نازیہ نے ڈنر کو کھانے کا آرڈر کر دیا۔ ویسے بھی اس وقت ہمیں بھوک بہت لگی ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کرن کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ میں نے بڑے ادب کے ساتھ کہا۔
''کرن جی، بندہ ناچیز آپ کو سلام کہتا ہے۔'' تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔
''شکریہ احسان جی! اور کیسے ہو آپ۔'' میں نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔ ''کرن جی! آپ سے دور رہ کر بھلا میں کیسے ٹھیک رہ سکتا ہوں۔ بس آپ کی یادوں اور آپ کی باتوں نے تو مجھے صرف آپ کی ہی ذات تک محدود کر دیا ہے۔ اب تو دل و جان میں تم ہی تم ہو۔ میں تو خود حیران ہوں کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو گیا ہم کو دیکھا تو کیا بس دل آپ کی چاہت میں پاگل سا ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں کہ آگے کیا کیا ہو گا میرے ساتھ۔ آج میں

بہت خوش ہوں آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر۔'' میں نے کرن کو کہا۔ ''جناب اب تو اپنے پیارے اور سندر سے چہرے سے نقاب اتار دو تاکہ میں آپ کا دیدار ہی کرلوں۔ جانتی ہو یہ آنکھیں کتنی مدت سے تمہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔'' پھر میں نے اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تو میری آنکھیں حیران رہ گئیں۔ اس کے حسن و جمال اور سندر سے چہرے کو دیکھ کر۔ کرن نے اپنے باریک ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی جو بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ جی چاہا کہ سو بار اس کے چہرے کو چوموں مگر حیا کا بھی خیال کرنا پڑ گیا۔ میں نے تعریفی انداز میں کرن سے کہا۔

''کرن تم اتنی خوبصورت کیوں ہو؟'' تو کرن نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو قدرت کی مہربانی ہے، میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک کہتی ہو کرن! یہ سب قدرت کے کام ہیں، ہمارا اس میں کوئی بس نہیں۔''

ویٹر ہمارے لیے کھانا لے آیا اور ہم کھانا کھانے لگے اور آپس میں باتیں بھی کرتے رہے۔ اب ہمارے درمیان آپ جناب والا تکلف ختم ہو گیا تھا اور ہم ایک دوسرے کو 'تم' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ میں نے کرن سے اس کے گھر والوں کے بارے میں جب پوچھا تو اس نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

''احسان تم کیوں پوچھتے ہو، ان لوگوں کے بارے میں جن کو اپنے ہی خون کے رشتوں کی قدر نہیں۔ کاش! میری سگی ماں آج زندہ ہوتی تو سوتیلی ماں کے ظلم و ستم نہ سہنے پڑتے اور باپ کا رویہ بھی اس طرح نہ ہوتا میرے ساتھ۔ میں تو اپنے ہی گھر میں ایک قیدی اور نوکر کی طرح ہوں، جو صرف ان کی مرضی اور حکم پر زندگی بسر کر رہی ہوں۔''

میں نے کرن سے پوچھا۔ ''تمہارا باپ بھی تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہا، آخر کیا وجہ ہے۔ تم تو اس کی سگی اولاد ہو، اس کو تو تمہارا خیال کرنا چاہیے۔''

کرن نے مجھے بتایا کہ باپ صرف میری سوتیلی ماں کے حکم کا پابند ہے جو اس کو حکم ملتا ہے وہ وہی کرتا ہے۔ آج تک اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ بیٹی تم کیسی ہو تمہیں کوئی دکھ یا تکلیف ہے تو مجھے بتاؤ۔ بس میں سب کچھ صبر سے برداشت کر رہی ہوں۔ مجھے میری ماں بہت یاد آتی ہے۔'' ماں کے ذکر پر کرن کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اس حال میں اس کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں اپنے دکھ بھول گیا اور اس کے دکھ کا احساس ہونے لگا۔

روتے ہوئے کرن کہنے لگی کہ کاش اگر میری ماں زندہ ہوتی تو آج یہ دکھ نہ سہنے پڑتے۔''

میں نے اپنے ہاتھوں سے کرن کے خوبصورت چہرے کو اوپر کیا اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آج تم مشکل میں ہو تو انشاءاللہ کبھی تم کو چین و سکون ضرور ملے گا۔ تم صبر کرو اور ہمت سے کام لو۔ میرا تن من حاضر ہے۔ جہاں بھی ضرورت ہو تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

کرن نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''احسان! مجھے اب ہر پل آپ کی ضرورت ہے۔ آپ نے مجھے جو وعدہ دیا ہے وہ بھی مت بھولنا۔ میں تمہارے حوصلوں اور وعدہ نبھانے کی بات پر خوش ہوں۔ میرا ساتھ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔''

ہم وہاں تین گھنٹے بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے، پھر میں نے ٹائم دیکھا تو اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''کرن اب میں چلتا ہوں، وقت بہت کم ہے۔ پھر کبھی وقت نے ساتھ دیا تو لازمی ملاقات ہوگی۔'' یوں ہم ہوٹل سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑے۔ کرن ابھی بھی دکھی تھی۔ میں نے نازیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''نازیہ! کرن کا تم ہمیشہ خیال رکھنا، یوں سمجھو یہ میری امانت ہے آپ کے پاس۔''

نازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''احسان! میں اپنی جان سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھتی ہوں۔ میں آپ کو بتا دوں کہ اس نے جتنے بھی آپ کو خط لکھے وہ میری مدد سے ہی آپ تک پہنچے۔ ویسے تم اس طرح کرو کہ میرے گھر کا ٹیلی فون نمبر لے لو۔ جب بھی ضرورت پڑے گی ہم ایک دوسرے سے رابطہ کر لیا کریں گے۔'' ٹیلی فون کا نن

کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس طرح تو میں کبھی بھی کرن سے بات کرسکتا تھا۔ میں نے نازیہ سے فون نمبر لیا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بس میں سوار ہوگیا اور پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگیا۔

☆......☆

عشاء سے کچھ ہی دیر پہلے اپنے پی سی او میں پہنچا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر شکیل کے گھر چلا گیا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے شکیل کو اپنے سامنے پایا اور جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو شکیل دوڑتا ہوا آیا اور میرے گلے لگ گیا۔ ہم دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ میں نے شکیل سے کہا۔

''یار! تم بڑے چور قسم کے آدمی ہو جو بتائے بنا ہی گھر چلے آئے۔ کم از کم مجھے فون تو کر دیتے آنے سے پہلے۔'' شکیل کہنے لگا۔

''یار! اس طرح مزا نہیں آتا۔ میں نے سوچا کہ اچانک آپ کے سامنے آؤں گا تو آپ کو حیرانگی ہوگی۔ ویسے جناب احسان صاحب تم بتاؤ کہ آج سارا دن کہاں گم تھے۔ میں آپ کے پی سی او کے تین چکر لگا چکا ہوں۔'' یہ سن کر میں نے کہا۔

''اوہو! تو جناب شکیل صاحب بہت بے چین تھے میرے لئے۔ بس یار میں آج کہیں ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا اور ابھی ہی واپس آیا ہوں۔'' پھر ہم سب آپس میں باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات گزر گئی مگر ہماری باتیں ختم نہ ہوئیں۔ تقریباً فجر کی اذان کے وقت میں اٹھا اور پی سی او میں آکر سو گیا۔ نیند آنکھوں میں اس قدر تھی کہ دن کے گیارہ بجے مجھے شکیل نے ہی آکر جگایا اور ناشتے کے لیے مجھے ساتھ لے گیا۔ شکیل دس دن کی چھٹی پر آیا تھا۔ جتنے دن وہ یہاں رہا ہم دونوں ایک ساتھ پی سی او میں ہوتے اور خوب گپیں لگاتے۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے پھر سے اسکول کا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ پھر یونہی ہنسی خوشی وہ ہم سب کو چھوڑ کر نوکری پر چلا گیا اور اپنی یادیں ہمارے پاس چھوڑ گیا۔

☆......☆

گزرتے وقت کے ساتھ کرن کی یادیں ہر پل میرے ساتھ تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ اب کس طرح کرن کو ان مشکل حالات سے آزاد کراؤں، جن حالات میں اس کا جینا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ وہ ایک ایک پل بڑی اذیت میں گزار رہی تھی اور ویسے بھی بہت دن ہوگئے تھے، اس نے مجھے اب کوئی خط نہیں لکھا تھا اور میں نے بھی نازیہ کے گھر کے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بات نہ ہوسکی۔ میں نے بہت کچھ سوچا، میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ میں کس طرح کرن کو اپنی زندگی میں شامل کرسکتا ہوں اور اس سارے معاملے میں مجھے کچھ لوگوں کی مدد کی بھی ضرورت پڑ رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی مدد سے کرن کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرسکتا تھا۔

بہت دنوں تک میں ان سارے حالات پر غور کرتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ باتیں آرہی تھیں کہ اب کیا کچھ کرنا چاہیے مجھے۔

مجھے اپنے، کرن اور نازیہ کے بارے میں شکیل کی بہن غزالہ کو سب کچھ بتادینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے وہ میری کچھ مدد کردے اور میں کرن کو حاصل کرسکوں۔ یہ سوچ کر میرے دل میں اک امید کی کرن جاگ اٹھی تھی۔ میں کچھ مطمئن ہوگیا کہ جب مناسب وقت آئے گا تو میں غزالہ کو سب کچھ بتادوں گا۔

وقت نے پھر میرا ساتھ دے ہی دیا۔ ایک شام جب میں شکیل کے گھر گیا تو اس وقت وہ لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ میں بھی ان کے کہنے پر کھانے میں مصروف ہوگیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر آنٹی کسی ضروری کام سے پڑوس میں چلی گئیں۔ میرے پاس اچھا موقع تھا۔ میں نے غزالہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''غزالہ! میں آپ کو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اگر تم کو برا نہ لگے تو۔'' میری بات سن کر غزالہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔ ''احسان! تم ایسا کیوں سوچتے ہو، ہم لوگوں کے دلوں میں اگر تمہارے لیے پیار نہ بھی ہوگا تو نفرت بھی نہیں ہوگی۔ تم اپنی بات کہو، مجھے کچھ بھی برا نہیں لگے گا۔''

میں نے غزالہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے اور کرن کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ اتنا کچھ سن کر غزالہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر کہنے لگی۔ ''احسان! یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے لیکن تھوڑا وقت لگے گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں غزالہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ پر ایسا ہوگا کس طرح؟'' میری

بات پر غزالہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "دیکھو تم کسی طرح فون پر کرن اور اس کی دوست نازیہ سے میری اور امی کی تین دفعہ بات کرادو تو اس سے ہم سب کی ان سے واقفیت ہو جائے گی اور کسی نہ کسی بہانے سے ہم ان کو اپنے گھر بلائیں گے اور پھر ہم ایک دو بار ان کے گھر جائیں گے تو سب کچھ آسان ہو جائے گا۔"

ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔ میں غزالہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پی سی او چلا آیا۔ اب میرے لیے اہم مسئلہ غزالہ اور نازیہ اور کرن کی آپس میں بات کروانا تھی۔

☆......☆

اگلی صبح میں نے غزالہ کی ہدایت کے مطابق نازیہ کے گھر کا نمبر ملایا تو اتفاق سے اس نے ہی کال ریسیو کی۔ سلام و دعا کے بعد میں نے نازیہ سے بہت سارے گلے شکوے کیے۔ میں نے اس کو بتایا کہ "میں جب بھی آپ کو فون کرتا تو کوئی آدمی فون اٹینڈ کرتا تھا، کال اب اتفاق آپ نے کال ریسیو کرلی۔" نازیہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، وہ میرے سسر جی ہیں، وہ اکثر اسی کمرے میں موجود ہوتے ہیں جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا ہے۔"

میں نے نازیہ کو کہا "آپ جلدی سے میری بات کرن سے کرا دو، آپ کی مہربانی ہوگی۔" نازیہ چند لمحے تو خاموش رہی پھر کہنے لگی۔

"احسان! اس وقت تو مشکل ہے، ہاں البتہ کل تم اسی وقت فون کرنا تو میں لازمی کرن سے آپ کی بات کرادوں گی۔" میں نے باتوں باتوں میں ہی نازیہ کو غزالہ اور آنٹی کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا کہ وہ آپ دونوں سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ نازیہ تو اور بھی خوش ہوگئی اور کہنے لگی۔

"کل لازمی ہماری ان سے بات کرانا۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ اگر ہم لوگوں میں جان پہچان ہوگی تو اس طرح تم کرن کو حاصل کرسکو گے۔"

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا "نازیہ میں آپ کی باتوں سے متفق ہوں۔ جو آپ نے سوچا ہے وہی ہم لوگ چاہتے ہیں۔"

نازیہ نے مجھے کہا کہ "احسان! میں ہر طرح سے آپ کی مدد کروں گی.... بس تم میرے لیے اللہ سے دعا کرو کہ اللہ مجھے اولاد نصیب کردے۔" میں نے اس کو تسلی دی کہ انشاءاللہ بہت جلد اللہ آپ کو یہ خوشی ضرور عطا کرے گا۔

جب ہمارا رابطہ ختم ہوا تو میں سیدھا غزالہ کے پاس چلا گیا اور اس کو تاکید کی کہ کل ہر حال میں تم اپنی امی کو ساتھ لے کر میرے پاس آنا اور آنٹی کو نازیہ اور کرن کے بارے میں بتانا کہ وہ میری دوست ہیں اور تم آنٹی کی ان دونوں سے بات بھی کرا دینا۔" غزالہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے احسان! جو تم کہتے ہو، میں وہی کروں گی۔" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور خوشی خوشی پی سی او میں آ گیا۔

میں سوچنے لگا کہ کبھی وقت انسان کا اس طرح ساتھ بھی دے دیتا ہے کہ اس کی زندگی میں آنے والی رکاوٹیں بھی دور ہوتی چلی جاتی ہیں، خواہ وہ کتنی بڑی رکاوٹیں ہی کیوں نہ ہوں۔ کرن کے لیے میرے جذبے مخلص اور سچے تھے اس لیے تو کرن تک جانے میں قدرت نے میری مشکل کا یہ آسان راستہ بھی نکال دیا تھا۔

دوسرے روز غزالہ اپنی امی کو ساتھ لے کر پی سی او آ گئی۔ ان کے بیٹھتے ہی میں نے نازیہ کا نمبر ملایا تو نازیہ نے خود فون اٹھایا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد میں نے ریسیور غزالہ کو تھما دیا۔ اس وقت کرن نازیہ کے پاس موجود تھی۔ کچھ دیر غزالہ کے ساتھ بات کرنے کے بعد آنٹی نے پہلے کرن سے بات کی پھر آنٹی اور نازیہ آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ باتوں باتوں میں نازیہ نے آنٹی کو بتایا کہ آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے اولاد عطا کردے۔

یہ بات سن کر اچانک آنٹی کو اس معاملے میں ایک امام مسجد کا خیال آ گیا تو وہ نازیہ کو بتانے لگی کہ بیٹی تم ایسا کرو کہ ہمارے گھر آ جاؤ، ہمارے ساتھ والے پنڈ میں ایک امام مسجد ہے جو تعویذ دیتا ہے اولاد کے لیے۔ اس کے ہاتھ میں بہت شفا ہے۔ میں تم کو اس کے پاس لے جاؤں گی۔ وہ آپ کے لیے دعا بھی کرے گا اور آپ کو تعویذ بھی دے گا۔ مجھے امید ہے اس سے اللہ آپ کی جھولی ضرور ہری کرے گا۔"

کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد ہم نے فون بند

کر دیا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غزالہ کا شکریہ ادا کیا۔ پھر میں نے آنٹی کو کہا کہ آنٹی اگر پھر بھی ان لوگوں سے بات کرنی ہوگی تو میں کرا دیا کروں گا۔" آنٹی کہنے لگی۔

"احسان بیٹا! غزالہ نے کبھی پہلے مجھے کرن اور نازیہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ وہ اس کی دوست ہیں۔" غزالہ نے بناوٹی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اپنی امی کو بتایا کہ دراصل امی مجھے خیال ہی نہیں رہا اور ساتھ میں غزالہ نے اپنی امی سے یہ بھی پوچھ لیا کہ امی کیا نازیہ یہاں آئے گی تعویذ لینے کے لیے تو آنٹی نے بتایا کہ ہاں وہ اور کرن اگلے ہفتے ہمارے گھر آئیں گی۔

یہ سن کر تو ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ یہ سب غزالہ میری خاطر کر رہی تھی اور اس نے کرن اور نازیہ کے بارے میں جو دوستی کا جھوٹ بولا تھا تو صرف میرے لیے، اب میں اس سے بہت خوش تھا۔ جب وہ چلی گئیں تو میں بھی بازار چلا گیا اور وہاں سے ایک بہت ہی خوبصورت سی گھڑی خرید لایا جو میں شکریہ کے طور پر غزالہ کو دینا چاہتا تھا۔ وہ کتنے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ میرا ساتھ دے رہی تھی۔

شام ہوئی تو میں غزالہ کو گفٹ دینے چلا گیا۔ میں نے اس کو اکیلا پا کر کہا۔ "غزالہ! میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں، میرے پاس ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ شکریہ کے طور پر میں آپ کے لیے یہ گھڑی بطور تحفہ لایا ہوں تم اس کو رکھ لو۔"

یہ سن کر وہ مسکرا کر کہنے لگی۔ "احسان! کتنے عجیب ہو تم، میں نے کب اپنے احسانوں کا تم سے بدلہ مانگا ہے۔ تم مجھے ہزار کام، ہزار حکم دو گے تو میں وہ بھی مانوں گی اور اس کے بدلے میں، میں کچھ نہیں مانگوں گی احسان! شاید تم نہیں جانتے کہ میرے دل میں تمہاری کتنی قدر ہے۔ تم جب بھی کچھ کہتے ہو میں اس کو ماننا ضروری سمجھتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں ہماری وجہ سے کبھی آپ کا دل نہ دکھے کیونکہ ہمارے علاوہ آپ کا اور تو اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں دل سے تم کو اپنا سمجھتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے تم ہمارا ہی خون ہو۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہوئی تو میں اس کے قریب چلا گیا اس اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا

"غزالہ! مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہو، میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں نے مجھے کتنا بڑا مقام دیا ہے۔ تم لوگوں نے بھی مجھے غیر نہیں سمجھا۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان یاد رکھوں گا۔ میری دعا ہے کہ تم سب سدا سکھی رہو، آمین۔"

اس وقت ہم دونوں کا لہجہ دکھی سا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے گھڑی نکال کر غزالہ کو دینی چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ میں نے غزالہ کو کہا کہ "اگر تم مجھے اپنا مانتی ہو تو یہ گھڑی تم کو پہننی ہوگی، میں تم کو تحفے کے طور پر دے رہا ہوں اور اگر کوئی کسی سے تحفہ نہ لے تو کتنی بڑی غلط بات ہے۔ ویسے بھی میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا اگر اب تم نے انکار کیا۔" تو پھر مجبوراً اس نے گھڑی لے لی۔ میں بھی خوش ہو گیا اور میں نے اس کو کہا کہ جب وہ لوگ یعنی کرن اور نازیہ یہاں آئیں تو ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آئے۔

غزالہ میری بات سن کر کہنے لگی۔ "تم بے فکر رہو میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی ان کی خدمت میں۔" جب میں مطمئن ہو گیا تو میں نے اجازت لی اور واپس چلا آیا۔

اب کرن اور نازیہ کو آنے میں سات دن زیادہ تو نہیں تھے لیکن مجھے یہ سات دن سات سال کی مسافت کے برابر لگ رہے تھے۔ میں کوشش کرنے لگا کہ زیادہ سے زیادہ کام میں مگن رہوں تا کہ ان دنوں کے انتظار سے میرا دھیان ہٹا رہے اور ذہنی تکلیف سے بچا رہوں۔ پھر بھی زیادہ مصروف رہنے کے باوجود بھی کبھی کبھی دھیان کرن کی طرف چلا جاتا اور یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔

دن گزرتے گئے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جو ان کی آمد کا دن تھا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ صبح ہی نازیہ نے مجھے فون کر دیا تھا کہ ہم ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہاں سے چل پڑیں گے۔ میں نے نازیہ کو تاکید کی کہ کرن کو لازمی ساتھ لے آنا۔ تبھی نازیہ نے بتایا کہ وہ بھی میرے ساتھ ضرور آئے گی اور میری ساس بھی ہمارے ساتھ آ رہی ہے۔ میں نے کہا "جی کیوں نہیں، ضرور آئے وہ بھی۔" میں نے نازیہ کو یہاں تک آنے کا مکمل پتہ بتا دیا اور ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ آپ فلاں اسٹاپ پر اترنا، میں وہاں سے آپ کو لے لوں گا۔ پھر میں نے فون بند کیا اور خوشی خوشی آنٹی اور غزالہ کو

بتانے چلا گیا۔ اس وقت آنٹی گھر میں موجود نہیں تھی تو میں نے غزالہ کو بتا دیا کہ وہ لوگ آ رہے ہیں، تم ان کے آنے سے پہلے گھر کی سیٹنگ وغیرہ کر لو۔ غزالہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میں سب کچھ ٹھیک کر لیتی ہوں، تم ٹائم پر پہنچ جانا ان لوگوں کو لینے۔'' میں نے کہا ٹھیک ہے اور میں پی سی او آ کر ان لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ میں بار بار ٹائم دیکھ رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ لوگ تین تک پہنچ جائیں گے اور جیسے ہی تین بجنے کا ٹائم ہوا میں اسٹاپ پر موجود تھا۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ لوگ گاڑی سے اترے۔ میں نے ایک رکشہ لیا اور ان کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

ہم سب لوگ ان کو بڑی محبت سے ملے۔ ان سب لوگوں سے زیادہ میں خوش تھا کیونکہ آج میری محبت میرے سامنے تھی۔ میں نے کرن کو آنکھوں کے اشارے سے سلام کیا اور اس نے بھی اپنی نظریں جھکا کر سلام کا جواب دیا۔ اب میں آنٹی اور تازیہ کی ساس کے سامنے تو کرن سے ہاتھ تو نہیں ملا سکتا تھا میں نے سوچا کہ وقت ملے گا تو میں ضرور اس کو گلے لگا کر ملوں گا اور حال چال پوچھوں گا۔

وہ لوگ بھی ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ شام ہوئی تو ان کے لیے بہت سارے کھانے تیار کیے۔ کھانا بنانے میں کرن نے غزالہ کی مدد کی تھی۔ میں بہانے بہانے سے کچن میں ان کے پاس چلا جاتا اور کرن کو دیکھ کر خوش ہو جاتا۔ رات کا کھانا جب سب لوگوں نے کھا لیا تو پھر بھی اک محفل سجا کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے سے حال احوال پوچھنے لگے۔ میں بھی انتظار کر رہا تھا کہ کسی طرح موقع ملے اور میں تنہائی میں کرن سے ملوں۔ ہم دونوں الگ ہو کر اپنی باتیں کریں۔ وہ بھی وہی کچھ چاہتی تھی۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے غزالہ کو اشارہ کر کے اپنی طرف بلا لیا اور اس کو سمجھایا کہ غزالہ تم کیوں نہیں سمجھ رہی ہو ہمارے دلوں کی حالت۔ ہم دونوں کتنے بے چین ہیں ایک دوسرے کے لیے۔ تم کسی طرح کرن کو لے کر الگ کمرے میں چلی آؤ، پھر ہم دونوں وہاں ایک دوسرے کا حال چال ہی پوچھ لیں گے اور کچھ باتیں بھی کر لیں گے۔

غزالہ کہنے لگی کہ ''احسان! میں سب جانتی ہوں، پر تم فکر نہ کرو میں کسی بہانے اس کو دوسرے کمرے میں بلا لیتی ہوں۔ لیکن تم دھیان سے آنا۔ ان لوگوں کی نظروں سے بچ کر۔ اگر آنٹی یعنی تازیہ کی ساس اور امی نے تمہیں ہمارے ساتھ دیکھ لیا تو وہ کیا سوچیں گی۔''

''اوہو! تم پریشان نہ ہو۔ میں دھیان سے آؤں گا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں ہو گی۔ بس تم کرن کو بلا لاؤ۔'' بڑی مشکل سے غزالہ کرن کو لے کر میرے پاس آئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''کرن مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آج ہم اس مقام تک آ گئے ہیں کہ آج پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم ایک بار پھر ملیں گے۔''

کرن کہنے لگی۔ ''یہ سب غزالہ اور تازیہ کی مہربانی سے ہے، ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا ہو گا اور شاید ہمارے نصیب میں یہ لکھا تھا۔ بس دعا کیا کرو کہ ہم یوں ہی خوشی خوشی ملتے رہیں۔ ہم کبھی ایک دوسرے سے دور نہ ہوں۔''

''کرن تم ٹھیک کہتی ہو، میں ہمیشہ اپنے اور تمہارے لیے دعا کرتا ہوں کہ ہماری زندگی میں کبھی دکھ نہ آئیں اور ہم کبھی جدا نہ ہوں۔''

پھر کرن نے غزالہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''غزالہ تم ہمارا ساتھ دو گی نا، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے، تم ساتھ دو گی تو ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ میں احسان کو دل و جان سے پیار کرتی ہوں اور اب میں احسان سے دور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی، پلیز تم ہمارا ساتھ دینا ہم زندگی بھر آپ کو دعائیں دیں گے۔''

غزالہ نے کرن کی آنکھوں میں سچا پیار دیکھا تو اس نے کرن کو گلے لگاتے ہوئے کہا ''کرن اللہ نے چاہا تو میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں جب بھی میری ضرورت پڑے گی میں آپ کا ساتھ دوں گی، یہاں تک کہ اپنی جان بھی دے سکتی ہوں تمہارے لیے۔'' یہ سن کر کرن جلدی سے اپنا ہاتھ غزالہ کے ہونٹوں پر رکھ کر کہنے لگی ''غزالہ تم نے ایسا کیوں کہا کہ میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں، میں تو دعا کرتی ہوں کہ میری عمر بھی تم کو لگ جائے۔ تم ہمیشہ سکھی رہو۔ ہم وہ پیار نہیں چاہتے جو اپنوں کی جان لے کر ملے، ہمیں وہ پیار چاہیے جس میں اپنوں کا خلوص شامل ہو اور ایک دوسرے کی خوشیوں کے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمان راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

لیے اپنی خوشیاں بھی قربان کر دیں۔ بس آئندہ تم ایسی باتیں مت کرنا ورنہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔'' اور کرن نے غزالہ کا ماتھا بھی چوم لیا۔ میں خاموش بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کرن خاموش ہوئی تو آنٹی نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ یوں کرن آنٹی کے پاس چلی گئی تو میں نے بھی غزالہ سے اجازت لی اور پی سی او میں آ کر سو گیا۔

صبح میں ان لوگوں کے پاس چلا آیا۔ تقریباً دس بجے آنٹی ان لوگوں کو ساتھ لے کر دوسرے گاؤں تعویذ لینے چلی گئیں۔ اب یہاں کرن ہمارے ساتھ تھی۔ اچانک کرن نے کہا ''احسان چلو ہم پی سی او میں چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے اور پھر ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہم واپس آ جائیں گے۔''

کرن پی سی او میں آ کر بہت خوش تھی ہم تینوں نے وہاں بہت گپیں لگائیں۔ جی کر رہا تھا کہ یہ حسین گھڑیاں ہمیشہ یونہی ٹھہر جائیں اور ہم اسی طرح ہنستے مسکراتے رہیں!

پھر ہم تینوں بازار چلے گئے۔

وہاں سے کرن اور نازیہ کے لیے کپڑے لیے۔ یوں ہم ہنسی خوشی باتیں کرتے عصر سے کچھ دیر پہلے گھر لوٹ آئے کیوں کہ اب ان لوگوں کے آنے کا بھی ٹائم ہو چکا تھا۔

پھر تھوڑی دیر گزری تو وہ لوگ بھی تعویذ لے کر آ گئے۔ غزالہ اور کرن نے ان کو کھانا کھلایا اور پھر غزالہ نے نازیہ سے پوچھا کہ اب تم واپس کب جاؤ گے تو نازیہ کہنے لگی ہم کل چلے جائیں گے اور اب آپ سب لوگوں نے ہمارے گھر آنا ہے۔'' غزالہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ کل نہ جاؤ بلکہ ایک دو دن اور ہمارے پاس رہ لو، تم قسمت سے آئے ہو۔'' لیکن نازیہ نہ مانی۔ اس نے بتایا کہ گھر میں اب سوائے میرے سسر کے اور کوئی نہیں اس لیے ہمیں ضرور جانا ہے۔'' تبھی آنٹی نے کرن کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا اور کرن کی تعریفیں کرنے لگیں۔ آنٹی کہہ رہی تھیں ماشاء اللہ یہ بچی تو بہت خوبصورت ہے اور کرن کے گھر کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگیں۔ نازیہ کی۔ اس نے آنٹی سے کہا کہ آپ ہمارے گھر ضرور آنا تو میں آپ کو کرن کے گھر والوں سے ضرور ملواؤں گی۔

یہ سن کر تو آنٹی بہت خوش ہوئیں۔ میں بھی سوچنے لگا کہ آنٹی کرن کے ساتھ کیوں اتنا خوش ہے۔

اگلے دن وہ لوگ ہم سے رخصت ہو گئے۔ بہت ساری یادیں ہمارے پاس چھوڑ گئے اور بہت ساری یادیں ساتھ لے گئے۔

☆......☆

وقت گزرتا گیا۔ زندگی اپنے معمول کے مطابق چلنے لگی، میں جب بھی شکیل کے گھر جاتا تو اس کی امی کو کرن کی ہی تعریفیں کرتے دیکھتا۔ ایک دن آنٹی نے مجھ سے پوچھا۔

''کرن کیسی لڑکی تھی؟'' میں نے کہا وہ تو بہت پیاری اور اچھی لڑکی تھی۔ مجھے تو بہت پسند آئی۔ یہ سن کر آنٹی بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگی میرا جی کرتا ہے میں اس کو ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی بنا لوں۔ آنٹی کی ان باتوں سے میرا دل خوشی سے جھومنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ باتیں آ رہی تھیں کہ آنٹی کیا چاہتی ہیں کرن کے بارے میں۔ میں تو دل میں آنٹی کو دعائیں دینے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میری زندگی کا مقصد حل ہونے لگا ہے۔ میری زندگی کی خواہشیں اور میرے ارمان پورے ہونے لگے ہیں اور کرن ہمیشہ کے لیے میری زندگی میں شامل ہونے لگی ہے۔ اک پل کو مجھے یوں لگا تھا کہ اب کرن کو کوئی بھی مجھ سے نہیں جدا کر سکتا۔ اس دن سے میں آنٹی کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگا۔ جب بھی وقت ملتا میں اس کے پاس چلا جاتا اور ان سے باتیں کرتا۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ ان ہی دنوں میں ایک بار پھر شکیل چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ ہم سب بہت خوش تھے اس کے آنے سے لیکن شکیل کی امی تو کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہی تھیں۔ ایک دن جب میں شکیل کے پاس گیا تو اس کی امی نے کہا۔

''احسان بیٹا! کھانا کھا کر ادھر ہی رہنا، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ یوں ہم دونوں نے جب کھانا کھا لیا تو آنٹی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور اپنے بیٹے شکیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی ''شکیل بیٹا! میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں لیکن میری بات کا انکار مت کرنا۔'' شکیل کہنے لگا۔

''امی آپ بتائیں میں انکار نہیں کروں گا۔'' تب

آنٹی نے کہا۔
''شکیل بیٹا میں چاہتی ہوں اب تم شادی کرلو۔ میں اپنی آنکھوں سے تم کو دولہا کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں، زندگی کا کیا بھروسہ کب ساتھ چھوڑ جائے اور میرا یہ ارمان میرے دل میں ہی رہ جائے۔ بولو! اب تم کیا کہتے ہو۔'' شکیل کچھ دیر تو سوچتا رہا پھر کہنے لگا۔
''امی جان! میں شادی ضرور کروں گا لیکن اپنی بہن غزالہ کی شادی کے بعد، میں چاہتا ہوں پہلے اس کی شادی کردی جائے، میں تو بعد میں بھی کرسکتا ہوں۔''
آنٹی نے پریشان ہوتے ہوئے کہا'' بیٹا! تم غزالہ کی فکر مت کرو۔ اس کے بارے میں بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ بس تمہاری شادی کے کچھ ہی دن بعد اس کی شادی بھی ہوجائے گی۔ اب تم ہاں کرو بیٹا میں نے تو تمہارے لیے لڑکی بھی پسند کرلی ہے۔ بہت پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ تم ہاں کرو تاکہ میں اس کا رشتہ مانگوں۔'' لیکن شکیل اپنی ضد پہ ڈٹا رہا تب آنٹی نے مجھے کہا۔
''احسان! تم ہی اس کو سمجھاؤ شاید تمہاری بات مان جائے۔''
میں نے شکیل کو بڑی مشکل سے راضی کیا تو آنٹی خوش ہوگئیں۔
میں جب وہاں سے اٹھ کر سونے کے لیے پی سی او میں آیا تو میں ان ساری باتوں پر غور کرنے لگا کہ وہ کون سی لڑکی ہے جو آنٹی نے شکیل کے لیے پسند کی ہوئی ہے۔ میں نے آج تک کبھی ان لوگوں کے گھر میں بھی کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تھا کہ جس کو آنٹی نے پسند کیا ہو۔ اچانک اک خیال نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ کیا کہیں وہ لڑکی کرن تو نہیں جس کو آنٹی نے شکیل کے لیے پسند کیا ہوا ہے۔ اس لیے تو آنٹی کرن کے بہت قریب ہوگئی تھی جب کرن نازیہ کے ساتھ یہاں آئی تھی۔
اس خیال نے تو مجھے وہ حقیقت دکھادی تھی جو آنٹی کے من میں تھی۔ ان ساری باتوں میں مجھے حقیقت نظر آرہی تھی۔ کرن کی جدائی کا تصور مجھے اندر سے تڑپاتا چلا گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے گئے ہوں۔ میں کیسے کرن کی جدائی برداشت کرسکتا تھا۔ کبھی تصور میں بھی نہیں۔ میں کرن کو پانے کے لیے ہر ایک سے لڑوں گا، وہ میرا حق ہے۔ میں کسی کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میں آنٹی کو بتاؤں گا کہ کرن کو اگر مانگنا ہے تو میرے لیے مانگو۔ پیار ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ شکیل نہیں کرتا پیار اس سے۔
میں آنٹی کو سب کچھ بتاؤں گا، کرن اور اپنے بارے میں۔ سوچتے سوچتے پھر خیال آیا کہ کیا میں ان لوگوں سے لڑوں گا جن لوگوں کے ہزاروں احسان ہیں مجھ پر اور ان لوگوں نے مجھے کبھی غیر نہیں سمجھا نہ ہی کبھی میری کسی خواہش کو ٹھکرایا۔ میرے خون کے رشتے تو مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ ان لوگوں کا پیار اور خلوص کرن کی محبت سے کہیں زیادہ طاقت میں تھا۔

☆......☆

صبح ہوئی تو میری طبیعت بہت اداس اور تھکی تھکی سی تھی۔ ابھی بھی کرن کی یاد ستا رہی تھی، اس سے دور جانے کا تصور کتنا کرب ناک تھا یہ تو میں ہی جانتا تھا۔ جب کرن کا پیار اور اس کی یاد آتی تو دل کرتا کہ میں آنٹی کو سب کچھ بتادوں۔ اس طرح میری محبت برباد ہونے سے بچ جائے گی لیکن پھر ان لوگوں کی مہربانیوں کا سوچ کر میں خاموش ہوجاتا۔
میں سب کچھ آنٹی کو بتانے کے لیے تیار ہوگیا کہ اس کو ساری حقیقت بتادوں لیکن تقدیر نے بھی میرے ساتھ کچھ عجیب طرح کا کھیل کھیلا کہ میں اور بھی اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ جب میں ہمت کرکے آنٹی کو سب کچھ بتانے کے لیے اس کے پاس گیا تو میں نے کہا کہ آنٹی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آنٹی کہنے لگیں۔
''کہو احسان بیٹا! کیا کہنا چاہتے ہو؟'' کہہ کر پکار رہی تھی۔ بس اسی محبت نے میری ہمت توڑ دی اور میں خاموش ہوگیا۔ تبھی آنٹی نے کہا'' کہو احسان بیٹا! تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' جب میں نے کہنا چاہا کہ دراصل آنٹی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بس میں اتنا کچھ کہہ کر چپ ہوا تو درمیان میں آنٹی نے کہہ دیا۔'' بیٹا! تم یہی کہنا چاہتے ہو کہ میں غزالہ کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ سن کر آنٹی نے مجھے حیرتوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا جہاں سے نکلنا بھی مشکل تھا۔ میں نے مزید کچھ کہنا چاہا تو آنٹی نے ساری تفصیل مجھے سنادی اور میں سوائے

افسوس اور دکھ کے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ آنٹی نے کہا۔ ''بیٹا میں نے تو کب سے یہ سوچا ہوا تھا کہ اپنی بیٹی غزالہ سے تیری شادی کروں گی اور تجھے اپنا بیٹا بناؤں گی۔ بس فکر تھی تو شکیل کی، اللہ نے وہ فکر بھی دور کردی۔ میں نے شکیل کے لیے کرن کو پسند کیا ہے۔ اب جب وہ لوگ ہمیں گھر بلائیں گے تو میں اس کے والدین سے اس کا ہاتھ مانگوں گی۔ دعا کرو کہ وہ لوگ انکار نہ کریں۔'' وہ باتیں جو ابھی تک سوچوں تک ہی محدود تھیں اچانک حقیقت کا روپ بن کر میرے سامنے آگئی تھیں اور اب میرے لیے کوئی گنجائش نہ تھی کہ میں کرن کا تصور بھی کر پاتا۔ جب ہمت نے جواب دیا تو میں اداس اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

☆......☆

تقدیر نے مجھے کس قدر مجبور و بے بس کر دیا تھا، کرن کی طرف دیکھتا تو ان لوگوں کے احسان بھلانے والی بات تھی اور اگر ان لوگوں کے احسان دیکھتا تو کرن کی محبت بھلانے والی بات تھی۔ اب میں کیا کرتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ سوچوں اور پریشانیوں میں، میں اس قدر کمزور ہو گیا کہ اٹھتے بیٹھتے آنکھوں میں اندھیرا سا چھا جاتا اور آنکھوں میں اداسیاں اور ویرانیاں چھا گئی تھیں۔ میں مسلسل تین دن تک پی سی او میں ہی پڑا رہا۔ پھر شکیل مجبوراً مجھے گھر لے گیا۔ وہ میری آنکھوں کی اداسی اور کمزور طبیعت کو دیکھ چکا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ میں اس کو بتاؤں کہ میں کیوں اداس اور پریشان ہوں۔ لیکن میں خاموش رہا۔ شکیل ایک ضروری کام سے باہر چلا گیا تو غزالہ میرے پاس چلی آئی۔ غزالہ سب کچھ جان چکی تھی، کہنے لگی ''احسان! تم مجھے کچھ بھی نہ بتاؤ لیکن مجھے سب پتا ہے کہ تم کیوں اور کس لیے اداس ہو۔ میں نے وہ ساری باتیں سن لی تھیں جو آپ کے اور امی کے درمیان ہوئی تھیں۔ میں جانتی ہوں کہ امی آپ کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کررہی ہیں۔ پر احسان! آپ کو چاہیے تھا کہ اس وقت امی کو سب کچھ بتا دیتے۔ ہوسکتا تھا کہ وہ آپ کی بات مان لیتیں اور سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔''

غزالہ کی بات سن کر میں نے اس کو بتایا کہ ''میں خوش ہوں آنٹی کے فیصلے پر۔ انہوں نے جو بھی سوچا ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہمیں بڑوں کے حکم کے آگے سر جھکا دینا چاہیے، خواہ ان کے اس حکم میں ہمارا کتنا بڑا ہی نقصان کیوں نہ ہو اور بڑوں کے فیصلے بہتر ہوتے ہیں۔''

غزالہ کہنے لگی کہ ''احسان! حیرت ہے کہ تم اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی محبت کو قربان ہوتے ہوئے دیکھنا چاہ رہے ہو۔ کیا تم میں اتنا حوصلہ ہے، کیا کرن کے بنا جی لوگے اور اس کی محبت کو ٹھکرا دوگے۔ صرف ایک امی کی خوشی اور حکم کی خاطر..... مجھے تو خود دکھ ہو رہا ہے جب سے امی کی یہ باتیں سنی ہیں تب سے میں پریشان ہوں۔ احسان! تم امی کو سب کچھ بتا دو۔ اب بھی وقت ہے اپنی محبت اور اپنے ارمانوں کو قربان ہونے سے بچالو ورنہ ساری زندگی کرن کی یادوں میں جلتے رہوگے۔ پھر تمہیں میری ان باتوں کا احساس ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''غزالہ آپ کی ساری باتیں درست ہیں، پچھتاوا تو مجھے زندگی بھر رہے گا لیکن مجھے یہ خوشی بھی ہوگی کہ میں نے کسی اور کی خوشی کے لیے اپنی خوشی اور محبت کو قربان کر دیا تھا اور میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں۔ میں امی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔ آخر ان کے بھی کچھ ارمان ہیں اور میں چاہتا ہوں ان کے وہ ارمان پورے ہوں۔ وہ اپنے بیٹے شکیل کے لیے اگر کرن کو پسند کر چکی ہیں تو کیا ہوا۔ میں ان کی خوشی میں جی لوں گا۔''

اب مجھے کسی طرح کرن اور نازیہ کو ان سارے حالات کے بارے میں بتانا تھا۔ میں نے شام کو نازیہ کا نمبر ملایا تو اس نے فون اٹھایا۔ خیریت پوچھنے کے بعد میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت حیران ہوئی یہ سب سن کر، اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ میں کرن کو چھوڑ رہا ہوں ایک انسان کی خوشی کی خاطر۔ نازیہ کہنے لگی۔

''احسان! تم تو بہت پتھر دل ہو، تم ٹھیک نہیں کررہے ہو کرن کے ساتھ۔ وہ تو پہلے بھی بہت دکھی ہے۔ وہ تو غم سے مر جائے گی۔ وہ تو آپ کے حوصلوں کے سہارے جی رہی ہے۔ اب یہ دکھ بھی اس کو توڑ دے گا۔ خدا کے لیے تم اس کے ساتھ ایسا مت کرو، تم کو اپنی آنٹی کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ اگر تم میں ہمت نہیں ہے تو میری آنٹی سے بات کرادو، میں ان کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔''

"نازیہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ نازیہ جی! میں بھی کرن کے بنا نہیں رہ سکتا۔ بس کبھی کبھی مقدر کے آگے جھکنا پڑ جاتا ہے اور ویسے بھی محبت وصال یار ہی کا نام تو نہیں۔ نازیہ! تم کیا جانو کہ اس وقت میں کس حال میں ہوں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ تم کو میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ بس تم کسی طرح کرن کو یہ سب کچھ بتا کر راضی کر دو۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

نازیہ کہنے لگی۔ "احسان! میں تو پہلے بھی آپ کی مدد کر رہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ کرن اور آپ کو آپس میں ملا دوں لیکن اب میں اپنی پیاری دوست کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ میں اس کا ساتھ دوں گی۔ کیسے دوست ہو تم، وہ بہت اداس ہے آپ کے لیے۔" کرن کی اداسی کا سن کر میں بے چین سا ہو گیا۔

"احسان! تم اپنی آنٹی اور غزالہ کو میرا پیغام دے دو کہ آپ کل ہمارے ہاں آ جاؤ کچھ دنوں کے لیے اور میری ساس بھی کہہ رہی تھیں کہ ان لوگوں کو گھر پہ بلا لو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے نازیہ! تم کرن کا خیال رکھنا اور میرا اس کو سلام بھی کہنا ہم انشاء اللہ کل ضرور آ جائیں گے۔"

اور یوں ہم دونوں کا رابطہ کٹ گیا۔

میں جلدی جلدی آنٹی کو بتانے چلا گیا اور پھر ان کو بتا دیا کہ وہ لوگ آپ کو گھر بلا رہے ہیں۔ آنٹی تو جیسے انتظار میں ہی تھیں۔ سنتے ہی خوش ہو گئی تھیں۔ لیکن کاش وہ میرے دل کی حالت جان پاتیں۔

☆......☆

اگلے روز ہم لوگ تیار ہو کر ان کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو وہ لوگ ہمیں بڑی محبت اور چاہت سے ملے۔ نازیہ کہنے لگی کہ "مجھے یقین تو نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔"

"ہم کیوں نہ آتے، آپ لوگ ہمیں بہت اچھے لگے اس لیے آپ کو ملنے کے لیے دل کر رہا تھا اور ہم چلے آئے۔" غزالہ نے جھٹ جواب دیا تھا۔

ہم سب لوگ آپس میں گھل مل گئے۔ جب ہم نے کھانا کھا لیا تو میں نے نازیہ سے کرن کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ شام کے بعد اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ یہاں آئے گی۔ ویسے ان کو آپ کے آنے کی خبر ہو چکی ہے لیکن آنٹی بار بار کرن کا پوچھ رہی تھیں، کبھی نازیہ سے تو کبھی اس کی ساس سے۔ کتنی جلدی تھی آنٹی کو کرن سے ملنے کی۔ شاید اتنا پیار کرنے والوں کو بھی نہ ہوتی ہوگی۔ دل تو میرا بھی مچل رہا تھا اس کو دیکھنے کے لیے۔ کتنے دنوں کے بعد اس کو دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ خدا کی ذات ہی انسانوں کے مقدر اور نصیب بناتی ہے۔ کبھی ہم نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان اجنبی لوگوں سے بھی کبھی ہمارا تعلق ہوگا۔ بس یہ سب اوپر والے کے انوکھے کام ہیں۔ اللہ اللہ کر کے شام ڈھلی تو میں کرن اور اس کی سوتیلی ماں آ گئیں۔ ہم دونوں کی اداس اور بے تاب آنکھیں ایک دوسرے سے دو چار ہوئیں تو اک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہماری آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے ہزاروں گلے شکوے تھے۔ بس وہ اک تنہائی کے منتظر تھے کہ کب تنہائی ملے اور ہم ان گلے شکوؤں کا ایک دوسرے سے اظہار کریں۔ اور جب میں نے کرن کی سوتیلی ماں کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بھی کرن کی طرح حسن و جمال کا پیکر تھی۔ وہ بڑے نخرے کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ آنٹی نے ہم سب کا تعارف ان سے کرایا۔ اس کا بات کرنے کا انداز بھی عجیب تھا۔ اس کی ہر بات، ہر انداز مختلف تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میں کرن کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کی اصل وجہ جان گیا اور یہ بھی میں نے اندازہ لگا لیا کہ کرن کا سگا باپ کیوں اپنی بیوی کا ساتھ دیتا تھا اور اس نے کرن کو کیوں نظر انداز کیا ہوا تھا۔ اس کی اصل وجہ کرن کی سوتیلی ماں ناہید کا حسن و جمال تھا۔ کرن کا باپ اپنی دوسری بیگم کی خوبصورت زلفوں کا اسیر تھا۔ وہ صرف اسی کی ہاں میں ہاں ملانے کا پابند تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ وہ دونوں ہمارے ساتھ باتیں کرتی رہیں پھر وہ اپنے گھر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے کرن کی ماں ناہید دوسرے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت کا بھی کہہ گئی بھی آنٹی کو۔ آنٹی نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئیں گی۔ کرن بھی اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی حالانکہ اس کو نازیہ نے روکا بھی تھا کہ آج رات تم یہاں ہمارے پاس رہ لو لیکن اس کی امی نے انکار کر دیا تھا۔

رات بہت گزر چکی تھی، سبھی لوگ سو چکے تھے سوائے

نازیہ، غزالہ اور میرے۔ ہم ابھی بھی باتوں میں مگن تھے اور ویسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

اور پھر کچھ دیر بعد نازیہ اور غزالہ بھی گہری نیند سو گئی تھیں لیکن میں ابھی بھی سوچوں میں گم تھا۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی مگر سوچوں اور پریشانیوں میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ اب میں چاہتا تھا کہ ایک بار کرن ملے تو اس کو ساری پریشانیاں اور دکھ بتاؤں اور اس سے معافی مانگوں کہ میں ہار گیا ہوں۔ میں وہ وعدے نہیں نبھا سکتا جو اس کی چاہت میں کیے تھے۔

☆.....☆

دوپہر ہوئی تو کرن کی امی ہمیں بلانے چلی آئی۔ ہم سب تیار ہو کر ان کے گھر چلے گئے۔ ہم ساتھ میں نازیہ اور اس کی ساس کو بھی لے گئے تھے۔ کرن کی امی نے خوب بناؤ سنگھار کیا ہوا تھا۔ سچ پوچھو تو انسان اس کو دیکھ کر متاثر ضرور ہوتا تاہم کرن سادگی میں بھی پیاری لگ رہی تھی۔ میں اس سے نظریں چرانے لگا تھا۔ مجھ میں ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کا سامنا کروں۔ دل میں خیال آیا کہ کرن تم سے جدا ہو کر جینا کتنا مشکل ہوگا شاید نہ جی سکوں مگر اب تو جینا پڑ رہا تھا، خوشی سے یا مجبوری اور دکھ سے۔ جب سب لوگوں نے کھانا کھا لیا تو آنٹی نازیہ کی ساس اور کرن کی ماں کو لے کر ایک الگ کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے نازیہ کو اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چلو ہم آپ کے گھر میں چلتے ہیں اور ساتھ میں کرن کو بھی بلا لو۔ نازیہ نے کرن کو ساتھ لیا اور ہم نازیہ کے گھر چلے آئے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو میں نے کرن سے اس کا حال پوچھا اور میں نے نہایت دکھی انداز میں کہا۔

''کرن! میں آج تم سے کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جس سے تمہیں دکھ بھی ہوگا اور افسوس بھی لیکن جب تم حقیقت میں ان سب باتوں پر غور کرو گی تو تم کو اس میں ہم سب کے لیے اچھائی اور ہمدردی نظر آئے گی مگر یہ سب کچھ جو جینے اور ہمت سے ہوگا اور تم کو ہمت کر کے میری باتیں غور سے سننی ہوں گی اور شاید تم کو مجھ سے نفرت بھی ہو سب کچھ سن کر، لیکن میری مجبوریوں اور میری ذات کا خیال ضرور رکھنا۔''

میں نے جب کرن کی آنکھوں کو دیکھا تو وہ حیران اور افسردہ سی نظر آنے لگی تھیں۔ نازیہ اور غزالہ بھی خاموش تھیں۔ وہ بھی جانتی تھیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں کرن سے۔

کرن نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ''احسان! تم جو بھی کہنا چاہتے ہو ضرور کہو۔ میں اتنا تو حوصلہ ضرور رکھتی ہوں کہ آپ کی ہر بات سمجھوں، خواہ وہ دکھ والی بات ہو یا پریشان کرنے والی۔''

میں نے بڑی ہمت سے پھر کرن کو وہ سب باتیں بتا دیں جن سے وہ ابھی تک بے خبر تھی۔ آخر میں نے کرن کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''کرن! اب ایک طرف تمہاری محبت اور تم ہو تو دوسری طرف یہ لوگ ہیں میرے ساتھ اور ان کے ان گنت احسانات جو میں ساری زندگی نہیں اتار سکتا۔ اب اگر ان لوگوں کی خوشی کے لیے مجھے ایک چھوٹی سی قربانی دینی پڑ رہی ہے تو میں اس قربانی سے انکار کروں ایسا ہرگز میں نہیں چاہتا۔ میں ان کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آنٹی کی خوشی پوری ہو جو ہر بات سے اہم ہے۔ اب تم بتاؤ کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں۔'' کرن سب کچھ سن کر سوچتی رہی اور پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''احسان! حقیقت اور سچائی یہ ہے کہ ہمیں بڑوں کی رضا کے آگے جھک جانا چاہیے، اسی میں ہماری بھلائی ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ان لوگوں کی خوشی میں خوش رہو اور یہ خوشی کبھی ختم نہ ہونے پائے۔ جہاں تک میری محبت کی بات ہے تو میں خوش ہوں کہ اگر ہم دونوں کی ایک چھوٹی سی قربانی سے ان لوگوں کو زندگی بھر کی خوشی ملتی ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

کرن نے تو ہم سب کو حیران کر دیا تھا۔ میری ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اس نے میری مرضی کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہی تھی سچے جذبوں کی سچی پہچان۔ سچ یہی ہے کہ انسان کو اصل خوشی تب ہی ملتی ہے جب وہ دوسروں کو خوش رکھتا ہے۔ ہم دونوں نے بھی دوسروں کو خوش رکھنے کا عہد کر لیا تھا اور قدرت نے ہمیں اس مقصد میں کامیاب کر دیا اور ہم دونوں بھی ایک دوسرے سے دور رہ کر خوش تھے۔ محبت نے قربانی دے کر خود کو ثابت کر دیا تھا۔

☆☆☆

جینی سے فاطمہ تک

مومنہ بتول

عشق مجازی سے عشق حقیقی پر انجام کو پہنچنے والی محبت کی ایک لازوال داستان

خبر ہی کچھ ایسی تھی کہ ہاشم رضا صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آنے کی تیاری کرنے لگے۔ رات آپا نے اماں کی اچانک خرابی طبیعت اور اسپتال میں ایڈمٹ کر لینے سے لے کر ڈاکٹروں کے جواب دے دینے تک کا احوال روتے ہوئے بتایا تھا۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔

''اماں جی!'' بظاہر تو بے حس ٹھنڈے جذبات رکھنے والا ہاشم رضا سن سا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے تگ و دو شروع کر دی۔ ہاشم رضا پچھلے 22 سال سے اٹلی میں مقیم تھا۔ اپنی ان تھک محنت سے اس نے بڑی جدوجہد کے بعد آخر کار اپنے قدم جما لیے تھے اور ان بائیس برسوں میں سے اس نے اپنی پانچ بہنوں کی شادیاں کیں، اماں ابا کو حج کرایا، پکا مکان بنوایا اور تو اور اپنے بڑے بھائی کے بچوں کو بھی تعلیمی اور ہر سطح پر ان کا ساتھ دے کر انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کیا تھا۔ ان سالوں کی بے حسی نے اور مسلسل محنت شاقہ نے بھی اسے اپنے مقصد سے ہٹنے نہ دیا۔ پاکستان میں سب کو اپنی جگہ سیٹ کرنے کے بعد بھی اس کی ہمت میں کوئی کمی نہ آئی تھی، بلکہ کچھ اور کر لینے کا جذبہ جنون بننے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اماں ابا کے اصرار کے باوجود وہ ایک مرتبہ بھی پاکستان نہ لوٹ سکا تھا۔ آگے اور آگے منزلیں سر کر لینے کی ابدی خواہش کے زیر اثر پر عمل کرتا رہا اور بہت کامیاب بھی رہا تھا اور آج سے دس سال پہلے اماں نے اپنی قسم دے کر اس سے شادی کر لینے کا وعدہ کیا تھا۔ سو اس نے بہت سوچ بچار کر کے مسلم اٹالین فیملی کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اب اس کے 9 سالہ اور 5 سالہ دو بچے تھے وہ مطمئن خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا کہ اماں جی کی اچانک علالت کی خبر نے جیسے اس کے سرد وجود میں محبت کی کوئی چنگاری سی گرا دی تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنا گھر ماں باپ بہن بھائی یاد آنے لگے اور اماں جی اور ان کی گم گشتہ محبت یکدم ہی سینے میں دل بن کر دھڑکنے لگی تھی سو اس نے واپسی میں تاخیر نہیں کی۔ تنگی وقت کے باعث وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ نہ لا سکا اور روتا تڑپتا ہوا پاکستان پہنچا تھا۔ اپنے شہر اور اپنے قصبے تک پہنچنے تک گزری ساعتیں اس کی آنکھوں میں آنسو بنتی رہیں اور اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ ''جڑیں آخر اپنی زمین میں رہنا پسند کرتی ہیں۔''

اس کے لوٹ آنے سے اماں جی کے وجود میں کوئی زندگی نہیں جاگی تھی۔ اس نے دن رات آئی سی یو روم میں ماں کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر بے تحاشا آنسو بہائے، انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا، خود ساختہ جدائی کی معافیاں مانگتا رہا مگر بے سود آخر اس کے آنے کے ایک ہفتے بعد اماں جی اسی خاموشی کے ساتھ ابدی نیند سو گئیں۔ وہ

قطرہ قطرہ موم بنا آنسوؤں کی صورت پگھلتا رہا۔ تدفین سوئم تک اسے کوئی ہوش ہی نہ رہا تھا۔ بس جب ماں کی یاد ستاتی تو قبرستان جا کر قبر کے سرہانے بیٹھ کر سورۂ یاسین کی تلاوت کرتا رہتا۔ یہ حقیقت تھی کہ دیارِ غیر میں تنہا رہتے ہوئے بھی اس نے نماز، تلاوت قرآن اور شرعی احکام سے روگردانی نہ کی تھی بلکہ اور زیادہ عبادت کر کے اپنے رب سے قرب حاصل کرنے کا ذوق وشوق برقرار رکھا تھا۔

اس دن بھی وہ کافی دیر تک تلاوت کر کے بخشتا رہا پھر یونہی ٹہلتے ٹہلتے قبرستان کے دوسری طرف نکل آیا۔ قبرستان کی دیوار کے ساتھ بہتی نہر کنارے لگے چھتنار درخت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے جیسے اس کے اندر توانائی سی بھر رہی تھی۔ اسی نہر پر تو وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ نہانے آیا کرتا تھا۔ اس کے اندر بچپن، لڑکپن کی حسین یادیں ہلکورے لینے لگی تھیں۔ وہ دھیمے قدم اٹھاتا۔ چلتا رہا۔ ماضی کو سوچتا، اس کی یادوں کے سیلاب کو یکدم سے بریک لگا تھا۔ قبرستان کی حدود ختم ہو چکی تھی اور برسوں پرانی مسجد نور فاطمہ اپنے سفید وجود کو لیے آج بھی قائم تھی۔ جس کے ارد گرد چھوٹی سی آبادی تھی مگر اب اس آبادی کا دائرہ کار بڑھ چکا تھا۔ مسجد کے سفید محرابی ماتھے پر کندہ نام اور اس مسجد نے یکدم ہی اس کے بھولے بسرے جوانی کے ایام کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ مسجد نور فاطمہ اور ان کے پیش امام نور الٰہی اس کے تصور میں آ گئے اور ساتھ ہی ایک شرارہ سا لپکا تھا اس کے وجود میں۔ جینی، جینی پارکنیز...... اس کی بھولی بسری محبت اس کی گم گشتہ حیات، اس کی چاہت اس کی یادِ رفتگاں...... وہ لڑکھڑایا، سینے میں ہوک سی اٹھی۔ پھر وہ نور فاطمہ مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ احساس سود زیاں کی اچانک ہونے والی یلغار نے اس جیسے تھکن سے بے حس اور سفا کی کی حدود کو چھوتے ہاشم رضا کو جھنجوڑ ڈالا۔ چشم تصور میں یکدم ہی جینی پارکنیز آ کھڑی ہوئی۔ چمپئی رنگت اور نرگسی آنکھیں وہ آنکھیں جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ تخلیق کائنات نے بطور خاص ہیروں کے چھوٹے چھوٹے لشکارے مارتے ذرات اس کی آنکھوں میں بھر دیے ہیں، جس کی چکا چوند مخاطب کے چہرے کو بھی جلا بخشتی تھی۔ دل مہینوں سالوں بعد اچانک اسے سب کچھ



یاد آنے لگا تھا۔ حالانکہ وہ اسے بھلانا نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیوں عرصہ دراز ہوا، وہ جو اس کی محبت تھی، اس کے زندہ رہنے کا جواز تھی خود بخود دھوتی گئی۔ ایسے کہ بھی اس کی محبت دوبارہ سے دل میں جاگی نہ اس کی جدائی نے تڑپایا۔ نہ اس کے سنگ گزرتے ماہ و سال نے اپنا احساس دلایا۔ ساتھ جینے مرنے کے وہ وعدے جو انہوں نے کیے تھے ہوا ہو گئے تھے۔ اسی مسجد کے پیش امام تو ان کی محبت کے گواہ بنے تھے۔ انہوں نے ہی تو جینی اور ہاشم کی رضا سے اسے مسلمان کیا تھا۔ اسے پابند کیا تھا کہ اک نومسلم کو دائرہ اسلام میں لانا خوش بختی سہی مگر اب اس کا خیال رکھنا، اس کا سہارا بننا، اسے تحفظ دینا اور اسے زوجیت میں لانا۔ اب اس کا وہ وعدہ ہے جو وہ اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر اللہ کے گھر میں بیٹھ کر کر رہا ہے۔ مہلت مانگ رہا ہے۔ کچھ وقت گزر جانے تک اپنے قدموں اور فیصلوں پر جم جانے تک۔ پھر وہ اپنی محبت کو اپنے نام دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ جینی مسرور ہے، شادمان ہے، خوشی اس کے روم روم سے پھوٹ رہی ہے۔ اس کے سیاہ گھنے بالوں والے خوشنما سر پر، سفید چار جٹ کا دوپٹہ، حجاب کی صورت، اس کے ملیح چہرے پر خوشی، محبت کو پالینے کا جذبہ، دین اسلام کو سیکھ لینے کا عزم چمک رہا ہے۔ پاکیزہ ماحول، دل کی سچی گواہیاں، سفید ریش نورانی امام صاحب نادیدہ فرشتوں کی آمد۔ نور بکھر رہا ہے۔ فضا بھی مہک رہی ہے۔

"اب تم..... ہاں ہاشم رضا تم..... اپنی رضا سے اپنی محبت کو اسلامی نام دو۔ جواب اس کا پہلا حق ہے۔" پیش امام صاحب کی ٹھنڈی آواز کانوں میں گونجی۔

"میں!" اسے اپنا آپ یکدم ہی معتبر لگنے لگا۔

"ہاں بیٹا! یہ بچی تمہاری محبت کے ساتھ ساتھ اپنی رضا و رغبت سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ تم نے ابھی اعتراف کیا ہے۔ فرشتے بھی گواہ ہیں۔ اللہ اور اس کا رسول بھی۔ اب تم آزاد نہیں پابند ہو گئے ہو کہ اپنی مانگی جانے والی مدت کے بعد پہلا کام اسے عقد میں لینے کا کرو گے۔ اسے اس کا حق، معاشرے میں مقام دلانا تمہارا کام ہے۔ لہٰذا اب تم ہی اس کو نام دو۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" ہاشم کو اپنا وعدہ یاد آیا۔" امام صاحب آج سے اس کا نام نور فاطمہ ہے۔ دین کا نور، ایمان کا نور، میری زندگی کا نور۔"

برسوں پہلے کے الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہونے لگے اور وہ ندامت کے کنویں میں گرنے لگا۔ شرمندگی، دھوکا دینے کا اذیت ناک احساس۔ پچھتاوا بن کر اس کی ذات کے گرد لپٹنے لگا۔ کاش اے کاش۔

"یا اللہ کتنی بڑی بھول ہو گئی مجھ سے، میں نے ایک معصوم لڑکی کو ہی نہیں تجھے، تیرے حبیب کو دھوکا دیا۔ پلٹ کر اسے دیکھا نہ خبر لی، جانے کس حالت کو پہنچی ہو گی وہ۔ یا خدا یہ کیا گناہ کر بیٹھا میں۔" وہ بلک بلک گیا۔ اشک ندامت آنکھوں سے گر گر کر اس کا دامن بھگونے لگے۔

"اسے سب یاد آ گیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے ابھی پل بھر پہلے کی بات ہو۔ اسے یاد آیا۔ ان کے دیے نام کو جینی نے کسی تعویذ کی طرح اپنے ماتھے پر سجا لیا تھا۔

"ہاشم..... تم دیکھنا میں اس ایمان کے نور کی تابناکی، کبھی کم نہ ہونے دوں گی اب اللہ اور اس کا رسول میرے ساتھ ہے۔ پھر تمہاری ذات، تمہاری محبت میرا استقلال، دین اسلام کی راہ میں کتنی دشواریاں آئیں یا تم تک پہنچنے کی راہ میں کتنی بدنامیاں میرے حصے میں آئیں اب کوئی مشکل، کوئی رکاوٹ مجھے میرے ارادوں سے نہیں پھیر سکتی۔" تصور میں جینی کی پرعزم آواز گونجی۔

"میں رب کی رضا کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔ سوائے موت کے اور اللہ کی رضا کے کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی۔"

"اللہ تم دونوں کو دین کی سمجھ دے۔ تمہارے راستے آسان ہوں۔ لو اب یہ کھجور کھا کر منہ میٹھا کرو۔" پیش امام صاحب نے چھوٹی سی رکابی آگے کی۔ پھر تینوں نے ایک ایک کھجور منہ میں ڈالی مگر اس سے پہلے امام صاحب نے نو مسلم نور فاطمہ کو بسم اللہ پڑھائی، ساتھ ہی اس کا ترجمہ اور تشریح بیان کی۔" یا اللہ! معاف کر دے! مجھ سے کتنی بڑی بھول ہو گئی۔ بلکہ بھول کہاں! یہ خطا ہے، خطا جان کر کی جانے والی..... خطا عمداً جس کی کوئی معافی تلافی نہیں۔ دھوکا، فریب، بدنیتی، جھوٹ، کتنے نوکیلے پتھر اس کے اپنے گناہ، نوکیلے پتھر بن کر اس کی روح میں چبھنے لگے تھے۔" یہ کیا کر دیا میں نے۔" احساس ندامت آگ کے شعلے بن بن کر اسے جلانے لگے تھے۔ اس اذیت کو برداشت کرنا

وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ احساس ندامت نے آگھیرا تھا یا ظالم کی دراز رسی کھینچی جانے کا وقت قریب آ چکا تھا۔

☆......☆

وہ قصبہ ضلع جہلم میں واقع تھا جہاں ہاشم رضا نے ایک دیہی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ سب سے بڑے بھائی پھر یکے بعد دیگرے پانچ بہنیں اور آخر میں ہاشم ان کے گھر میں دینی تعلیمات کا اہتمام تو ہوتا تھا مگر دنیاوی تعلیم کا رواج بالکل بھی نہ تھا مگر ہاشم کو شروع سے پڑھنے کا شوق تھا۔ قرآن پاک کے ساتھ ساتھ وہ مولوی صاحب سے اردو انگریزی بھی پڑھتا تھا پھر یہ اس کی خوش نصیبی ٹھہری تھی کہ ان ہی دنوں گاؤں میں حکومت کی طرف سے مڈل اسکول کا قیام عمل میں لایا گیا جو بتدریج بڑھتے بڑھتے سیکنڈری ہائر اسکول میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہاشم نے میٹرک اسی اسکول سے کیا تھا۔ آگے تعلیم کے لیے وہ اور اس کا دوست خرم لاہور جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ خرم ایک کرسچن فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور ہاشم کا دوست آٹھویں کلاس سے بنا تھا۔

ان کے قصبے کے آخر میں واقع قبرستان کے بعد ایک چھوٹی سی مسلمانوں کی آبادی تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ کرسچن کالونی تھی۔ اس شئم کی مناسبت سے اس کالونی کا نام مسلم اینڈ موسیٰ کالونی پڑ گیا تھا۔ ہاشم کو گھر والوں کی طرف سے اجازت نہ تھی یہی وجہ تھی کہ بچپن، لڑکپن اور پھر نوجوانی کے دن اس نے اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ اس نہر میں نہاتے کھیلتے کودتے بتائے تھے اور کبھی اس سے آگے نہیں گیا تھا مگر جب خرم نے اس کے اسکول میں ایڈمیشن لیا تو ہم جماعت ہونے کے ناتے دونوں میں دوستی ہو گئی، جو میٹرک تک پکی دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اب ہاشم کئی مرتبہ خرم کے ساتھ اس کے گھر بھی گیا تھا اور وہیں پہلی بار اس نے جینی پارکنز کو دیکھا تھا۔ جینی شوخ و چنچل مزاج رکھنے والی ایک خوب صورت دوشیزہ تھی، جسے قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا تھا۔ چمپئی رنگت، کنول نین، جو از حد سرمگیں تھے، بھرے بھرے رسیلے ہونٹ سیاہ ناگن جیسی زلفیں، متناسب ڈیل ڈول، حد درجہ رکھ رکھاؤ والی مگر خوش مزاج جینی، پہلے دن ہی ہاشم کے دل میں اتر گئی۔

عشق نہ پوچھے ذات والی کہاوت دونوں پر صادق آتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نوجوانی کی منہ زور محبت بہت خاموش انداز میں آگے بڑھتی رہی۔

پھر خرم نے ایک دن راز پوچھ لیا تھا۔ اس دن وہ فارغ تھے لہٰذا ندی پر چلے آئے تھے اور دل بھر کر مزے کرنے کے بعد درختوں کے نیچے بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ ''ہاشم...... مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔ سچ بتایے گا؟'' خرم نے آلو کے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھا۔

''تو اس میرا سچا پکا یار ہے بھلا کچھ تجھ سے چھپا ہے۔'' ہاشم نے جواب دیا۔

''ہاں مگر......'' خرم کچھ ہچکچایا۔ ''تم اور جینی جس راستے پر چل رہے ہو، وہ عشق ہے، محبت ہے، پیار ہے! اور یہ جذبے کوئی برے نہیں مگر کبھی تم دونوں نے اپنے درمیان کھڑی مذہب کی دیوار کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟'' خرم نے ایک ہی سوال میں اپنی دوستی، محبت، ہمدردی سمو دی تھی۔ اسے اپنے دوست کی بھلائی بھی عزیز تھی اور اپنی ہم مذہب جینی کا بھی خیال تھا۔ ہاشم کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ یہ اس موضوع پر تو کبھی ان دونوں نے کچھ سوچا ہی نہ تھا مگر یہ ایک پر پیچ راستہ تھا۔ دشوار گزار مرحلہ، کانٹوں بھری راہ مگر دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ خرم کے احساس دلانے کے بعد ہاشم نے مختلف ملاقات کے مراحل میں جینی سے یہ مسئلہ ڈسکس کیا تھا۔ راستے کی مشکلات کا علم دونوں کو تھا مگر کم عمری اور ناتجربہ کاری نے انہیں کوئی حل مہیا نہ کیا تھا۔ ہاشم کو تو پہلی بات پر کہ وہ ایک غیر مسلم کی محبت میں گرفتار ہے کا سن کر اپنے گھر والوں کی شدت پسندانہ ردعمل کی توقع تھی مگر جینی کو بھی ایسی ہی صورت حال سے گزرنا پڑتا۔ مگر ابھی وقت ہے کہہ کر دونوں پر یکی شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دیے رہے۔

ہاشم اور خرم نے لاہور سے ایم کام کیا ساتھ ہی کمپیوٹر کورسز اور جینی نے ہوسٹل میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اب دین دنیا، معاشرہ سماج اپنے تمام تر اچھے برے رویوں کے ساتھ دونوں کے سامنے تھا۔ درحقیقت مشکل گزار لمحات تو اب آنے تھے اور گھنٹوں بحث و مباحثے کے باوجود وہ کسی ایک نتیجے پر متفق نہ ہو پائے تھے۔ کبھی جینی کوئی آئیڈیا لاتی اور ہاشم رد کر دیتا۔ کبھی ہاشم کوئی راہ سجھاتا جو جینی کو پسند نہ آتی۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب وہ دونوں ایک کیفے میں ملاقات کر رہے تھے تو اچانک ہی ہاشم نے جینی کو مسلمان

ہونے کی دعوت دے ڈالی۔ جینی چند لمحے تو شاکڈ ہی رہی پھر جب کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ ہفتہ دس، پندرہ دن دونوں طرف خاموشی سی رہی مگر ہاشم یہ تجویز پیش کر کے خود کو ایک پختہ راسخ العقیدہ مسلمان ثابت کر چکا تھا۔ اپنی دانست میں ایک غیر مسلم کو مسلمان کرنا بہت ہی ثواب کا کام جو تھا مگر اس کے بعد ہونے والی ملاقات محبت کے درمیان پہلی بار نا اتفاقی کا موجب قرار پائی۔ جینی ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی اسے بھی اپنے مذہب سے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا ہاشم کو۔ پھر کیوں وہ صرف وہ قربانی دے..... وہ بھی اپنے مذہب کی! کیا عورت ہونا قربان ہونے کا دوسرا نام ہے۔ پھر وہ کیوں مسلمان ہو ہاشم کیوں نہیں کرسچن ہو جاتا!

''ہاشم! تم نے مجھے مسلمان ہونے کی دعوت دی۔ ہم اہل کتاب ہیں مگر ہمارا دین الگ ہے۔ میں بھی اپنے عیسائی ہونے پر اتنا ہی فخر کرتی ہوں جتنا کہ تم مسلمان ہونے پر! پھر ترک دین میں کیوں کروں؟ اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو، تو تم بھی تو میری خاطر عیسائیت قبول کر سکتے ہو۔ آج میں تمہیں دعوت دیتی ہوں؟ بولو کیا تم میرے لیے یہ قربانی دے سکتے ہو؟'' جینی نے بہت صاف انداز میں بات مکمل کی اور ہاشم..... وہ تو چیخ اٹھا۔

''تم لاکھ میری محبت سہی مگر میں نعوذ باللہ..... نہیں کبھی نہیں۔'' وہ جارحانہ انداز میں چیخا تھا۔

''تو بس! اتنی ہی برداشت کی ہمت تھی ہاشم! بس یونہی عشق میں سر دھڑ کی بازی لگا لینے کی بات کرتے تھے۔'' وہ سوالیہ نشانہ بن گئی۔

''محبت، عشق اپنی جگہ مگر لادین ہونے کا مطلب جانتی ہو کیا ہے۔ ہمارے مذہب میں..... مرتد..... اسے مرتد کہتے ہیں جس کی سزا موت ہے۔ موت مجھے قبول ہے۔ ایک مومن ہوں موت حقیقت ہے آنی ہے مگر ایسی ذلت ایسی رسوائی (معاذ اللہ) میں باز آیا اس محبت سے جو مجھے میرے مذہب سے، میرے خدا سے، میرے رسول سے الگ کر دے۔''

یہ سچ تھا وہ ایک سچا راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ بچپن سے تربیت ہی ایسی ملی تھی کہ ہر کام میں اللہ اور اللہ کے رسول کی شریعت کو فوقیت دی جاتی تھی۔ سو یہ عمل وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ ''میں ہاشم رضا! اللہ کو حاضر و ناظر جان کر آج اور ابھی تم سے، اپنی محبت سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں گویا ہوا۔

''تو پھر مسٹر ہاشم! ایسے ہی کچھ خیالات میرے اپنے مذہب کے بارے میں بھی ہیں۔ لہٰذا آج سے میں خود بھی یہ ٹاپک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کلوز کرتی ہوں۔'' وہ دونوں آگے پیچھے روانہ ہوئے مگر اس طرح کہ دونوں اپنی اپنی دانست میں سرخرو ہوئے۔

اور اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی اسے قطر میں اپلائی کی جاب کا نوٹس آ گیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر قطر چلا آیا۔ دو سال کے اندر اندر اس کی دو بہنوں کی شادیاں ہو گئیں اور جگر کے مرض میں مبتلا بڑے بھائی انتقال کر گئے۔ ہاشم روبوٹ بنا کام کرتا رہا۔ کام اور عبادت۔ بس یہ دو عمل اور مزید گھریلو امور کے لیے رقم کمانا۔ اب تو اس کی ذمہ داریوں میں بڑے بھائی کے بچوں کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ مگر جب کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اپنی چاہت کو یاد کرتا تو اس کا دل جیسے رک سا جاتا۔ جینی تلخ یہ سچائی تھی اتنی ہی پکی اس کی محبت تھی۔ جو رفتہ رفتہ پیاری محبت کے درجے سے آگے، دو قدم آگے بڑھ آئی تھی۔ وہ خود کو دیوانا وار جینی کے عشق میں فنا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ عشق کی ہجر کی طویل رات اور محبوب کی خاموشی، جانا محبت اسے اندر ہی اندر توڑنے لگی تھی مگر ایک پل یا ایک پل کے ذرہ برابر ساعت کے لیے بھی خود کو کسی صورت حال میں تبدیلی مذہب کے لیے راضی نہ پاتا تھا۔ بھلا محبوب حقیقی کے آگے محبوب مجازی کی کیا حیثیت تھی۔

اور یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ جب وہ ایک ماہ کے لیے وطن لوٹا تھا۔ خرم اس سے ملنے آیا تو ساتھ ہی جینی کا پیغام بھی لایا تھا۔ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ اس کے پاس بھی ٹائم کم تھا سو وہ دونوں ملے۔ اس کی پیاسی آنکھوں میں آپ ہی آپ سکون سا بھرنے لگا تھا۔ اس کی محبت اس کے سامنے تھی۔ یہ ملاقات دو نو عمر کچی عمر کے محبوب کی ملاقات نہ تھی ایک سمجھدار میچورڈ جوڑا مل رہا تھا۔ بہت سی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جینی گویا ہوئی تھی۔

''ہاشم! تم جانتے ہو میں نے تم سے کیوں ملنا چاہا؟''

''ہاں جانتا ہوں جینی تم میرے بغیر بے چین ہو

ہوگی۔'' ہاشم نے بے تلے الفاظ میں کہا۔

''نہیں۔'' جینی نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاشم! ہماری محبت سچی ہے۔ جذبے بھی پاک ہیں مگر اس کے باوجود میں تم سے اتنی ناراض تھی کہ تم نے کس قدر لاپروائی سے مجھے مسلمان ہو جانے کو کہا گویا تم سمجھتے تھے کہ میں فوراً تمہاری دعوت قبول کرلوں گی مگر اس کے برعکس جب میں نے تم کو اپنے مذہب میں شامل ہونے کی دعوت دی تو تمہارا لہجہ غصیلا اور فیصلہ اٹل تھا۔ میں نے مہلت مانگی، دنوں سوچا سمجھا پرکھا اور ڈانواڈول رہی۔ تم نے لمحے میں میری بات سنی، منٹ میں فیصلہ کردیا۔ مجھ سے اپنی محبت سے دستبرداری کا۔ آخر ایسا کیوں کیا تم نے؟ مجھ تو تھا تمہارے انداز میں، تمہارے مذہب میں، تمہاری شریعت میں کہ تم نے پل کی پل میں بچپن کی محبت ختم کردی۔'' وہ سانس لینے کو رکی۔ ہاشم کا روم روم سوال بن گیا تھا۔ وہ جان لینا چاہتا تھا کہ آخر جینی کیا کہنے جارہی ہے۔

''ہاشم، ہمارے بچھڑنے کے بعد میں نے تمہارے جدائی تو قبول کرلی مگر تمہارا اپنے مذہب کے بارے میں اتنا شدید مظاہرہ کرنا قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر میں نے لائبریری جانا شروع کیا۔ دینی کتب کا مطالعہ، اسلامی اسلاف کے قصے، ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور چھ ماہ بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ تو سچ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل دین ہے۔'' پھر میں نے مسجد نور فاطمہ جانا شروع کیا اور پیش امام صاحب سے دینی معلومات کا خزانہ اپنے آنچل میں بھرنا شروع کیا۔ وہ ایک عالم باعمل ہیں انہوں نے میری کئی طرح کی بچی کیوں کیا کیسے کی اس خوب صورت تشریح کی کہ میری آنکھوں سے جاہلیت کے پردے سرکنے لگے۔ ان کے مشورے پر میں نے انگریزی ترجمہ قرآن باتفسیر پڑھا اور میرے اندر دین اسلام کی سچائی جنم لینے لگی۔ اب میں بہت زیادہ تو نہیں مگر بڑی حد تک دین اسلام سے متاثر ہوچکی ہوں لہٰذا اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں مگر ٹھہرو، پوری بات سنو۔'' ہاشم کے اچھل پڑنے کی کیفیت کو دیکھ کر وہ رکی نہیں۔

''میں حلقۂ اسلام میں داخل ہونا چاہتی ہوں مگر یہ میرا دل میری روح میرا خدا جانتا ہے کہ اس تبدیلی مذہب کی بنیاد تمہاری محبت نہیں تمہاری رفاقت کا حصول بھی نہیں ہے۔ میں اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے مسلمان ہونا چاہتی ہوں اور اس مرحلے میں تمہارا تعاون درکار ہے۔''

''بہت بہت مبارک ہو، جینی کہ تم حق و سچ کی تلاش میں نکلیں۔ سوچا پرکھا سمجھا اور اب عمل کرنے جارہی ہو میرا دل میری آنکھیں میرا مذہب میرا خدا سب تمہیں قبول کرتے ہیں۔''

اور دوسرے دن وہ دونوں مسجد نور فاطمہ جا پہنچے جہاں جینی نے بارضا ورغبت دین اسلام قبول کیا وہیں ہاشم نے اسے اپنا لینے کی خواہش کا اظہار بھی کیا مگر چونکہ ابھی اس کی ذمہ داریوں کو اسے پورا کرنا تھا سو اس نے جینی سے پیش امام سے، خود اپنے خدا سے اور رسول اور اپنے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ قدموں پر صحیح طور پر کھڑا ہوتے ہی وہ جینی کو اپنائے گا۔ یہ خبر اتنی بڑی تھی کہ وہ خرم سے کچھ نہ چھپا پایا تھا۔

''لیکن...... تم تو چلے جاؤ گے۔ پھر اسلام قبول کرلینے کا راز کھلتے ہی جینی کے لیے جو مشکلات کھڑی ہوں گی...... وہ اکیلی کیسے نمٹے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ بھی کرکے اس سے نکاح کرکے اسے اپنے گھر لے جاؤ۔'' خرم نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ اور جس وقت وہ اماں سے بات کرنے جارہا تھا تو ابا کے اگلے جملے نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔ حسب معمول اماں کے اندیشے تھے اور جواب میں ابا انہیں سمجھا رہے تھے۔

''تو اللہ پر بھروسہ رکھ ہاشم بڑا سمجھدار ہے۔ تو بالکل فکر نہ کر، پہلے ان تینوں بیٹوں کو اپنے اپنے گھر کا کر، پھر اس کا بندوبست بھی کردیتے ہیں۔'' اور بھلا کب انسان اپنی جڑوں سے کٹ کر رہ سکتا ہے اول آخر ایک نہ ایک دن وہ اپنے اصل کی طرف پلٹ آتا ہے۔

اور اگر نور فاطمہ اپنے فیصلے سے تائب ہوکر اپنے اصل کی طرف پلٹ گئی تو اس کا، اس کے آنے والے دنوں کا، اس کی پیدا ہونے والی نسل کا کیا مستقبل ہوگا۔ کیا دین ہوگا اور پھر جب...... ماں کی گود تو بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ وہ لاشعوری طور پر اپنے عقائد بچوں پر لاگو کرتی ہے اگر کبھی کسی کمزور لمحے کی گرفت میں شیطان کے پھیلائے جال میں آکر نور فاطمہ جینی بن گئی۔

''تو...... تو...... وہ تو وہ......''

''اس کی نسل بری طرح برباد ہوجائے گی۔''

تب اس شیطان انگیز خیال نے ہاشم کے دماغ میں جنم لیا تھا۔ شیطان صریح دشمن ہے حضرت انسان کا، اس اس نے وسوسے ہاشم کے دل میں ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ وہ سوچ سوچ کر تھک رہا تھا۔ کبھی جینی کی راہ پر خطر کا سوچ کر اس کا ساتھ دینے کا ارادہ باندھتا، کبھی اسے احساس ستانے لگتا کہ زندگی کے طویل سفر پر گر کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر لاشعوری طور پر ہی جینی اپنے اصل کی طرف چلی تو......''

''کیا بات ہے ہاشم۔'' اماں نے ناشتا دیا اور اسے متفکر دیکھ کر بولیں۔

''جی...... جی اماں۔ کچھ نہیں۔'' وہ چونکا پھر بات بنائی۔ ''بس اب کچھ دن باقی ہیں جانے میں۔ آپ سے جدا ہونے کا خیال آ رہا ہے۔'' اس نے وہیں ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور ممتا نے اسے آغوش میں چھپا لیا۔

☆......☆

ادھر جینی نے گو کہ اپنے قبول اسلام کا اظہار تو نہیں کیا تھا مگر اب اس نے اپنے آپ کو مضبوط بھی کر لیا تھا۔ دینِ اسلام کی وحدانیت نے اسے ہر خوف سے بری کر دیا تھا۔ وہ ہانگ دہل اعلانِ قبولِ اسلام کو ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر یہ ہاشم کی ہی بے جا پیش قدمی تھی کہ وہ ابھی اسے اظہار سے روک رہا تھا۔ وجہ ظاہر تھی بقول اس کے وہ مکمل محفوظ ہو جانے کے راستے ڈھونڈ رہا تھا۔ پیش امام، خرم اور خود جینی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ نکاح کر لے تاکہ اس کے جانے کے بعد اٹھ کھڑی ہونے والی صورت حال اگر خراب ہو تو ہاشم کے نام کا سہارا جینی کی حفاظت بن سکے مگر جانے کیوں ابھی بھی دل کے چاہنے کے باوجود کون سی قوت تھی کہ وہ نکاح جیسے حقیقی مقدم فیصلے پر اسے روک رہی تھی۔

اس کے جانے میں بھی دن کم تھے جب حسب معمول ملاقات میں نور فاطمہ نے اسے زور دلایا کہ اب ہم نکاح کر لیتے ہیں۔ میں اگر گھر والوں کے رویے خراب دیکھوں گی تو کسی ہوسٹل میں منتقل ہو جاؤں گی۔ میں اب کسی سے نہیں ڈرتی۔ دینِ اسلام کی زندہ سچائی نے میرے اندر کے تمام خوف ختم کر دیے ہیں۔ وہ دین ہے سمیٹ لینے والا، بے خوف کر دینے والا مگر سماج معاشرہ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ انہیں بتانے کے لیے مجھے تمہارا نام چاہیے ہم بالغ ہیں، سوچ سمجھ کر کورٹ میرج اور نکاح کر رہے ہیں۔'' نور فاطمہ نے بہت زور دیا۔

''تم میری ایک بات مانو گی؟'' اچانک ہی ہاشم نے فیصلہ کیا تھا۔

''بولو کیا چاہتے ہو تم؟'' نور فاطمہ نے بڑے نرم لہجے میں جواب دیا۔ عشقِ حقیقی کی چاہت قرب نے اور عشق مجازی کی موجودگی نے اسے بہت بہادر بنا دیا تھا۔

''میں...... میں......'' ہاشم ہچکچایا۔ چند لمحے کی خاموشی ہوئی لفظوں نے زبان پر آ کر دم توڑ دیا اگر نور فاطمہ کو یہ غلط لگا۔ تو وہ ناراض ہو جائے گی۔ دل نے گواہ کر محبت کا ہاتھ تھاما لیکن میری تشفی بھی تو ضروری ہے۔ دماغ نے توجیہہ پیش کی۔ نور فاطمہ حیران تھی خاموش تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار صرف ایک بار اپنے یسوع مسیح کے سامنے، میرا مطلب ہے......'' ہاشم کچھ دیر ٹھہر الفظوں کا سہارا لینے کے لیے۔ اپنی سوچ کو ظاہر کرنے کے لیے۔

''بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم صرف ایک مرتبہ مجھے چرچ میں لے جا کر اعتراف کرو کہ تم دل سے مسلمان ہونا چاہتی تھیں۔ اپنے یسوع کے سامنے، اپنی عبادت گاہ جہاں تمہارا ظاہر تمہارا باطن سب کچھ سچ کی صورت ہو۔ انسان سب سے جھوٹ بول سکتا ہے مگر اپنے آبائی دین، اپنی عبادت گاہ میں اپنے رب کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ انسانی جبلت ہے۔ بس میں تمہاری روح کی سچائی کا اطمینان چاہتا ہوں۔'' بالآخر بہت نپے تلے الفاظ کا سہارا لے کر ہاشم رضا نے اپنی دلی خواہش کو اس کے روبرو ظاہر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی بے یقینی اس کے لفظوں سے ظاہر ہوئی۔ ''بے اعتقادی'' اس کا کھوکھلا مردہ فلسفہ...... نور فاطمہ کتنی دیر خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی، اسے کھوجتی رہی، اس طرح کہ افسوس غم غصے کی ایک ہلکی سی بھی لکیر اس کی آنکھوں میں اتری نہ چہرے پر جب کہ ہاشم کا پہلا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ بلند بالا عمارت کی صورت کھڑی ریت کی دیوار بن گئی تھی۔ بے وقعت، بے دام، کمزور، بھربھری مٹی کی طرح۔ اس کا جسم شکست خوردہ ہو کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ اس کی روح میں فلک شگاف گڑھے بن گئے تھے۔ ہاشم کی سوچ اس کے خیالات اس کے الفاظ تیز

دھار آنے لگی کی طرح روح میں نشتر چبھو رہے تھے۔ اتنی بے دلی، عجیب ڈوب مرنے جیسی کیفیت کا شکار ہوگئی تھی وہ۔

"اول تو دین اسلام میں داخل ہوتے ہی ایک پراعتماد تحفظ عشق حقیقی کی، عشق رسول کی محبت کی صورت اسے ملی تھی۔ وہ نومسلم تھی مگر راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح اسوہ حسنہ کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اسے تو اپنی گزری زندگی ایک مہیب اندھیرا معلوم ہونے لگی تھی پھر سچے دین کا، سچے راستے پر اسوۂ رسول پر چلنے والا یہ پیدائشی مسلمان۔ جس کا عقیدہ اتنا کچا تھا، اتنا بودا، بھربھرا کہ محض اپنی زندگی کے لیے۔ اپنی تشفی و تسلی کے لیے خدا اور اس کے رسول خدا کے گھر کیے عہد کو کمزور جان رہا تھا۔ بھلا...... بھلا اس سے زیادہ بے توقیری، اس سے زیادہ بدگمانی اور کیا ہو سکتی ہے؟ دین اسلام تو بڑا انسان دوست مذہب ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے اس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ بڑے سے بڑا گناہ کر لینے کے باوجود رب تعالیٰ محض سجدے میں گر کر استغفار کرنے والے کو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کی طرح پاک صاف کر دیتا ہے۔ پھر ایک مسلمان بھلا کیسے شک کر سکتا ہے۔ دین بنیاد ہے۔ ہاشم بنیاد پر شک کر سکتا ہے تو پھر اس کی ذات کیا معنی رکھتی ہے۔

"نور......" نور فاطمہ کسی سنگی مجسمے کی طرح جامد تھی۔ پھر کچھ لمحے سرکے۔ ہاشم کی بے چینی نے خدشات کا روپ دھارا۔ "کچھ تو بولو تم۔" ہاشم نے اس کا ہاتھ تھام کر ہلایا۔ نور فاطمہ نے گہرا سانس لیا۔ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نرمی سے الگ کیا۔ خشک حلق کو تر کیا۔ اس کی بڑی بڑی سرمئیں آنکھوں میں چمکتے شراروں کے بیچ دو ننھی ننھی بوندیں نمودار ہوئیں مگر اس نے کمال ضبط سے ان آنسوؤں کو پی لیا۔ ایسے کہ اس کی روح تک چھن چھنا گئی۔ اس کی شکست خوردگی، خود اس نے، اپنے ٹوٹے دل میں چھپا لی پھر بولی اور اس طرح بولی کہ اندر کی تمام تر شکست و ریخت کے باوجود اس کا لہجہ نرم رہا۔

"بس اتنی سی خواہش ہے تمہاری۔ ہاشم......!" "میں اسے ضرور پورا کروں گی۔ چلو ابھی چلتے ہیں۔"

"تم نے برا تو نہیں منایا۔" ہاشم منمنایا۔ کچھ بھی تھا اسے احساس ہو رہا تھا یہ غلط ہے سراسر غلط، بھلا ایک مسلمان کو دیگر مذاہب سے ہو کر [illegible] کی اجازت ہی

دین میں، عقائد میں کسی بھی مسلک میں، مگر......!

شاید اس کی نظر میں یہ چینی کا امتحان تھا کہ وہ اپنے یسوع کے سامنے بھی مسلمان ہونے کا اقرار کرے۔

"نہیں، اب مجھے کسی بھی نقصان کا افسوس نہیں۔" اس نے اپنا پرس اٹھایا اور کھڑی ہوگئی۔ ہاشم نے بل پے کیا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

☆......☆

ان کا یہ سفر بالکل خاموشی میں طے ہوا تھا۔ ہاشم نے پھر کوئی بات کی نہ نور فاطمہ نے اور شاید اب کہنے سننے کو بچا بھی کیا تھا۔ ان سالوں میں پہلی بار نور فاطمہ کو احساس ہو رہا تھا کہ محبت کا یہ سفر اور ہمسفر چن کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے اور ہاشم اپنے تئیں مسرور تھا کہ اب ہر طرح کی پراعتمادی اقدامات کے بعد وہ جانتے تھے پہلے ایمان سے اپنی محبت کو شیئر کرے گا اور اسے یقین تھا کہ اس تمام تر صورت حال کو سن کر گھر والے مان جائیں گے۔ اس کی دانست میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

☆......☆

وہ لاہور کے ایک معروف ترین شاہراہ پر واقع چرچ پہنچے تھے۔ ہاشم کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے اس کا وجود ایک بھاری پتھر کی طرح ہوگیا تھا۔

"یا اللہ! میں تجھ سے معافی مانگتی ہوں۔ بھلا روشنی سے اندھیرے کا سفر بھی سود مند رہا ہے۔ وہ سراپا آنسو بنی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چرچ کی خوش رنگ راہداری عبور کرتی عین صلیب پر چڑھی یسوع مسیح کی شبیہ کے آگے آکھڑی ہوئی۔ پھر اس نے ہاشم کے بے حد قریب ہو کر بولنا شروع کیا۔

"ہاشم! میں صرف اور صرف تمہاری تسلی کے لیے یہاں آئی ہوں تم یہی چاہتے تھے تاکہ میں اپنے سابقہ خداوند کے آگے بھی اقرار کر کے تمہیں مطمئن کروں تاکہ تم اس سوچ سے چھٹکارا پاسکو کہ میں کبھی تمہاری زندگی میں داخل ہونے کے بعد کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر تمہاری نسل کو اپنے سابقہ عقائد سے بہرہ مند نہ کروں تو سن لو" قبول اسلام کے بعد کے پہلے لمحے سے میں الحمدللہ مسلمان ہوں اور تادم مرگ رہوں گی۔ یہ یقین تمہیں [illegible] جسے کہ میرے معبود برحق نے تو

محض دل سے تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھ لینے کے بعد پہلی گھڑی سے مجھے اپنے دامن میں بھر لیا ہے مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ وہ رب کریم ہے، معاف کرنے والا، بخشنے والا توفیق دینے والا، قبول کرنے والا، اور تم...... تم تو انسان ہو۔ محض اندیشوں میں گھرے، ایک کمزور انسان اب تو تمہاری تسلی ہوگئی ہے نا، چلیں۔''

واپسی میں جانے کیوں اپنی بات منوا لینے کے باوجود ہاشم رضا کا سر آپ ہی آپ جھک گیا اور نور فاطمہ سر اٹھائے علم بردار شہسوار کی طرح کھڑی تھی مگر اب کچھ یوں تھا کہ اس کی محبت، دور کہیں دور رہ گئی تھی۔ اس سے آگے بہت آگے ہاشم کی اس حرکت نے اسے اپنے مقصد حیات یعنی اسلام کی بے توجیہہ نے گرا دیا تھا۔

''میں جلد ہی اماں سے بات کرتا ہوں نور فاطمہ پھر......''

''لیکن اب مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ہاشم۔'' وہ دونوں چلتے ہوئے ایک پارک تک آگئے تھے۔ جہاں ایک سنگی بینچ پر بیٹھ کر ہاشم نے فالودہ کا گلاس اسے دیا تھا، جسے نور فاطمہ نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

''ہاں ہاں کہو! بندہ حاضر ہے۔'' ہاشم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ نور فاطمہ چند لمحے اپنے ہاتھوں کو تکتی رہی، لکیروں کو سمجھنے کی ناکام کوشش یا پھر خالی الذہن کی سی کیفیت تھی۔ وہ کچھ بھی جج نہیں کر پا رہی تھی مگر یہ بھی تھا کہ وہ ابھی حواسوں میں تھی، اس کا دماغ صحیح سمت سوچ رہا تھا۔ دین اسلام نے اسے حوصلہ بخشا تھا، امید دی تھی۔ وہ خود کو طاقت ور بھی محسوس کر رہی تھی مگر محبوب مجازی کی اس حرکت نے اسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے ایک طرف کھائی اور ایک طرف کنواں والی بات ہرگز نہیں تھی، بلکہ اب تو ہاشم کا ہاتھ تھا کہ دین محمدی کی چادر اوڑھ کر اسے اپنی زندگی گلزار بنانی تھی۔ اعلان کرنا تھا۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اور جواں مردی سے ایمان کی طاقت سے اپنے گھر والوں اپنے سابقہ مذہب والوں کی طرف سے اٹھتے مصائب کا مگر یہ کیا تھا کہ محبوب مجازی نے سفر شروع ہونے سے پہلے ہی اسے بے اعتبار کر دیا تھا۔

''تو سنو ہاشم رضا! آج ابھی اسی وقت میں تم سے تمہاری محبت سے، وحشت بیزاری کا اعلان کرتی ہوں۔ مجھے تمہاری کج فہمی پر افسوس بھی ہے اور اس حرکت پر افسوس! تم تو پیدائشی مسلمان ہوتا، پھر یہ ضعیف الاعتقادی کیوں! بھلا اللہ رب العزت سے بڑھ کر کوئی گواہ ہو سکتا ہے۔ بھلا اس محمدؐ سے زیادہ کون گواہی دے سکتا ہے جسے کافر بھی امین و صادق کہہ کر پکارتے تھے پھر بھلا اتنی روشنی، اتنی پرنور روشنی کے بعد اتنی سچی گواہی کے بعد اس عہد و قرار اس قسم کی کیا حیثیت ہے؟ یہ فعل یہ قسم لے کر تم نے مجھ سے ہی نہیں اپنے رب سے بھی بے وفائی کی ہے وہ منصف ہے، قادر مطلق ہے، میں نہیں جانتی کہ وہ تمہیں اس فعل پر معاف کرے گا یا نہیں مگر اب ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے میں تمہیں اس کج روی پر معاف نہیں کر سکتی۔ آج سے ہمارے راستے الگ الگ ہیں۔ میں دین اسلام کی راہ میں آنے والی ہر مشکل کا سامنا خود کر لوں گی۔ مجھے اب تم جیسے کمزور عقیدہ انسان کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنی خواہش بیان کرنے کے پہلے لفظ ادا کرتے ہی تم میری نگاہوں سے گر گئے تھے۔ میری محبت ہوا ہوگئی تھی۔ بھلا ایک حقیقی محبت کا دعویٰ کرنے والے محبوب مجازی نے محض اپنی انا، اپنی سوچ، اپنی تسلی کی خاطر اپنے رب کو بھلا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنا محاسبہ کرنے سے تمہیں خود اپنی ذات گناہ گار نظر آئے گی خدارا! استغفار کرو معافی مانگو اپنے رب سے کفارہ ادا کرو۔ یہ آخری ملاقات ہے ہماری۔ آج میں نے تمہیں تمہارے گناہ پر معاف کیا۔ بھلا تم میری...... میری عصمت کی، میرے جذبوں کی، میری ذات کی کیا حفاظت کرو گے۔ میں دعا گو ہوں گی تمہارے لیے مگر اب محبوب مجازی کی اس کم فہمی نے مجھے اور محبوب حقیقی کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ میں اسی سے رجوع کروں گی۔ اللہ حافظ و ناظر۔'' نور فاطمہ نے آنسوؤں بھری آواز میں بات ختم کی۔

''نور...... نور...... رکو میری بات سنو۔ میں نادم ہوں شرمندہ ہوں۔ تم نے مجھے لفظوں سے جو آئینہ دکھایا ہے اس میں میری ذات عیب ناک ہے۔ غلیظ ہے۔ یا اللہ میں نے کتنا بڑا گناہ کر دیا۔ گناہ صغیرہ میں اپنے رب سے رو رو کر استغفار کروں گا۔ آخر...... آخر میں نے خدا کے وجود کو نعوذ باللہ جھٹلایا ہے۔ مجھے میرا مالک جو سزا دے منظور مگر اس سفر میں میرا ساتھ نہ چھوڑو، مجھے سنبھالنے کے بعد تنہا نہ چھوڑو۔

اس کے بعد نور فاطمہ ملی نہ ہی ہاشم رضا میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ اس باکردار مسلم عورت سے ملتا۔ زندگی یکدم سے تپتا صحرا بن گئی اور وہ ندامت کا بوجھ ڈھوتا آبلہ پا تنہا روسیاہ مسافر...... ایسی بے قراری تھی، ایسی بے چینی وجود میں بھر گئی تھی کہ سوائے استغفار اسے کچھ یاد نہ رہتا تھا کہ ماں باپ، گھر، وطن، نور فاطمہ سب ایک ہی دعا میں ڈھل گئے، تسبیح بن گئے، استغفار کی اور پھر زمانے نے دیکھا کہ اس نے جان توڑ محنت کی آگے آگے نکلنے کی یونہی محنت شاقہ کرتا وہ اٹلی جا پہنچا۔ یکے بعد دیگرے تمام مسائل کو حل کرتا رہا مگر پلٹ کر پاکستان آیا نہ ہی آنے کا سوچا۔ جانے قدرت نے یہ اس پر کرم کیا تھا یا رحم کہ وہ نور فاطمہ سمیت ہر قصے کو بھلا چکا تھا اور اب عرصہ 22 سال بعد آج اس مسجد کو دیکھ کر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اپنی گم گشتہ محبت، اپنے کرتوت، شاید اب تک خدا نے اس کی رسی ڈھیلی کی ہوئی تھی جو اب شاید کھینچی جانے والی تھی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے نرم پھوار جیسے پانی کی چھینٹیں منہ پر لگنے سے اسے ہوش آیا تھا۔ عصر کا وقت ہونے کے سبب نمازی مسجد پہنچے تھے اور ایک انجان شخص کو مسجد کی سیڑھیوں پر بے ہوش پا کر اسے ہوش میں لا رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟" مسلم سوالات تھے۔ اس نے سب کو جواب دیے پھر ان کے ساتھ ہی باجماعت نماز ادا کی اور ذکر میں مشغول ہو گیا۔ یہی جگہ تھی، منبر کے سیدھے ہاتھ پر چھوٹی سی چوکی کے پیچھے بیٹھے پیش امام نور الہی نے اسے مسلمان کیا تھا۔ اسی جگہ دو قدم کے فاصلے پر تھا وہ جہاں اس نے اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر نور فاطمہ کو اپنی زوجیت میں لینے کا وعدہ کیا تھا۔ تزئین و آرائش بدل چکی تھی۔ مسجد وسیع ہو چکی تھی۔ نور الہی صاحب کی جگہ کسی دوسرے پیش امام نے لے لی تھی مگر اب بھی اس کی بند آنکھوں کے پیچھے وہی تصویر تھی وہ بت ٹوٹے وجود کے ساتھ مسجد سے نکلا۔

خرم کو تلاش کرنے میں اسے کچھ وقت ہوئی مگر آخرکار وہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ہاشم کو گلے سے لگا کر بھی خرم کو یقین نہ آ رہا تھا۔

"تم کہاں غائب ہو گئے تھے میرے دوست۔" پھر اس کے پوچھنے پر خرم نے [illegible]

جوڑا جسے وہ ادھورا چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔

جینی کے قبول اسلام کی خبر صرف اس کے گھر پر ہی نہیں بلکہ تمام اہلیان بستی پر ایک شاک کی صورت اتری تھی۔ برادری کے بڑے سرپنچ تو اس کے مارنے کو ثواب قرار دے رہے تھے۔ بڑی بوڑھی عورتوں نے اسے اپنی پناہ میں لے کر اس پر زور ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنی نا سمجھی کا جواز بنا کر ترک اسلام کر دے اور پھر سے عیسائیت میں داخل ہو جائے۔ مقدس بائبل پر ہاتھ رکھ کر اپنی نادانی تسلیم کر لے۔ چرچ جا کر فادر کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کی غلطی تسلیم کر لے تاکہ وہ چرچ اور فادر کی پناہ میں آ جائے، پھر یسوع مسیح خود اس کی حفاظت کریں گے۔ مگر! مگر جینی کو مرنا قبول تھا مگر یہ سب قبول نہیں تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کرتی میں مر جاؤں گی مگر دین اسلام کو نہیں چھوڑوں گی۔ اپنے مذہب کی خاطر یسوع بھی صلیب پر زندہ چڑھائے گئے تھے۔ اب اگر میں اسلام کی راہ میں بھی ماری جاؤں تو کیا برا ہے۔ پہلے اس کا دانہ پانی بند کر کے قید میں رکھا گیا پھر اس کے اہل خانہ کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انہیں اپنے گھر سے اپنی بستی سے نکلنا پڑا۔ سماجی رابطے توڑ دیے گئے۔ باپ نے شرمندگی سے بچنے کے لیے اسے خوب مارا پھر پیٹا اور نہر میں کود گیا۔ اس کے اپنے بھائی بھاوج بستی والوں کے ساتھ مل کر اس کی جان کے درپے تھے۔ دونوں بڑی بہنوں کو طلاق کی دھمکی دے کر گھر سے نکال دیا گیا تھا اور وہ روتے بلکتے بچوں کو سامنے لا کر نور فاطمہ کو مجبور کرتیں کہ وہ...... دوبارہ عیسائی ہو کر رہبانیت اختیار کر لے تاکہ راہبہ بننے کے بعد اس کی جان بخشی جائے اور وہ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں اپنے شوہروں کے پاس مگر...... وہ نور تھی۔ ہر ہر درخواست کے بعد بہت رسان سے دعوت اسلام دیتی۔

"نہیں کوئی معبود سوائے اللہ اور آپ اللہ کے رسول ہیں" کوئی جانتا تھا کہ وہ قتل کر دی جائے گی ہاشم کی محبت میں، اسلام کی محبت میں جو قربانی وہ دے رہی تھی تم تو اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔ پھر اس کی زندگی بچانے کے خاطر ایک رات ماں بہنوں نے اسے بہت مشکل سے بستی سے نکالا۔ وہ پیش امام صاحب کی پناہ میں چلی آئی۔ جہاں [illegible] اسے حجرہ دیا

گیا۔ یہاں وہ محفوظ تھی۔ اہلِ بستی اب بھی اس کے خون کے پیاسے تھے اور کئی مرتبہ مختلف طریقوں سے اسے جان سے مارنے کی کوشش کی گئی مگر ایک نامعلوم قوت تھی کہ ہر بار وہ زخمی ہونے کے باوجود بچ جاتی اور پھر سے زندگی کی طرف لوٹ آتی۔ پیش امام صاحب نے اسے پوری تعلیم و تربیت دی پھر درسِ قرآن کے لیے آنے والے بچوں کو اسی کی طرف منتقل کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ دنیا سے مکمل طور پر کٹ کر دینِ الٰہی میں مشغول ہو گئی۔ نماز قرآن فقہ درس اسلامی کتب بچوں کو دین کی سوجھ بوجھ سکھاتا وہ چلتا پھرتا مکتب بن گئی۔ اسے صبح ایک وقت کھانے اور تین کپڑوں کے علاوہ کوئی حاجت نہ رہی تھی اور یہ ذمہ داری پیش امام صاحب بخوبی پوری کر رہے تھے اور کمال اصل کمال تو یہ ہے کہ ہاشم پوری زندگی کئی کمزور لمحے آنے پر بھی اس نے اپنے لبوں پر تمہارا نام نہ آنے دیا۔ تاکہ تم بدنام نہ ہو جاؤ۔'' پاسِ وفا اور پاسِ شریعت میں اس نے اپنی ذات کو اس حد تک بھلا دیا کہ اسے خود اپنا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ مسلسل ذکر اللہ اور مشغول اذکار نے دل ذہن اور روح کی پاکیزگی نے اسے اللہ کی نیک بندی کا مرتبہ عطا کر دیا تھا۔ اس کی زبان میں سچ اترتا تھا۔ یہ ایک معجزہ ہی تو تھا کہ نومسلم کی حد درجہ عبادت رضا عیت سے استقامت و بست سلوک نے اس پر اپنے کرم کی بارش کر دی تھی۔ اس کا ظاہر باطن شفاف ہو گیا۔ ہر جا، ہر سو اللہ ہی اللہ تھا۔ جبھی تو وہ جو کہہ دیتی وہ قدرت عطا کر دیتی۔ یہ رب کی شان، اس کی عطا ٹھہری۔ قمر بھائی کی بچی مرتے دم اس کے پاس لے جائی گئی۔ نور فاطمہ نے اسے دیکھا اور پھر کچھ پڑھا پھونکا پھر سفر کا اشارہ دیا۔ ''اللہ ستر گناہ زیادہ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے اس کی ماں کو خوش خبری دو۔'' پھر زمانے نے دیکھا عرصہ دو ماہ بعد وہی بچی ناظرہ کی تعلیم لینے نور فاطمہ کے پاس پہنچی تھی۔ اب وہ نور فاطمہ سے نور اماں، حاجن اماں، اللہ والی اماں کہلانے لگی اور اسے یہ لقب دینے والے وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے مسائل لے کر اس تک آتے تھے اور وہ انہیں قرآن کے ذریعے راہِ نجات بتاتی تھی۔ کئی مرتبہ اس کے کہے مبہم جملوں نے سچ کا لبادہ اوڑھا لہٰذا اب اس کی شہرت دور دور پہنچ گئی تھی۔ وہ اللہ کی نظر میں محبوب ہو گئی تھی لہٰذا جو کہہ دیتی وہ پورا ہو جاتا۔

''رفتہ رفتہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ جینی پارکنیز اللہ کی چہیتی مقرب بندی بن کر نور روشنی پھیلا رہی تھی۔ یہ سلسلہ کم و بیش 20 سال چلا اور اب سے 2 سال پہلے ایک رات تہجد ادا کرتے ہوئے وہ خالقِ حقیقی سے جا ملی اس طرح کہ اس کا مشکبار جسدِ خاکی پھولوں کی طرح مہک رہا تھا، سانس رک چکی تھی مگر ایک نادیدہ آواز اسی طرح اذکار میں ذکر کرتی رہی تھی اس کی خواہش پر اسے اسی حجرے میں دفنایا گیا ہے۔ آؤ تم بھی چل کر زیارت کر لو۔''

ہاشم خرم کی سنگیت میں کسی گناہ گار کی طرح، کسی مجرم کی طرح لرزیدہ قدموں سے اس نیم کے گھنے درخت تلے پہنچا تھا۔ جس کے گھنیرے سائے اہلِ مزار کو ٹھنڈی چھاؤں دے رہے تھے۔ سادہ سی کچی قبر جس کے سرہانے لگے لکڑی کا سال خوردہ کتبہ جس پر خوب صورت الفاظ میں بندی ناچیز نور فاطمہ کندہ تھا، خاک میں گل و گلزار سو رہا تھا۔ ہاشم نے کچی قبر پر ہاتھ پھیرا اس کی آنکھوں میں امڈتے آنسو مٹی کو گیلا کرنے لگے تو کتبے پر مزید تحریر تھا۔

''اللہ میری عبادت کو قبول کرے، میں ناچیز کفر کے اندھیروں میں بھٹکنے والی، جینی پارکنیز جیسے عشقِ مجازی کے سفر سے عشقِ حقیقی کا راستہ مل گیا تھا۔ اس نور سے روشنی نے مجھے میرے منصب تک پہنچا دیا۔ مجھے نور فاطمہ بنا دیا۔''

ہاشم کسی بچے کی طرح بلک بلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایک منظر اجاگر ہو رہا تھا۔ ندامت، پشیمانی، گمراہی، ناعاقبت اندیشی کسی کوڑے کی طرح اس کی روح پر لگ رہے تھے۔ اس کی رسی کھینچی جا چکی تھی، جبھی تو اس کے ہوش حواس جاتے رہے تھے۔ وہ جنون میں مبتلا ہو گیا تھا، خرد غالب آ گیا تھا۔ جبھی تو اب وہ زمانے سے، گھر بیوی بچوں سے، حتیٰ کہ خود سے بھی بیگانہ ہو گیا تھا۔ رونا اور گڑگڑانا معافی طلب کرنا اسے یاد رہا تھا۔ گویا زمانے کی نظر میں وہ پاگل ٹھہرا تھا مگر یہی دیوانگی تھی کہ جو اسے احساس دلاتی تھی کہ اس نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا۔ شرک کا اور یہ ایسا قبیح فعل ہے جس کی معافی نہیں۔ اب آخری سانس آنے تک وہ دیوانگی میں فرزانگی کی باتیں کرتا ہے۔

''بے شک شرک کی کوئی معافی نہیں۔'' اور اس فرزانگی میں کچی قبر...... کو نہیں بھولتا اسے اسی احترام سے صاف کرتا ہے جیسے وہ اس کے مرشد کی قبر ہو۔

☆☆☆

چوتھی داستانِ عشق

انا اور امید

وقاص حسین

محبت میں انا اور ضد کے قیدی ایک نوجوان کی عشق فرمائی......

""میری بات کا کسی پر اثر نہیں ہوتا۔ میں نے کتنی بار بکواس کی ہے کہ میرے کمرے میں کوئی نہ آئے لیکن اثر ہو تو تب ناں۔" واصف چلایا تھا۔
جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا اور پھر ساتھ



ہی کھٹک کھٹک کی آواز آنے لگی تھی جیسے وہ کمرے میں رکھی ہر چیز کو اِدھر سے اُدھر پھینک رہا ہو۔

ذاکیہ بیگم نے بے ساختہ چاول صاف کرتی عائشہ کی طرف دیکھا تھا جو پہلے سے ہی ذاکیہ بیگم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملنے پر دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا گئی تھیں۔ عائشہ پھر سے چاول صاف کرنے لگی تھی اور ذاکیہ بیگم پیاز کاٹنے لگی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کمرے سے آتی آوازیں تھم گئی تھیں اور عائشہ نے تصور میں کمرے کی حالت دیکھ لی تھی۔

''میں تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دو لیکن تم ہو کہ ہمیشہ اپنی ہی مرضی کرتی ہو...... تم کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ تم پتھر کے ساتھ سر پھوڑ رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے پتھر بھی موم نہیں ہوتے۔ بس کرو بیٹی ایک بے نام و نشان منزل کے پیچھے بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے دکھوں کے۔'' ذاکیہ بیگم نے دکھی اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

گفتگو کرتے وقت انہوں نے ایک بار بھی عائشہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ عائشہ کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور چاولوں میں جذب ہو گئے تھے۔ عائشہ بغیر کچھ بولے چاول لے کر وہاں سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ عائشہ نے اپنا دکھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کے اندر کتنی ٹوٹ پھوٹ چل رہی تھی۔ عائشہ نے چاول سنک میں رکھ کر نلکا کھول دیا تھا اور خود اپنے اندر کے زخم سینے لگی تھی۔ خالہ مجھے بھی پتا ہے پتھر موم نہیں ہوتے اور میں موم کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہی۔ میں تو پانی کے قطرے گرا رہی ہوں کہ ایک دن اس میں سوراخ ضرور ہو جائیں گے میں تو بس ان سوراخوں کے انتظار میں ہوں اور خالہ میں منزل کے پیچھے کہاں بھاگ رہی ہوں میں تو بس کھڑی ہوں اس انتظار میں کہ منزل خود تھک ہار کے مسافر کے پاس آئے گی۔

''عائشہ بیٹی! چاول دھو لیے تو یہ باقی کا سامان بھی لے جاؤ۔'' ذاکیہ بیگم کی آواز نے عائشہ کو خیالوں سے نکالا تھا۔ عائشہ نے گالوں پر بنی آنسوؤں کی لکیروں کو صاف کیا تھا اور پھر جلدی سے نلکا بند کیا کیونکہ چاول نیچے سنک میں بکھر رہے تھے۔

''آئی خالہ۔'' عائشہ نے اپنی آواز کو ہشاش بشاش بناتے ہوئے آواز دی اور باقی کا سامان لینے کے لیے کچن سے نکل آئی۔

☆......☆

''پتا نہیں کب عقل آئے گی اس کو اور پتا نہیں آتی بھی ہے کہ نہیں۔'' عائشہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی کمرے کی حالت دیکھ کر بڑبڑائی تھی۔ عائشہ نے ایک طرف سے پورے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ کمرہ مکمل طور پر کباڑ خانے میں بدل چکا تھا۔ عائشہ نے کھانے کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور نیچے گری کتابیں اٹھا اٹھا کر واپس ریک میں رکھنے لگی۔

باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ واصف شاور لے رہا ہے۔ عائشہ ایک طرف سے شروع ہو گئی تھی اور ایک ایک کر کے ہر چیز کو اس کی جگہ پر واپس رکھنے لگی تھی۔ یہ سب کوئی پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ ہفتے میں کم از کم تین چار بار تو کمرے کی ایسی حالت ہوتی تھی۔ اب تو عائشہ اس کی عادی ہو چکی تھی اب تو اس کو محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔

شاور بند ہو گیا تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد باتھ کا دروازہ کھلا اور واصف بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر نکلا تھا۔ اس کی پہلی نظر ڈریسنگ پر پڑی تھی جہاں ہر چیز بڑے سلیقے سے پڑی ہوئی تھی۔ واصف کی نظر بڑی تیزی سے کمرے میں گھومی تھی اور پھر ایک کونے میں جا کر رک گئی تھی۔ جہاں عائشہ بڑے اطمینان کے ساتھ کتابیں سیٹ کر رہی تھی۔ واصف کے تیور اسی پل بدل گئے جہاں کچھ لمحے ہلکی سی مسکراہٹ تھی اب وہاں سخت غصہ آ چکا تھا۔ واصف تیزی سے عائشہ کی طرف بڑھا تھا اور پھر بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا۔

''تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ تم کو میری بات کا اثر نہیں ہوتا۔ تم آخر ثابت کیا کرنا چاہتی ہو۔'' واصف پوری قوت سے چیخا تھا۔

لیکن دوسری طرف اطمینان ہی اطمینان تھا وہاں چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ وہاں پر سے ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی جیسے سامنے والے نے غصہ نہیں محبت بھری کوئی بات کی ہو۔ عائشہ بس واصف کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ آس پاس سے لاتعلق ہو کر۔ واصف زیادہ دیر اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا تھا اور دھکا دیتے ہوئے بولا۔

''نکل جاؤ میرے کمرے سے اور اتنے دن کروں گی یہ

ڈرامے آخر تھک جاؤ گی ایک دن لیکن تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا سمجھیں تم۔'' واصف نے چیختے ہوئے کہا۔

''مسافروں سے ضد نہ لگاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مسافر ضد میں آجائے اور پھر منزل کو خود چل کر آنا پڑے۔'' اتنی دیر میں عائشہ پہلی بار بولی تھی اور پھر کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆......☆

''اب یہ یہاں کر کیا رہی ہے۔ یہ جاتی کیوں نہیں واپس۔ اب میں اس کو اور برداشت نہیں کر سکتا۔'' واصف کا لہجہ سخت اور غصے سے بھرا تھا۔

''وہ آج آتی ہے واپس ڈیوٹی سے تو آپ خود اس سے بات کرلیں ورنہ میں خود کرلوں گا۔ اس کا اور یہاں رہنے کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔ تعلیم پوری ہوگئی ایک سال ہوگیا پریکٹس بھی سال بھر کی کرلی ہے اور اگر وہ کسی اور مقصد کے تحت رکی ہوئی ہے تو اسے کہیں کہ چلی جائے یہاں سے ویسا مرتے دم تک نہیں ہوگا۔ بہت ہوگئے ڈرامے بہت کرلیا برداشت اور نہیں ہوگا۔ اس کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ واپس چلی جائے۔'' واصف غصے سے چیخ رہا تھا اور ذکیہ بیگم اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور پھر وہ بولی تھیں۔ ''بیٹے تم ایسے تو کبھی نہ تھے تم کو کیا ہوگیا ہے اور کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے اور دوسرا کسی سے اتنی نفرت نہیں کرتے کہ کل اپنے اس رویے پر شرمندہ ہونا پڑے۔ اور پھر میں بھی اس کے دم سے تو جی رہی ہوں۔ تیرا تو پتا ہی نہیں تو کب آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو میں اکیلی رہ رہ کر پاگل ہو چکی ہوتی۔ کھانا پینا، دھونا سب کچھ تو اس نے سنبھال رکھا ہے۔ تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی تمہاری ماں کب بیمار ہوتی ہے کب ٹھیک ہوتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں اگر وہ نہ ہوتی تو میں کب کا مرگئی ہوتی۔'' ذکیہ بیگم ہر طرح سے عائشہ کے حق میں کھڑی تھیں۔

''ہاں تو میں نے نوکر رکھ تو دیے تھے لیکن آپ نے دوسرے ہی دن ان کی چھٹی کروادی تو اس میں میرا کیا قصور ہے اور دوسرا مجھے خوشی سے جی لینے دیا کریں۔'' ''اب جو بھی بات کرنی ہے مجھ سے کرو اور مجھ سے نظریں ملا کر کرو جو زہر کے نشتر چلانے ابھی چلاؤ تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔''

عائشہ نے منہ [illegible] واصف کو [illegible]

طرف کیا تھا۔ لیکن واصف خاموش کھڑا رہا سر جھکائے۔

عائشہ ہلکے سے ہنسی اور پھر بولی تھی۔

''تم میرے ساتھ نظریں ملا کر کیا بات کرو گے تم تو خود اپنے ساتھ نظریں ملانے کے قابل نہیں ہو۔ خالہ نے سچ کہا تھا کہ پتھر بھی موم نہیں ہوتے لیکن میں پاگل تھی جو یہ سوچ رہی تھی عشق ہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ عاشی کی سوچیں چھوٹی نکلی عاشی تو پاگل تھی جو ایسا سوچتی تھی۔ اور ہاں میں جا رہی ہوں آج اور ابھی یہاں سے اور یہ مت سوچنا کہ میں ٹوٹ گئی ہوں نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی ہوں۔ انسان جسم پر تو چوٹ برداشت کرسکتا ہے لیکن روح پر لگی ہلکی سی چوٹ بھی برداشت نہیں ہوتی اور تم نے تو میری روح کو تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔''

عائشہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ واصف کے ذہن پر عائشہ کا ایک ایک لفظ ہتھوڑے بن کر برس رہا تھا اور پرانی یادوں نے ایک بار پھر آن گھیرا تھا۔

''عائشہ رک جاؤ بیٹی تم کو تو اس کی عادت کا پتا ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ زہریلی باتیں کر چکا ہے تو پھر تمہیں آج کیا ہوگیا ہے۔ کتنی بار تمہیں اس نے اپنے کمرے سے دھکے دے کر نکالا اور کتنی بار تمہارا کھانا اٹھا کر باہر پھینکا۔ ان کے مقابلے میں تو آج اس نے کچھ بھی نہیں کیا پھر کیوں۔''

''خالہ پیاسے کو اب چاہت نہیں رہی اپنی پیاس بجھانے کی اب اگر کنویں کو چاہیے ہے تو وہ خود چل کر آجائے۔'' عائشہ نے کہا اور سامان اٹھا کر بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی اور ذکیہ بیگم جہاں تھیں وہاں ہی کھڑی عائشہ کو جاتے دیکھتے رہیں۔

☆......☆

''تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اور وہ بھی تم سے شادی کروں گی۔ اپنی اوقات دیکھی ہے تم نے... تم کہاں اور میں کہاں...... تمہارے پاس ہے کیا جو تم نے ایسا سوچ بھی لیا۔ اور جتنا خرچ تمہارے پورے گھر کا مہینے بھر کا ہے اتنا میرے ایک ہفتے کا خرچ ہے۔'' آمنہ نے حقارت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''عاشی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے تمہاری محبت کو چاہا ہے۔''

''مگر پیسے سے جیتے ہیں محبت سے نہیں۔ محبت کی [illegible] تمہاری ذہن

لوگوں کے کپڑے سی سی کر چار پیسے کماتی ہے اور جس گھر میں تم لوگ رہ رہے ہو وہ بھی رشتے داروں کی مہربانی سے ہے۔" آمنہ کا لہجہ نہیں بدلا تھا۔ ویسا ہی ہتک آمیز تھا۔

"اور وہ وعدے ان کا کیا۔" واصف بولا تھا۔

"مجھے تم سے کبھی محبت نہیں تھی وہ میرا بچپنا اور ٹائم پاس تھا سب۔"

"عامی! ایسا تو نہ کہو......" یہ الفاظ سن کر واصف کے دل کو کچھ ہوا تھا اور وہ پکار اٹھا تھا۔

"سب تمہاری اپنی غلطی تھی جو تم نے میری سنگت کے خواب دیکھے۔ تمہیں اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے تھی۔ تم کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ تمہارا اور ہمارا اسٹیٹس کیا ہے۔ قصور تمہارا اپنا ہے مجھے یوں بلیم دے رہے ہو اور زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے، نکل جاؤ ہمارے گھر سے اور دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آمنہ نے غصے سے کہا تھا۔

واصف ابھی بھی بے یقینی سے آمنہ کی طرف دیکھ رہا تھا اسی وقت دروازہ کھلا تھا اور عائشہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"عاشی دیکھو عامی کیا بول رہی ہے۔ کہتی ہے اسے مجھ سے محبت نہیں ہے وہ سب ٹائم پاس تھا۔" واصف کے لہجے میں بے یقینی اور بے چینی تھی۔ عائشہ کچھ بولی نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"عاشی دیکھو نا.... عاشی یہ جھوٹ بول رہی ہے نا۔ یہ مذاق کر رہی ہے نا میرے ساتھ۔" واصف کے لہجے کی بے یقینی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

عائشہ نے بے چارگی سے واصف کی طرف دیکھا تھا اور بنا کچھ بولے کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆.....☆

واصف کے والد کی بے وقت موت نے واصف کی آنے والی زندگی بدل دی تھی۔ واصف دو سال کا تھا۔ جب اس کے والد کی ڈیتھ ہوئی پرائیوٹ جاب ہونے کی وجہ سے کچھ آسرا نہ رہا تھا۔ ساس سسر پہلے ہی نہ تھے اور نہ ہی کوئی اور آسرا بننے کو تیار تھا نہ کوئی واصف کا تایا، چچا اور نہ ہی ماموں میں سے کوئی مستقل سہارا دینے کو تیار، ہر کوئی نظریں چرا رہا تھا۔ واصف کی والدہ پر بڑا مشکل وقت تھا لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا تھا ان کے پاس سلائی کا ہنر تھا سو ان نے وہی کام شروع کر دیا اور ویسے بھی ان کو دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنا گوارا نہ تھا۔ ہاتھوں میں صفائی تھی ان لیے ان کو بوتیک کے کپڑے سلائی کے لیے ملنے لگے تھے جس سے ان کا گزر بسر ہونے لگا اور پھر سب رشتے داروں نے اپنے اپنے سروں سے مصیبت ٹالنے کے لیے مل کر ایک تین مرلے کا گھر لے دیا جس سے چھت کا آسرا بھی ہو گیا۔

واصف کی والدہ اتنا کما لیتی تھیں کہ وہ گھر کا خرچ سکون سے چلا سکیں اور پھر جب واصف پڑھنے کے لائق ہوا تو اس کو قریبی اسکول میں داخل کروا دیا اور ساتھ ہی اپنا تھوڑا سا کام بھی بڑھا لیا جس سے واصف کے اسکول کی فیس اور دوسرا خرچہ نکل جاتا۔ واصف کے سارے رشتے دار اسی شہر میں رہتے تھے لیکن کوئی بھی زیادہ ملنے نہیں آتا تھا۔ سوائے واصف کی خالہ کے جو کبھی خود آ جاتیں تو کبھی واصف کی والدہ چھٹی والے دن اس کو لے کر ان کے گھر چلی جاتی۔ واصف کے خالو ملک سے باہر ہوتے تھے۔ گھر میں صرف خالہ اور ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ باقی رشتے دار سال میں ایک آدھ بار چکر لگا جاتے تھے اور اگر کوئی پیسے دینے کی کوشش کرتا تو والدہ بڑے سلیقے سے منع کر دیتیں۔

واصف نے جب ہوش سنبھالا تھا تو بس اس کو ایک ہی رشتہ ملا تھا جو کہ خالہ کا تھا جو اس سے محبت سے پیش آتی تھیں اور کزنوں میں بس خالہ کی دو بیٹیاں تھیں جو اس کی بڑی جلدی اچھی دوست بن گئی تھیں اور پھر دوستی کب محبت میں بدلی اس کو خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ واصف کی ویران زندگی میں ایک دم سے بہار آ گئی تھی اور پھر جس دن واصف نے آمنہ کے منہ سے اقرار سنا اس کو لگا کہ وہ آسمانوں میں اڑ رہا ہے اور وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہے۔ اب بس اس کو اتوار کے دن کا انتظار ہوتا تھا کہ کب چھٹی ہو اور وہ کب اڑ کر آمنہ کے گھر پہنچ جائے۔ عائشہ اس کی سب سے اچھی دوست تھی۔ وہ اپنی ہر بات اس کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔ آمنہ کی پسند ناپسند وہ عائشہ سے پوچھتا تھا اور اپنی پاکٹ منی بچا کر ہر ہفتے آمنہ کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آتا تھا۔

عائشہ کب واصف سے محبت کرنے لگی اس کی خبر عائشہ کو خود بھی نہ ہوئی۔ دوستی کب محبت میں بدلی اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اب اتنا انتظار آمنہ کو واصف کے آنے کا نہیں ہوتا تھا جتنا عائشہ کو ہوتا تھا۔ عائشہ محبت میں اس قدر آگے جا چکی تھی کہ وہ چاہ کر بھی واصف کو اپنے دل

سے نہیں نکال سکتی تھی۔ عائشہ اچھے سے جانتی تھی کہ واصف اس کی منزل نہیں بن سکتا لیکن پھر بھی وہ اس سے خاموش محبت کیے جا رہی تھی۔

☆......☆

وقت پر لگا کر اڑ گیا تھا۔ واصف اور آمنہ کالج میں آ گئے تھے لیکن واصف کی روٹین اب بھی نہیں بدلی تھی۔ اب بھی وہ چھٹی والے دن اپنی خالہ کے گھر جاتا تھا۔ عائشہ کی محبت پہلے سے زیادہ گہری ہو گئی تھی جب کہ آمنہ کی محبت میں سرد پن آ گیا تھا پہلے والا والہانہ پن اب نہیں رہا تھا۔ اگر واصف اس کا گلہ کرتا تو آمنہ کہتی پڑھائی کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ اسی وجہ سے تم کو ٹائم نہیں دے پا رہی۔ واصف ان سب کی شکایت عائشہ سے کرتا۔ عائشہ سے دوستی آج بھی روز اول کی طرح تھی بلکہ پہلے سے مضبوط ہو گئی تھی۔

عائشہ محبت کی منزلیں طے کرتے ہوئے عشق کے مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں اپنانے کی چاہ نہیں رہی تھی۔ بلکہ محبوب کی خوشی اس کی اول ترجیح بن چکی تھی۔ عائشہ نے واصف کو دل کے سب سے اونچے مقام پر بٹھا دیا تھا اور خود سب سے نیچے آن بیٹھی تھی جیسے واصف کوئی آقا ہو اور وہ اس کی باندی۔

واصف نے بہت کوشش کی تھی کہ اب وہ پڑھائی کے ساتھ جاب بھی اسٹارٹ کر دے لیکن واصف کی والدہ نے اس کو ایسا نہیں کرنے دیا تھا بلکہ سختی سے روک دیا تھا کہ تم صرف اور صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دو اور پھر واصف کو اپنی ماں کے حکم پر سر جھکانا پڑا۔

اور پھر ایک دن اس نے غور کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں پچھلے کچھ دنوں سے کچھ زیادہ ہی محنت کرنے لگی ہے۔ کام کی تو ان کے پاس پہلے بھی کمی نہ تھی لیکن وہ کام بس اپنی ضرورت کے لیے کرتی تھیں جتنی ان کو ضرورت ہوتی اور پھر جب اس نے اتنی محنت کی وجہ پوچھی تو اس کو جو جواب ملا اس نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک بے یقینی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتا رہا کہ والدہ کہیں کہ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ واصف پر تو جیسے بجلی گری تھی اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے گئی تھی اور وہ خالی نظروں سے اپنی والدہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب کہ اس کی والدہ سر جھکائے سلائی کرنے میں مصروف تھیں۔ والدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر جا رہے تھے

جذبے ہو گئے تھے ان کو واصف نہیں دیکھ سکا تھا۔ واصف کی والدہ اپنے بیٹے کی کیفیت سے اچھے سے واقف تھی اس لیے اس نے سر اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

آمنہ کا رشتہ پکا ہو گیا تھا اس کی اپنی پسند سے تایا کے بیٹے کے ساتھ اور اب دو مہینے بعد اس کی شادی تھی اور اس بات کی خبر اس کو کانوں کان نہیں ہوئی تھی۔ ان کے منہ سے سنے الفاظوں پر واصف کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا اور پھر واصف اپنی بے یقینی ختم کرنے کے لیے آمنہ کے روبرو کھڑا تھا اور پھر اس کا بکھرا ایک دم سے اس طرح ٹوٹا تھا کہ اس سے ایسی امید نہ تھی۔ آمنہ نے اس کو ذلیل کر کے گھر سے نکالا تھا اس کو اس کی اوقات یاد کروائی تھی۔ واصف ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ ہوا ہے۔ اس کے جذبوں کے ساتھ تو بس کھیلا جا رہا تھا۔

واصف گھر آ کر خوب رو رہا تھا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ واصف کی والدہ تنگ پریشان تھی کہ کہیں وہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے اپنے ساتھ کچھ کر ہی نہ بیٹھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ واصف تیسرے دن کمرے سے نکلا تھا اور اب اس کی محبت نفرت میں بدل چکی تھی اور اس کو لفظ محبت سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔

اور پھر جیسے ہی رزلٹ آیا تھا واصف نے لاہور جانے کا والدہ کو کہہ دیا کہ مجھے یہاں نہیں رہنا میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ والدہ نے جانے کی اجازت یہ سوچ کر دے دی کہ ماحول بدلے گا تو اس کے اندر کا ماحول بھی بدل جائے گا اور جینے کی آس پیدا ہو جائے گی۔

واصف جیسے ہی لاہور آیا تھا اس نے خود کو سزا دینا شروع کر دی تھی۔ عائشہ ہر ہفتے خالہ کے گھر آنے لگی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ واصف لاہور چلا گیا ہے کبھی کبھار ایک دو دن کے لیے رک بھی جاتی تھی اس طرح ذاکیہ بیگم کا دل بھی بہل جاتا تھا۔

آمنہ کی دو مہینے بعد شادی ہو گئی تھی جس میں ذاکیہ بیگم شریک تھیں۔ وقت کے ساتھ واصف کے دل میں محبت اور جڑیں پکڑ چکی تھیں۔ واصف کبھی ہاتھ والی ریڑھی پر بوجھ ڈھونے لگتا۔ کبھی پیٹرول پمپ پر کام کرنے لگتا تو کبھی مزدوری کرنے لگتا خود کو سزا دینے کے لیے مختلف طریقے اپناتا رہتا اور پھر ایک دن داتا دربار پر بیٹھے ایک دم سے

سوچ بدلی تھی کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں میں کسی کی غلطی کی سزا خود کو کیوں دے رہا ہوں اور پھر اس نے سوچ لیا کہ کسی کی غلطی کی سزا وہ خود سے جڑے رشتوں کو ہرگز نہیں دے گا۔ بلکہ اب کچھ بن کر دکھائے گا۔

واصف جب داتا دربار سے اٹھا تھا تو اس کے پاس ایک مقصد تھا۔ واصف نے اگلے ہی دن کتابیں خرید لی تھیں اور مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ کچھ بننے کے جنون نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ واصف نے خوب تیاری کر کے امتحان دیے اور پھر جب رزلٹ آیا اس کی امید سے زیادہ اچھا آیا تھا۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب اسے جاب مل گئی واصف کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ واصف نے سارے انتظام کیے اور واپس اپنے شہر آ گیا۔ گزرے وقت میں وہ جب جب گھر واپس آیا تھا تب تب عائشہ کو اپنے گھر میں پایا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں لیکن واصف کو نفرت ہو چکی تھی ان سب رشتوں سے جو آمنہ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھی لیکن واصف کو نفرت ہو چکی تھی ان سب رشتوں سے جو آمنہ کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ واصف کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی یہ بھی اس کی طرح ہی ہے دکھتی کچھ اور ہے اور ہے کچھ اور..... واصف نے گھر کو تالا لگایا تھا اور دوسرے دن بنا کسی کو بتائے اپنی والدہ کو لے کر لاہور آ گیا تھا۔

عائشہ نے دو تین چکر لگائے تھے وہ جب بھی آتی گھر کو تالا لگا ہوتا۔ عائشہ نے یہی سمجھا کہ بازار گئی ہوں گی لیکن جب ہر بار تالا ملتا تو اس نے ہمسائیوں کے دروازے پر دستک دے کر پوچھا تو معلوم ہوا واصف کافی دن پہلے آیا تھا اور وہ خالہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ عائشہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ غصہ پی گئی۔ واصف کے سابقہ رویے کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

☆......☆

ایک دوپہر عائشہ فون کی بیل سن کر اٹھی تو دوسری طرف آواز سن کر اس کا دل باغ باغ ہو گیا تھا اور جب شکوہ کیا تو خالہ نے بتایا میں نے تو واصف سے بہت کہا تھا لیکن اس نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں تم تو جانتی ہو آج کل اس کا موڈ کیسا ہے اور خالہ نے بتایا کہ آج ہی فون لگا ہے اور میں پہلی کال تم کو ہی کر رہی ہوں اور پھر بڑی دیر تک دونوں نے دکھ سکھ بانٹے تھے۔ ذاکیہ بیگم نے اپنی بہن کے ساتھ بات کی تھی اور پھر فون بند کر دیا۔

عائشہ میں ایک دم سے نئی جان آ گئی تھی۔ اس کی بے چینی اور اداسی کسی حد تک کم ہو گئی تھی اور اس کو ایک راہ نظر آنے لگی تھی۔ عائشہ کا جیسے ہی رزلٹ آیا تھا اس نے لاہور جا کر پڑھنے کی ضد پکڑ لی تھی کہ وہ ایم بی بی ایس لاہور سے کرے گی۔ گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ جب اپنے شہر میں میڈیکل کالج موجود ہے تو پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے لیکن عائشہ نے جو ضد پکڑی تھی چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ عائشہ جانتی تھی کہ یہ اس کے پاس آخری موقع ہے اگر یہ نکل گیا تو وہ زندگی بھر اس سے دوبارہ مل نہ سکے گی۔ بس یہی ایک موقع ہے اس کو منانے کا۔ عائشہ کی خواہش کے آگے سب سے بڑی رکاوٹ آمنہ بنی ہوئی تھی۔ جس کو اس نے کھری کھری سنا کر چپ کروا دیا تھا اور پھر گھر والے عائشہ کی ضد کے آگے ہار گئے تھے اور انہوں نے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ عائشہ کی ماں کو مطمئن کرنے میں ذاکیہ بیگم نے کافی کردار نبھایا تھا۔ عائشہ نے جو راستہ چنا تھا وہ بڑا مشکل اور صبر آزما تھا اسے بڑے حوصلے اور ہمت سے کام لینا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ برسوں کے روٹھے اتنی آسانی سے نہیں مانا کرتے ان کو منانے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنی انا، خودداری یہیں چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اس نے خود کو آنے والے ہر طرح کے رویے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اس کو اندازہ تھا کہ داسی سے ملکہ کا سفر کوئی آسان نہ ہوگا۔ کتنے ہی دن واصف کو معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ عائشہ اس کے گھر میں موجود ہے کیونکہ اس کی روٹین ہی کچھ ایسی تھی جلدی گھر سے نکل جانا اور رات گئے واپس آنا۔

☆......☆

چھٹی والے دن واصف دیر سے جاگا تو جب نیچے آیا تو عائشہ کو سامنے دیکھ کر ایک دم سے واصف کا دماغ گرم ہوا تھا لیکن پھر اس نے خود پر کنٹرول کیا تھا اور نارمل انداز میں کچن میں چلا گیا تھا اور کچن میں جاتے ہی سارا غصہ باہر آ گیا تھا۔ ''یہ یہاں پر کیا کر رہی ہے۔'' واصف کا خود پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔

''خالہ..... عائشہ تو یہاں پڑھنے کے لیے آئی

ہے۔" ذاکیہ بیگم نے بڑے سکون سے جواب دیا اپنے بیٹے کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ یہاں اس گھر میں کیا کررہی ہے۔"

"بیٹا ظاہری سی بات ہے اگر وہ یہاں پر پڑھنے کے لیے آئی ہے تو یہاں اسی گھر میں رہے گی اور اس نے کہاں جانا ہے۔" یہ بات سنتے ہی واصف نے جو ہنگامہ شروع کیا تھا اور جو باتیں کیں اگر عائشہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ایک پل بھی یہاں نہ رکتی۔ عشق کو بھاڑ میں جھونکتی اور اسی وقت گھر سے نکل جاتی لیکن عائشہ کو معلوم تھا کہ یہ سب ہوگا...... برسوں کے لگے زنگ اتنی جلدی نہیں اترتے اور پھر عائشہ کے لیے نا ختم ہونے والا آزمائشوں کا دور شروع ہوگیا تھا۔

ہر روز ایک نیا زخم ملتا تھا اور اس کی برداشت جواب دیتے دیتے رہ جاتی اور وہ پھر خود کو اگلی صبح کے لیے خود کو تیار کرلیتی۔ عائشہ نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ جس میں واصف کے کپڑے کی صفائی اور کھانا بھی شامل تھا۔ جو اکثر اس کے ساتھ دروازے کے باہر پھینک دیا جاتا۔ واصف نے عائشہ کی انا اور خودداری پر ایسی ایسی کاری ضربیں لگاتا کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتی اسے لگتا تھا کہ اب بھی اس کی برداشت جواب دے جائے گی لیکن اس کا عشق ہر روز اس کو ایک نئی طاقت بخش دیتا تھا اور وہ پھر سے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ واصف نے ہر توہین آمیز رویہ اختیار کیا تھا لیکن عائشہ کے حوصلے کو توڑ نہ سکا تھا۔ واصف تھک گیا تھا لیکن عائشہ ویسے کی ویسی ہی کھڑی تھی پہلے دن کی طرح۔

کوئی اتنا کیسے برداشت کرسکتا ہے۔ وہ اکثر اب یہ سوچنے لگا تھا۔ اس کا ہر وار خالی گیا تھا۔ وہ جتنا ظلم ڈھا سکتا تھا اس نے ڈھا لیا تھا اب اس کی سعی ہو چکی تھی۔ اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔ لیکن انا تھی کہ اس کو جھکنے نہیں دے رہی تھی وہ اپنی نفرت کا بھرم توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بس وہ اب چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح عائشہ اس گھر سے چلی جائے۔

جتنے ظلم اس نے عائشہ پر کیے تھے اب وہ خود سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ تو پھر عائشہ کا سامنا وہ کیسے کرلیتا۔ کوئی اتنا بھی مضبوط ہوسکتا ہے واصف نے آج تک نہ سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ اور پھر اس نے ایک کاری ضرب لگائی تھی اور ضرب اپنا کام کرگئی تھی۔ عائشہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یہ ضرب اس پر لگی تھی کہ عائشہ پر..... یہ آنے والے وقت نے بتانا تھا۔

☆......☆

عائشہ گھر سے کیا گئی تھی واصف کا چین سکون بھی ساتھ لے گئی تھی۔ حالانکہ ہونا تو ایسا چاہیے تھا کہ عائشہ کے جاتے ہی واصف خوش ہو جاتا لیکن ایسا ہوا نہیں واصف کے اندر توڑ پھوڑ اس قدر تیزی سے ہوئی تھی کہ واصف کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اسے عائشہ کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ یاد آرہا تھا اور وہ سلوک جو اس کے ساتھ کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ کسی انسان کو قدر تب ہی ہوتی ہے جب وہ اس سے دور ہو جاتا ہے اور ایسا ہی کچھ واصف کے ساتھ ہوا تھا۔ واصف کو عائشہ کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی جو اس سے پہلے اس نے کبھی سوچی ہی نہ تھی۔ سوچیں اسے کو پاگل کرنے لگی تھیں اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ واصف بیمار ہو کر چارپائی پر آ گیا تھا۔ اور بخار کی حالت میں اکثر واصف کے منہ سے عائشہ، عاشی کے الفاظ ادا ہوتے تھے اور ذاکیہ بیگم سوچنے لگی تھیں کہ عائشہ تمہاری محبت رائیگاں نہیں گئی رنگ لے آئی۔ میری بات غلط ثابت ہوگئی پتھر موم ہونے لگا ہے یہ بات ذاکیہ بیگم کے لیے بڑی خوش آئین تھی لیکن روز بروز بڑھتی بیماری پریشان کن تھی۔

☆......☆

"عائشہ بیٹی واپس آجاؤ واصف کی بیماری دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے۔" ذاکیہ بیگم نے پریشان کن لہجے میں کہا تھا۔

"خالہ آپ پریشان نہ ہوں انا کی آگ میں جلنے والوں کو بخار کی آگ کچھ نہیں کہتی۔" عائشہ نے دل پر پتھر رکھ کر جیسے جواب دیا تھا وہ صرف وہی جانتی تھی۔ لیکن اب وہ خود کو کسی بھی قسم کی ڈھیل نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ خبر سن کر عائشہ کے دل کو کچھ ہوا تو تھا لیکن اس نے خود کو سخت کرلیا تھا اور دل پر پتھر رکھ لیا تھا اور آنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ کوئی پہلی کال نہیں تھی جو خالہ کی طرف کی گئی تھی پچھلے ڈیڑھ مہینے میں اب تک متعدد کال آچکی تھیں لیکن عائشہ کے انکار کو کوئی بھی کال اقرار میں نا بدل سکی تھی۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی

عائشہ نے ایک ہی بات دہرائی تھی۔

''مسافر کو منزل کی چاہت نہیں رہی۔ اگر منزل کو چاہت اور ضرورت ہے تو خود مسافر کے پاس آجائے۔'' ذاکیہ بیگم واصف اور عائشہ کے درمیان پس کر رہ گئی تھیں۔ دونوں ہی اپنی اپنی انا کو لے کر بیٹھے ہوئے تھے کوئی بھی جھکنے کو تیار نہیں تھا اور ذاکیہ دونوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ اب ذاکیہ بیگم کے فیصلہ لینے کا وقت آگیا تھا۔ اب وہ دونوں کو کسی نہ کسی کنارے لگا دینا چاہتی تھی۔

☆......☆

''تم دونوں نے زندگی کو مذاق بنا رکھا ہے۔ کسی اور کا احساس ہی نہیں ہے۔ بس اپنی اپنی انا عزیز ہے باقی جائیں سب بھاڑ میں تمہاری بلا سے تم کو کون سا کوئی فرق پڑتا ہے۔ تم کو احساس ہی نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے دوسرے کتنی تکلیف میں ہیں تم کو کیا پروا تم نے تو بس اپنی من مرضی کر لی ہے۔ کسی اور کی غلطی کی سزا تم کسی اور کو کیوں دے رہے ہو تم۔ یہ کس حق دیا کہ تم دوسروں کے جذباتوں سے کھیلو۔ غلطی تمہاری تھی کہ تم نے غلط انسان کا انتخاب کیا۔ عائشہ نے کیا کچھ نہیں کیا تمہارے لیے۔ تمہارے کیسے کیسے توہین آمیز رویے کو ہنستے ہوئے برداشت کیا اور تم نے کیا کیا اس کے ساتھ تم کو شرم آنی چاہیے۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور جا کر تیاری کر لو صبح ہم رحیم یار خان جا رہے ہیں۔'' ذاکیہ بیگم کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا جب کے واصف خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔

''لیکن میری نصیحت ...''

''مجھے کوئی نصیحت نہیں سننا میں کوئی تم سے پوچھ نہیں رہی تم نے جانا ہے یا نہیں میں تم کو بتا رہی ہوں جاؤ اور تیاری کرو۔'' ذاکیہ بیگم نے واصف کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی تھی۔ جب بچوں سے فیصلے نہ ہو پا رہے ہوں تو بڑوں کا فرض بنتا ہے کہ بہتر طریقے سے مسئلے کا حل نکالیں جس میں سب کی بھلائی ہو اور یہی ذاکیہ بیگم نے کیا تھا۔ وہ دونوں طرف سے تنگ آگئی تھیں اس مسئلے کا حل یہی نظر آرہا تھا جو انہوں نے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆......☆

''عاشی میں تو سب کا لوٹ کر بکھر چکا ہوں۔ اب مجھے سمیٹ لو مجھ سے اور انا کا بوجھ اٹھایا نہیں جا رہا تھا پتھر دل میں دراڑیں پڑ چکی ہیں یا یہ ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے اس کو سمیٹ لو...... تمہارا ظرف تو بہت بڑا ہے تمہارے عشق کی طرح۔ عاشی مجھے معاف کر دو مجھے اپنا لو مجھے بے مراد نہ جانے دینا۔'' واصف عاشی کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ عاشی واصف کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔ عاشی کی اپنی آنکھوں میں بھی برسات کی جھڑی لگی تھی۔

''واصف تم نے آکر میرے عشق کا بھرم رکھ لیا۔ میں تو اب بکھرنے لگی تھی میری امیدیں اب ٹوٹنے لگی تھیں۔ میں اب تھکنے لگی تھی۔ واصف تم نے عشق پر سے میرا اعتبار اٹھنے سے بچا لیا۔ میرا تو اب اعتبار اٹھنے لگا تھا۔ کانٹوں بھرے رستے پر چل چل کر اب میں حوصلہ ہارنے والی تھی۔ واصف تمہیں نہیں پتا تم نے آکر مجھے کس مقام پر سہارا دیا ہے۔ میرا عشق کا کچا گھڑا اب بس ڈوبنے والا ہی تھا میں بس بکھرنے والی تھی۔ تمہارے اقرار نے مجھے بکھرنے اور میرے عشق کو ڈوبنے سے بچا لیا ہے میری دم توڑتی امیدوں کے چراغ روشن کر دیے ہیں۔'' عائشہ واصف کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اور خود کلامی کر رہی تھی۔ واصف نے خیالوں میں کھوئی عائشہ کو بازو سے ہلایا تھا۔ عائشہ چونکی تھی۔ آنسو اب بھی عائشہ کی آنکھوں میں موتی بنے ہوئے تھے اور یہی حال واصف کا تھا۔

دونوں کے آنسو دونوں کی ضد اور انا کو بہا کر لے گئے تھے اور باقی پیچھے صرف عشق بچا تھا۔ دونوں کے دل بڑے ہلکے پھلکے ہو گئے تھے رو کر۔

''اچھا اب جاؤ پھر آکر لے جانا۔'' عائشہ نے آنسو بھری آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابھی کیوں نہیں۔ چلو تم ابھی چلو میرے ساتھ۔'' واصف نے عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے جب واصف کو عائشہ کی بات کا مطلب سمجھ آیا تھا تو واصف نے صدقے واری جانے والی نظروں سے عائشہ کی طرف دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا اور عائشہ سوچ رہی تھی کہ کوئی کہندے وال نہیں گھڑی۔ اسی پتھر گھڑے دیکھے!!

☆☆☆

عشق سراب



صائمہ عروج

اُس دوشیزہ کی داستان جو عشق کے بجائے سراب کی سرگرداں تھی

صبح سویرے وسیع صحن کے درمیان میں لگے ہوئے جامن کے پیڑ پر چڑیوں کی چہکار کانوں میں رس گھول رہی تھی، ٹھنڈی میٹھی سی بادِ صبا کے ساتھ چالی میں چلتی ہوئی مدھانی کی موسیقی بھری مخصوص آواز نے نیند پوری ہونے کے باوجود طبیعت میں خماری پیدا کی ہوئی تھی۔

''تمنا بیٹی اٹھ جاؤ حد ہوتی ہے سستی کی، ابھی تمہارے ابا اور بھائی مسجد سے آتے ہوں گے۔''



اماں جو چاٹی میں مدھانی ڈالے رسیوں کو ایک خاص انداز سے کھینچ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر تمنا کو اٹھنے کے لیے کہا تو اس بار ان کے لہجے میں تھوڑی سختی کے ساتھ ابا اور بھائیوں کے آنے کی دھمکی بھی شامل تھی۔

''کیا ہے اماں جی بھر کے سونے بھی نہیں دیتیں آپ۔'' تمنا نے کسلمندی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گول چہرہ ستواں ناک گلابی رنگت اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ خمار آلود بڑی بڑی غزالی آنکھیں اس کی شخصیت کو سحر انگیز بنائے ہوئے تھیں۔

''ساری رات خراٹے مارتی رہی ہو اور ابھی بھی تمہیں نیند پوری نہ ہونے کی شکایت ہے۔ اٹھو جلدی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

اماں نے اس کی شکایت رد کرتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔ تو وہ ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر چارپائی کی طرف جا رہی تھی، جب اماں نے اسے کچن سے آواز دی۔

''تمنا نماز سے فارغ ہو کر لسی پر سے مکھن اتار لینا تمہارے ابو آتے ہوں گے، میں ان کے لیے چائے بنا لوں۔''

نیا آرڈر سن کر چار بھائیوں کی اکلوتی اور باپ کی لاڈلی نے شکایتی انداز میں کچن کی طرف دیکھا، اور وہیں سے چاٹی کی طرف مڑ گئی۔

اس کے مکھن نکالنے تک سورج صحن میں جھانک چکا تھا، مکھن نکال کر اس نے ہاتھ دھوئے اور پھر لسی کا ایک جگ بھر کر دھڑکتے دل سے کچن میں مصروف ماں کی نظروں سے بچتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف آ گئی۔ بس یہ واحد کام تھا جو وہ پچھلے کئی دنوں سے بنا کسی کے کہے متواتر کر رہی تھی، سیڑھی کے ہر سٹیپ پر اسے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں اماں پیچھے سے آواز دے کر واپس نہ بلا لے۔

گھر بھر کی لاڈلی ہونے کے باوجود اماں اسے تربیت کے معاملے میں کسی قسم کی رعائیت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں، وہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر والے مقولے پر کاربند تھیں۔

مگر وہ جوانی ہی کیا جو بغاوت کا جذبہ نہ رکھتی ہو۔ خیریت گزری اور وہ چھت پر پہنچ گئی۔ وہاں سے حد نگاہ تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کا نظارہ طبیعت میں شگفتگی بھر دینے کے لیے کافی تھا۔ مگر تمنا اپنی ہی سوچوں میں گم ساتھ والی ملحق چھت پر سے ہوتی ہوئی دوسری طرف اپنی سہیلی عالیہ کے صحن میں اتر آئی۔ صحن میں بے ترتیب بستر لگے ہوئے تھے، اس وقت تمام بستر خالی تھے، ماسوائے عالیہ کے، وہ اپنے بستر پر بیٹھی آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی، تمنا کو صحن میں لگے ہوئے بستروں میں سے ایک بستر کم لگا۔

وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی عالیہ کے پاس پہنچ گئی۔

''اٹھ جاؤ محترمہ صبح ہو چکی ہے۔'' تمنا نے اس قریب بیٹھتے ہوئے کہا، اس کی بے قرار نگاہیں کسی کو ڈھونڈنے کے لیے بھٹک رہی تھیں۔

''بیٹا تم ہر روز کیوں تکلیف کرتی ہو ضرورت پڑنے پر میں خود منگوا لیا کروں گی۔'' عالیہ کی امی نے کچن سے نکل کر اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں آنٹی میں نے سوچا محترمہ تو سو رہی ہوں گی، میں خود ہی دے آؤں۔''

تمنا نے ہنستے ہوئے لسی کا جگ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جیتی رہو۔'' آنٹی دعائیں دیتی ہوئی کچن کی طرف لوٹ گئیں۔

''عالیہ کیا بات ہے آج اداس سی لگ رہی ہو، اور وہ تمہارا کزن نظر نہیں آ رہا، کہیں بھگا تو نہیں دیا تم نے اسے۔'' تمنا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''نہیں بھئی میں کیوں بھگاؤں گی اسے، لیکن ہاں وہ واپس چلا گیا ہے۔'' عالیہ نے وہی بات کہہ دی جو وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر جیسے چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ زندگی میں پہلی بار وہ نظروں سے بات کرنے کا مفہوم سمجھی تھی، اور ابھی وہ جواب دینے بھی نہیں پائی تھی کہ سوال پوچھنے والا جا

بھی چکا تھا۔
"کب اور کیوں چلا گیا؟ کیا تمہارا اس سے کوئی جھگڑا ہوا تھا۔" اس نے بے اختیاری کے عالم میں کئی سوال پوچھ لیے۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کا دل کیوں بیٹھا جارہا ہے۔

"ارے نہیں یار میں کیوں جھگڑوں گی اس سے، بس اس کی چھٹیاں ختم ہوگئیں اور وہ چلا گیا۔" عالیہ نے ایک بار پھر آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ تو تمنا واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ چند لمحے مزید بیٹھی رہی تو اس کی نم آنکھیں اس کے دل کا پول کھول دیں گی۔

"بیٹھ جاؤ مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔" عالیہ نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"نہیں میں امی کو بتا کر نہیں آئی، وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔" اس نے عذر تراشتے ہوئے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

ویسے اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے کئی دنوں میں آج اسے پہلی بار اماں کی پریشانی کا خیال کیوں کر آیا تھا۔ وہ گم صم کھوئی کھوئی نڈھال قدموں سے واپس گھر آگئی۔ اس کے اندر محبت کے احساسات اور محسوسات کا پنپنے والا ننھا سا پودا کب تناور درخت بنا اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔ اظہر کے چلے جانے پر ہی اسے معلوم ہوا کہ وہ محبت نامی جذبے میں گرفتار ہو چکی ہے۔ جبھی تو اسے دن میں کئی بار دیکھنا کسی اہم کام کی طرح ضروری ہو چکا تھا، اب اس کے اس طرح اچانک چلے جانے کی خبر نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔

رشتے داری سے قطع نظر تمنا اور عالیہ گہری دوست ہونے کے علاوہ کلاس فیلو بھی تھیں، اسی لیے تمنا کو صرف ان کے گھر تک جانے کی اجازت تھی، اور وہ بھی شاید اس لیے کہ عالیہ کے گھر تک جانے کے لیے گھر سے نکلنے کی بجائے سیڑھیوں کے رستے ان کے گھر جایا جا سکتا تھا، دونوں گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہونے کی وجہ سے انہیں ایک دوسرے کے گھر آنے جانے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ دونوں اکثر اکٹھے بیٹھ کر پڑھا کرتی تھیں، چند دنوں میں دسویں کلاس کے ایگزام ہونے والے تھے، پڑھائی میں کافی تیز ہونے کے باوجود اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

وہ پہروں کتابیں لے کر بیٹھی رہتی مگر کوئی بات اس کے پلے نہیں پڑتی، وہ جتنا پڑھائی کی طرف توجہ کرتی اظہر اتنا ہی اس کے حواس پر چھائے چلا جارہا تھا۔ اب تو کتاب کے ہر صفحے پر اسی کا چہرہ نظر آنے لگا تھا، دل کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی ویرانی چھائی رہنے لگی تھی، وہ یہ سوچ سوچ کر ہی ہلکان ہوئی جارہی تھی کہ نجانے اب بھی اس کی شکل دوبارہ دیکھ بھی پائے گی یا نہیں۔ وہ پہلی بار اپنی پھوپو کے گھر آیا تھا، وہ بھی کالج میں چھٹیاں ہونے کی وجہ سے۔

اسے ایک نظر دیکھتے ہی تمنا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئی تھیں، وہ اظہر کے طلسماتی اور جاذب نظر شخصیت کے سحر میں بری طرح جکڑتی چلی گئی، وہ اظہر کی ستائشی نظروں سے لے کر اس کے اشارے کنایوں تک کے سفر کو قدرت کی منشا سمجھ کر جتنے ہوئے قبولیت کی سند بخشتی رہی، مگر اس ظالم نے تو جاتے ہوئے بتانا تک گوارا نہیں کیا تھا، یہی بات اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی جارہی تھی۔

☆......☆

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔" ایک دن عالیہ نے کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے بیٹھی ہوئی پیپروں کی تیاری کر رہی تھیں۔ تمنا جو بظاہر تو کتاب کھولے بیٹھی تھی مگر درحقیقت کتاب کے صفحے پر ابھر آنے والی اظہر کی شبیہہ سے راز و نیاز میں مصروف تھی۔

"ہاں بتاؤ۔" اس نے بے نیازی کے انداز میں جواب دیا۔

"میرا پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگ رہا۔" عالیہ نے انکشاف کیا تو تمنا چونک کر خیالوں کی دنیا سے حقیقت کے ساحل پر آ اتری۔

"کیا کوئی خاص وجہ پڑھائی میں دل نہ لگنے کی۔" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ کیونکہ

وہ خود بھی یہی بات عالیہ کو بتا کر حیران کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی مگر وہی بات عالیہ کے منہ سے سن کر دم بخود رہ گئی۔

''اظہر کا خیال مجھے پڑھنے نہیں دیتا وہ ہر وقت میرے خیالوں پر چھایا رہتا ہے، وہ اس حد تک میرے حواس پر چھا چکا ہے کہ آج صبح میں نے اپنے بھائی کو آواز دی تو میرے منہ سے اظہر کا نام نکل گیا میرا خود پر قابو نہیں رہا، اس کے بارے میں سوچنے کے علاوہ اور کچھ اچھا نہیں لگتا، دل چاہتا ہے کہ وہ میرے سامنے ہو اور میں پہروں بیٹھ کر اسے دیکھتی رہوں۔''

عالیہ اپنے دل کی حالت اس پر منکشف کر رہی تھی، اور تمنا کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی تیز دھار چھری سے اس پر وار کر رہی ہو۔

اس کے ذہن پر گذشتہ دنوں کی وہ تمام یادیں کسی فلمی سین کی طرح چلنے لگیں۔ اظہر جتنے دن رہا اس کے تمام کام عالیہ اپنے ہاتھوں سے کرتی رہی۔ اسے کھانا دینا، اس کے کپڑے دھونا، استری کرنا، اور پہننے پر خود اس پر پرفیوم سپرے کرنا، اور دونوں کا بات بات پر قہقہے لگانا وہ تو دونوں کا آپس میں کزن کا رشتہ سمجھ رہی تھی مگر یہاں تو بات ہی اور نکلی۔

تمنا کا دماغ اظہر کے کریکٹر کے بارے میں سوالوں کی کثرت سے پھٹنے لگا، سب سے نمایاں سوال جو اس کے سامنے کسی پھنیئر سانپ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا تھا وہ یہ تھا کہ اگر اظہر عالیہ میں اس قدر انوالو ہو چکا تھا تو پھر مجھے اس انوکھے جذبے سے روشناس کروانے اور خواب دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔

اسی سوال کا جواب پوچھنے کے لیے اس نے شکستہ لہجے میں عالیہ سے پوچھا۔

''عالیہ کیا یہ جذبات یکطرفہ ہیں۔''

''نہیں میری معصوم دوست یہ عہد و پیمان سے آگے کی منزل ہے۔'' عالیہ نے ایک ادا سے مخمور لہجے میں جواب دیا تو تمنا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ جسے ہر ہر سانس کے ساتھ یاد کر رہی تھی، وہ تو سرے سے اس کا تھا ہی نہیں، جبکہ وہ تو مستقبل کے سہانے خواب آنکھوں میں سجا کر ہر روز ان میں تعبیروں کے رنگ بھرتی تھی۔ اظہر وہ ہستی تھی جس نے اس کے خود کے ہونے کا احساس دلایا تھا ذہن میں بار بار ایک ہی خیال آ رہا تھا کیا اظہر نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے؟ مگر ہر بار دل کسی سرکش باغی کی طرح ایک ہی گردان کر رہا تھا یہ نہیں ہو سکتا۔''

ٹھنڈی چھاؤں سے یکدم جھلستی دھوپ میں آنے کے احساس نے اسے پسینے میں نہلا دیا۔

☆......☆

چند دن میں ہی اس کی گلابی رنگت پر پیلاہٹ نے ڈیرے ڈال دیے۔ ہرے بھرے درخت کو دیمک لگنے کے موافق وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزور ہوتی گئی، اب اسے جائے نماز پر ہی سکون کی گھڑیاں نصیب ہوتی تھیں۔ لاابالی سی گھر بھر کی لاڈلی ایک دم سے سیانی ہو گئی تھی، دن چڑھے تک نہ اٹھنے والی کو اب تہجد میں لمبے سجدے کرتے دیکھ کر اماں کا دل ہول رہا تھا۔

مگر بظاہر کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی، جسے بنیاد بنا کر وہ اس بارے میں اپنی لاڈلی سے اس بارے میں کوئی سوال پوچھتیں۔

''تمنا کیا کر رہی ہو۔'' عالیہ نے اسے ایک دن چھت پر سے آواز دے کر پوچھا۔

''کچھ نہیں فری ہوں، کیا کوئی کام تھا۔'' اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں کام تو تھا تم سے۔'' عالیہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر نیچے آ جاؤ محترمہ۔'' تمنا نے ایک بار پھر بے نیازی سے کہا۔

''نہیں تم ہمارے گھر آؤ ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

اس بار عالیہ نے اصرار کرنے والے انداز میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''اچھا میں امی سے پوچھ کر آتی ہوں۔'' اس

نے ہامی بھرتے ہوئے کہا، اور پھر اماں سے اجازت لے کر چھت پر پہنچ گئی۔
''کیا بات ہے بہت خوش لگ رہی ہو کیا کوئی لاٹری لگ گئی ہے۔'' اس نے عالیہ کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں یہی سمجھ لو۔'' اس نے اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔
''کچھ بتاؤ گی بھی یا بس پہیلیاں ہی بجھواتی رہو گی۔'' تمنا نے قدرے جھلاتے ہوئے استفسار کیا۔
''اچھا! بتاتی ہوں، تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔'' مجھے کوئی بھی خوشی ملتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ سب سے پہلے تم سے شیئر کروں، آج میں بہت خوش ہوں، جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ اظہر آیا ہے، وہ اپنی مصروفیت اور پڑھائی چھوڑ کر صرف مجھ سے ملنے آیا ہے، آؤ تمھیں بھی ملواتی ہوں۔'' عالیہ نے خوشی سے سرشار لہجے میں اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔
اظہر کی آمد کا سن کر تمنا کے دل کی دھڑکن یکدم بہت تیز ہوگئی تھی۔
دن رات رو رو کر دل کو کچھ سکون آیا تھا، مگر اظہر کی آمد کی خبر سن کر وہ ایک بار پھر سے بے چین ہوگئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اس کا نہیں ہوسکتا مگر دل نامراد، پتا نہیں کیوں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی عالیہ کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی اسے خود کا وجود ہوا میں معلق محسوس ہو رہا تھا، ایسے لگ رہا تھا، جیسے کوئی انجانی طاقت اسے آگے کی جانب دھکیل رہی ہو، اندر کا کرب اس کے چہرے پر کسی خوش خط تحریر کی طرح صاف اور واضح پڑھا جا سکتا تھا۔ اس کا جسم کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہولے ہولے کانپ رہا تھا، جبکہ پہلے سے زرد رنگ مزید گہرے پیلے میں بدل گیا۔
''کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو نا! یہ تمھارا جسم کانپ کیوں رہا ہے۔'' عالیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، تب تک وہ سیڑھیاں اتر کر صحن میں پہنچ چکی تھیں۔
''وہ دراصل مجھے کئی دن سے بخار ہے اتر ہی نہیں رہا۔'' اس نے جھٹ سے جھوٹ بول دیا۔
''اوہ! اگر تمھاری طبیعت خراب تھی تو مجھے بتا دیتی میں تمھیں تکلیف نہ دیتی، عالیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ وہ ابھی برآمدے میں ہی پہنچی تھی جب اظہر کمرے سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگیا، وہ پورے دو ماہ بعد اسے دیکھ رہی تھی، وہ بالکل ویسا ہی تھا ہشاش بشاش چہرے پر مخصوص مسکراہٹ لیے ہوئے، تمنا پر نظر پڑتے ہی وہ حیران سا ہوگیا۔
''یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے۔'' اظہر نے سلام دعا کے بغیر ہی اپنی بے پناہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔
تمنا جو اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی نظریں زمین میں گاڑھے کھڑی تھی، اور بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی، گزرے دنوں میں ایسا کوئی لمحہ نہیں گزرا تھا جب اس نے اپنے رب سے اس کے دیدار کی دعا نہ کی ہو، مگر اب جب وہ سامنے کھڑا تھا تو اعصاب جواب دے گئے تھے۔
اسی دوران عالیہ کی امی نے اسے آواز دی وہ ان کی بات سننے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔
''تمنا میں نے کچھ پوچھا ہے۔'' اظہر نے اپنا سوال دہرایا۔
''خود ہی دیکھ لیں کیا حال ہوا ہے میرا۔'' اس نے بے اختیاری کے عالم میں نظریں اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔
عام حالات میں وہ کبھی خواب میں بھی اتنی بے باکی کا نہیں سوچ سکتی تھی مگر اس وقت اس کے اندر اٹھتے ابالِ ہیجانی کیفیت نے اس کے اظہار کو زبان دے دی تھی۔
''تم کانپ کیوں رہی ہو، تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔'' اظہر نے پریشان لہجے میں پوچھتے ہوئے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھنا چاہا تو وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی، جیسے کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔
''بے چاری کو سخت بخار ہے اگر مجھے معلوم ہوتا تو ہرگز تکلیف نہ دیتی۔'' اسی لمحے عالیہ نے کمرے سے

نمودار ہوتے ہوئے کہا۔ اظہر پریشان سا ہو گیا تھا۔

''ادھر آ جاؤ تمنا میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' آنٹی نے کمرے سے آواز دی تو وہ سب ان کے پاس جا بیٹھے۔ آنٹی اسے صحت کا خیال رکھنے کی نصیحتیں کر رہی تھیں۔ بظاہر تو وہ سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی مگر اس کی تمام تر حسیں عالیہ اور اظہر کی سرگوشیوں پر مرکوز تھی، اس منظر نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔

''اچھا آنٹی میں چلتی ہوں۔'' وہ ایک دم سے ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں بیٹی جا کر آرام کرو، اور دوائی ٹائم پر لیا کرو۔ انہوں نے نصیحت کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

''جلدی ٹھیک ہو جاؤ، پھر خوب گپیں لگائیں گے، عالیہ نے بھی لقمہ دیا مگر وہ جس سے کچھ سننے کی منتظر تھی وہ خاموش رہا، تمنا بوجھل قدموں سے واپس مڑ آئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی گر جائے گی جیسے تیسے کر کے سیڑھیاں ختم ہوئیں، اور وہ سیدھے اپنے کمرے میں چارپائی پر جا گری۔

☆......☆

پورے گھر میں قہقہے بکھیرنے والی تکیے میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رو رہی تھی، مسلسل رونے سے بھی اس کے اندر کا غبار کم نہیں ہو رہا تھا، تکیہ بھی اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

اسی کیفیت میں شام گہری ہو گئی۔

''اماں تمنا کہاں ہے نظر نہیں آ رہی۔'' بھائی عارف کی آواز اس کی سماعت ٹکرائی۔

''اپنے کمرے میں ہو گی۔'' اماں نے جواب دیا تو اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے، اسے معلوم تھا کہ اب یقیناً بھائی اسے ڈھونڈتا ہوا کمرے میں آئے گا۔

''اچھا تو میم صاحبہ آرام فرما رہی ہیں۔ اٹھ جاؤ دو وقت مل رہے ہیں، اس وقت نہیں سوتے۔'' بھائی عارف نے کمرے کی لائٹ آن کرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اور مسکرانے کی

ناکام کوشش کرنے لگی۔

''کیا ہوا! تمھاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں۔'' اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بھائی نے شدید پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

کچھ نہیں بھائی سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے رونا آ گیا، تو آنکھیں سوج گئیں۔'' اس نے جھٹ بنا بنایا جواب دیا۔ بھائی عارف چند لمحے پریشانی کے عالم میں کھڑے ہونٹ چباتے رہے، اور پھر آئینہ اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا۔

''ذرا اپنی شکل دیکھنا۔'' بھائی کے کہنے پر اس نے آئینے میں دیکھا تو اسے خود اپنی شکل اجنبی لگی۔

''میری گڑیا بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔'' بھائی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ خوف سے لرز گئی۔ مذہبی گھرانے سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ پہلے ہی خود کو گناہ گار سمجھ رہی تھی، اب اگر بھائی کو اس کی دلی کیفیت کا پتا چل جاتا تو پورے گھر کا مان خاک میں مل جاتا۔ وہ کچھ بتانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، مگر یہ اس کی زندگی کی پہلی بات تھی جو وہ ان سے چھپا رہی تھی۔

مگر دوسری طرف اظہر اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ اس کا دماغ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، کوئی چیز اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی، جب اسے کچھ نہیں سوجھا تو وہ بھائی کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

وہ بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہی تھی کہ بھائی سر درد سے پھٹا جا رہا ہے، یہ اذیت میری برداشت سے باہر ہے۔ بھائی خدا کے لیے مجھے بچا لو نہیں سہا جا رہا میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔''

اس کے ہذیانی انداز میں رونے کی آواز سن کر چند لمحوں میں ہی سب گھر والے اس کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے، مگر تب تک وہ ہوش و حواس سے بیگانی ہو کر بے ہوشی کی وادی میں اتر چکی تھی۔

☆......☆

ڈاکٹر اسے چھ گھنٹوں کی کوشش کے بعد ہوش میں لائے تھے، بچی ذہنی طور پر انتہائی ڈیپریشن ہے،

اسے ہر حال میں خوش رکھیں، اگر ہو سکے تو اسے کچھ عرصے کے لیے کسی پرفضا مقام پر لے جائیں۔''
ڈاکٹروں نے اسے نصیحت کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اگلے دن اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو بھائی عارف اس کے انکار کے باوجود اسے ایبٹ آباد ماموں کے گھر چھوڑ آیا۔
ماموں سرکاری آفیسر تھے، ان کی دو بیٹیاں تھی، جو تمنا کی ہم عمر ہی تھیں۔ انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔
ایک ماہ بعد جب بھائی عارف اسے واپس لیکر آئے تو اس کی حالت جوں کی توں تھی۔
اس کی واپسی کی خبر سن کر عالیہ اس سے ملنے آئی، ہر وقت چہکنے والی عالیہ خلاف معمول گم صم سی تھی۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے خون نچوڑ لیا گیا ہو۔
''تمہیں کیا ہوا ہے بہت کمزور لگ رہی ہو۔''
سلام دعا کے بعد تمنا نے پوچھا۔
''کیا ہوا ہے مجھے ٹھیک تو ہوں۔'' عالیہ نے اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
مگر اس کا بھرایا ہوا لہجہ کچھ اور ہی داستان سنا رہا تھا۔
''بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے۔'' تمنا نے اصرار کیا تو عالیہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، اور وہ سسک سسک کر رو پڑی۔ تمنا پریشان ہو گئی اس نے اسے گلے لگا لیا۔ اور کچھ دیر بعد جب وہ اپنا جی ہلکا کر چکی، تو تمنا نے پیار سے پوچھا کہ بات کیا ہے۔
''میری منگنی ہو گئی ہے، اور اگلے مہینے شادی ہے۔''
عالیہ نے افسردہ سے لہجے میں بتایا۔ یہ خبر سن کر تمنا کا دل پھر سے لرزنے لگا، یہ تو اچھی خبر ہے، اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ کچھ دیر بعد حواس بحال ہونے پر اس نے مردہ سے لہجے میں کہا کہ میری منگنی اظہر سے نہیں اس کے بڑے بھائی مظہر سے ہوئی ہے۔'' عالیہ نے ایک اور انکشاف کرتے ہوئے کہا تو تمنا حیرت سے گنگ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔
''لیکن عالیہ اظہر تو تم سے محبت کرتا تھا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
''کیوں نہیں ہو سکتا میں اس کے لیے آخری لڑکی تو نہیں تھی۔ اور رہی بات محبت کی، تو نجانے وہ اب تک کتنی لڑکیوں کو اپنی محبت سے فیضیاب کر چکا ہوگا۔''
میں انجانے میں اس کے ہاتھوں بے وقوف بنتی رہی اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی، آخر میں اس نے میری پر خلوص محبت کو میرے دماغ کا فتور کہہ کر اپنا دامن چھڑوا لیا۔'' اور اب وہ اپنے چچا کی بیٹی سے محبت کا دعویدار ہے، اور اسی سے شادی کا خواہشمند ہے۔'' عالیہ پتا نہیں کیا کیا بتا رہی تھی۔
جبکہ تمنا دل ہی دل میں اپنے رب سے معافیاں مانگ رہی تھی، وہ جسے ہر دعا میں طویل سجدوں میں رو رو کر مانگنے میں لگی ہوئی تھی، اور اب تو اس کے مانگنے میں اتنی شدت آ چکی تھی کہ وہ اکثر اپنے خدا سے جھگڑا کرنے پر اتر آتی تھی، وہ انسان اتنا عیب اور گرا ہوا ہوگا، اس نے کبھی خواب میں بھی سوچا تھا۔
آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی دعائیں کیوں قبول نہیں ہو رہی تھیں، کیونکہ وہ اس کے قابل ہی نہیں تھا۔ اللہ نے اسے ایک غلط انسان کی دسترس سے دور اور محفوظ رکھا، یہی اس کے پالنے والے کا اس کے لیے انعام تھا۔
صورت حال واضح ہونے پر اس کے دل میں سکون سا پھیل گیا، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی محبت کا رازدار صرف اس کا سچا مالک ہی تھا۔
وہ ساری بے چینی اور بے قراری تحلیل ہو گئی جس میں پھنسی وہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔
چند دنوں میں ہی اس کی صحت سنبھلتی ہوئی نارمل ہو گئی۔ اب تمنا کی شادی کو پانچ سال بیت چکے ہیں، اللہ نے ڈھیروں محبت کرنے والا شوہر دیا ہے، اور اس کے آنگن میں دو پھول سے بچے چہک رہے ہیں۔

☆☆☆

پروموشن

ثمینہ طاہر بٹ

اُس نوجوان کی داستانِ عجب، جس نے پروموشن پانے کے لیے اپنی محبت کو بھی داؤ پر لگا دیا

میرا نام شہروز حیدر آفندی ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور اسی لیے ان کا بے حد لاڈلا بھی۔ میرے ڈیڈی جج کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور امی ویمنز کالج کی اسسٹنٹ لیکچرار اسی لیے ہمارے گھر کا ماحول ہمیشہ سے ہی بڑا تعلیمی رہا تھا۔ امی اور ڈیڈی کے درمیان بلا کی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات بنا کہے سمجھ جایا کرتے تھے اور ان کی اس قدر ذہنی ہم آہنگی نے ہی میری تربیت کو اس قدر متوازن اور اعلیٰ پائے کا بنا دیا تھا کہ ہمارے سارے سرکل میں مجھے ایک آئیڈیل شخصیت کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ شاید یہ اکلوتا ہونے کی وجہ تھی یا پھر میرے اندر واقعی قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں کہ میں جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا ہر محفل کی جان بنتا چلا گیا۔ خاندان اور اسکول، کالج، حتیٰ کہ یونیورسٹی تک آتے آتے بھی میری ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا یہی عالم رہا بلکہ یونی میں تو میری مقبولیت کا گراف اس درجہ بلندی پر پہنچ چکا تھا کہ میرے بغیر کوئی ایونٹ، کوئی پروگرام فائنل ہوتا ہی نہیں تھا۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں میرا ہی طوطی بولتا تھا مگر پھر ایک دن میری زندگی میں وہ آ گئی اور اس نے آتے ہی مجھ سے میری ساری خوبیاں، ساری نشستیں ایک ایک کر کے چھین لیں اور میں صرف کھڑا دیکھتا ہی رہ گیا۔

میں ان دنوں ایم بی اے کے فائنل ایئر میں تھا۔ ہمارے اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے ذہین سر اکرام اللہ بخاری کا ٹرانسفر سندھ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ ان کے اعزاز میں ہم نے ایک پارٹی رکھنے کا سوچا۔ تھی تو یہ فیئرویل پارٹی مگر ہمیشہ کی طرح میرے زیر انتظام۔

پارٹی والے روز میں صبح ہی صبح پوری تیاری کے ساتھ یونیورسٹی پہنچ گیا اور میرے پلان کے مطابق میری ٹیم کے سب افراد آ گئے۔ میں نے سر اکرام کے اعزاز میں یہ پارٹی کسی ہال یا آڈیٹوریم میں ارینج کرنے کی بجائے اکنامکس ڈپارٹمنٹ کے ہرے بھرے لان میں رکھی تھی۔ سردیوں کے دن تھے، گرم دھوپ نے اپنے سنہری پنکھ پھیلا رکھے تھے۔ سارا انتظام میرے حسب منشا ہی ہوا تھا۔

سر اکرام اللہ بخاری ہماری یونیورسٹی کے ہر دلعزیز اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ہر اسٹوڈنٹ کا مسئلہ اتنی نرمی اور اخلاص سے حل کرواتے کہ ہر کوئی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس فیئرویل پارٹی کو ان کے شایانِ شان دیکھنا چاہتا تھا اور ظاہر ہے اس کے لیے میرے ذہن میں جو جو آئیڈیاز بھی آئے، میں

نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد ان پر عملدرآمد بھی کیا۔

سر کے اعزاز میں ہمارے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے تو ظہرانہ دیا ہی جارہا تھا ان کی طویل علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ہمارے ڈپارٹمنٹ کے علاوہ بھی تقریباً تمام اسٹاف کی طرف سے انہیں خراج تحسین پیش کیا جارہا تھا۔

لان کے مرکزی حصے میں ہم نے اسٹیج بنایا تھا جس پر پرنسپل صاحب کے ہمراہ سر اکرام اللہ جلوہ افروز تھے اور اسٹیج کے ایک طرف رکھے گئے ڈائس پر ان کے ساتھیوں کے علاوہ ان کے مداح، طلبہ باری باری آتے اور انہیں اور سب حاضرین کو اپنے جذبات سے آگاہ کرتے۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر سر اکرام اللہ کو سب کی طرف سے تحائف دیے گئے اور کھانے کا راؤنڈ چلا۔

میں چونکہ اس تقریب کا منتظم اعلیٰ اور روح رواں تھا اس لیے اس پروگرام کی ممکنہ کامیابی کو دل سے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ہر طرف سے مبارکباد سے نوازا جانے لگا۔ سب کی طرح سر اکرام نے بھی مجھے پاس بلا کر میری تعریف کی اور دوسرے اساتذہ نے بھی ان کی تائید کی تو میرا سیروں خون بڑھ گیا۔

میں خوشی میں پھولا پھر رہا تھا کہ میرے بچپن کے دوست امجد نے میری تعریفوں کے پُل باندھ دیے تو میں اور بھی ہواؤں میں اڑنے لگا۔

اچانک سے ہی اس پھولے غبارے سے ہوا نکلی اور میں دھڑام سے زمین پر آن گرا۔

میں اور امجد ہر طرف کا راؤنڈ لگا چکے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ہمارے بالکل پیچھے سرو کے گھنے پودے تھے اور ان پودوں کے پیچھے ہی جھنجھلائی ہوئی نسوانی آواز آئی تھی جس نے مجھے چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔

''اف! توبہ ہے ہبرینہ، اب بس بھی کر دو اور نکلو یہاں سے۔ توبہ ہے میرے تو سر میں درد ہونے لگا ہے اس بے ہنگم شور سے۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ بڑا اچھا پروگرام ہوگا بہت مزہ آئے گا، خاک بھی مزہ نہیں آیا میرا تو الٹا سارا دن ضائع ہی ہو گیا تمہارے اس بتو کے چکر میں۔''

''اوہو! کیا ہو گیا ہے یار، تم اتنی بیزار کیوں ہو رہی



ہو۔ بس تھوڑی دیر اور یہاں پھر چلتے ہیں۔ میں سر بخاری سے آٹو گراف تو لے لوں۔"

ابھی ہم پہلی آواز کے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھل سکے تھے کہ دوسری قدرے جانی پہچانی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"کیا...... ! ابھی تھوڑی دیر اور......؟ نہیں بھئی، اب مجھ میں بالکل بھی ہمت نہیں بچی۔ اس سیاسی جلسے جلوسوں والی ارینجمنٹ سے سجے پنڈال میں بیٹھ کر بیوقوفوں کی طرح سب کے منہ دیکھنے کی۔ تم بس چلو یہاں سے اور رہی سر سے آٹو گراف لینے کی بات تو پلیز تم اپنی آٹو گراف بک اپنے اس سپر ہیرو کو دے دو جس کی شان میں قصیدے پڑھتے تمہارے ڈپارٹمنٹ کے سب لوگوں کی تم سمیت زبان نہیں سوکھتی۔ اونہہ! شہروز یہ...... شہروز وہ...... اور شہروز صاحب نکلے کیا؟ حسن جمال سے عاری اور بلکل کورے بندے۔ تم بس چلو یہاں سے۔"

یہ باتیں تو میری برداشت سے بالکل باہر ہی تھی اس لیے میں بے اختیار ان کی طرف بڑھا مگر اسجد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا اور اشارے سے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

وہ دونوں لڑکیاں تو جانے کب اس محفل سے جا چکی تھیں مگر جاتے جاتے میرا سکون اور اطمینان بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اسجد میرا سچا اور پکا دوست تھا وہ میری کیفیت سمجھ رہا تھا اس لیے اس نے مجھے زیادہ تنگ نہیں کیا اور خود ہی مجھے ایک خاموش گوشے میں بٹھا کر باقی کے امور نمٹانے چلا گیا۔ پھر میں بھی زیادہ دیر وہاں رک نہ سکا اور چپ چاپ خاموشی سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس چلا آیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اور امی ڈیڈی حسب معمول لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مجھے اس طرح اور اس وقت اپنے سامنے دیکھ کر دونوں ہی کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں اپنا کوئی فنکشن اس طرح ادھورا چھوڑ کر آیا تھا۔ امی تو مجھے دیکھ کر دہل ہی گئیں۔ پریشان تو ڈیڈی بھی ہو گئے تھے مگر انہوں نے ضبط کر لیا۔ میں ان دونوں کو دور سے سلام کرتا، نظر بچاتا سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆

"جگر! اٹھ چل تیار ہو جا جلدی سے۔ پتا چل گیا ہے اس مغرور حسینہ کا جس نے ہمارے شہزادے کا دل دکھانے کا جرم کیا ہے۔ چل، یار ذرا چل کر اس سے اپنا حساب چکتا کریں۔" میں تکیے میں منہ دیئے پڑا تھا جب ایک مخصوص دھماکے کے ساتھ دروازہ کھولتا اسجد اندر آیا اور آتے ہی میرے اوپر سے کمبل کھینچتا ہوا جوش بھرے انداز میں بولتا چلا گیا۔ میں ظاہر ہے کہ اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"او یار! ذرا چھری تلے دم تو لو، ہوا کیا ہے؟ اور تم کہہ کیا رہے ہو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"اب چھری تلے ہمیں دم نہیں لینا جگر! اب ان کے جگر پر چھریاں چلانے کی باری ہماری ہے۔ تم اٹھو، ابھی اٹھو اور چلو میرے ساتھ۔"

اور پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسجد مجھے تیار کروا کر یونی لے ہی گیا۔ اس دن مجھے علم ہوا کہ اگر اس پری وش کو میرا کام پسند نہیں آیا تھا تو بالکل ٹھیک ہی تھا۔ وہ اسم بامسمیٰ تھی۔ سبرینہ جو کہ ہمارے ہی ڈپارٹمنٹ کی تھی، پریشے گل اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اور فائن آرٹ ڈپارٹمنٹ کی ذہین ترین اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ سبرینہ کے ہی اصرار پر اس دن سر اکرام کی الوداعی پارٹی میں شریک ہوئی تھی۔ میں اسجد کے ہمراہ بڑے خراب موڈ کے ساتھ ان دونوں سے پوچھ گچھ کرنے گیا تھا مگر جیسے ہی اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا میں سب کچھ بھول گیا۔ وہ تھی ہی اس قدر حسین کہ اس پر نظر ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا پروقار اور سنجیدہ انداز کہ دل خود بخود اس کی تکریم میں جھک جھک جائے۔

وہ ہلکے گلابی اور آسمانی رنگ کنٹراس کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا دوپٹہ بڑے قرینے سے اس کے صبیح چہرے کے گرد ہالے کی صورت لپٹا اس کے تقدس میں اضافہ کر رہا تھا۔ یہ اس کا رعب حسن تھا یا اس کی سادگی کہ میں صرف اسے دیکھ کر رہ گیا اور میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

"سبرینہ! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اور آپ کی دوست کو اس دن پارٹی میں مزہ نہیں آیا۔ آپ کا ٹائم بھی ویسٹ ہوا اور آپ کو بوریت بھی اٹھانا پڑی، ہم اس کے لیے دل سے معذرت خواہ ہیں۔" میرے منہ سے نکلنے والے ان الفاظوں نے جہاں ان دونوں کو چونکایا تھا وہیں

اسجد بھی حیرت سے مجھے گھورنے لگا تھا مگر میں جانے کیوں شرمندگی سے گڑا جارہا تھا۔ اپنی اس حالت کی تو مجھے خود سمجھ نہیں آرہی تھی تو دوسروں کو کیا بتاتا۔

''ارے نہیں شہروز! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ جیسا سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو پری کی اس دن طبیعت واقعی بہت خراب ہوئی تھی اس لیے یہ جانے کیا اناپ شناپ بول گئی ورنہ سچ کہہ رہی ہوں فنکشن اتنا بھی برا نہیں تھا جتنا یہ واویلا مچا رہی تھی۔''

اب میری ظاہری حالت ایسی رہی تھی یا واقعی میری شرمندگی سبرینہ کو بھی شرمندہ کرگئی تھی کہ مجھے بے ساختہ تسلی دینے والے انداز میں بولی تھی، یہ سوچے بغیر کہ وہ بول کیا رہی ہے۔ سبرینہ کی بات سن کر ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، میری اور پری کی نگاہ ملیں اور پھر ہم دونوں کی ایک ساتھ ہی ہنسی چھوٹ گئی۔ سبرینہ پہلے تو حیرت سے ہمیں ہنستے ہوئے دیکھتی رہی، پھر شانے اچکا کر حیرت بھرے انداز سے اسجد کی طرف دیکھنے لگی مگر اسے بھی اسی طرح ہنستے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی اور پھر خود بھی ہماری ہنسی میں شامل ہوگئی۔ اس دن سے ہم چاروں کے درمیان دوستی کا رشتہ بن گیا جو وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط ہوتا گیا۔

☆......☆

میرا اور اسجد کا ایم بی اے مکمل ہوا تو ہم عملی زندگی میں کود پڑے۔ میں نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرلی اور اسجد نے اپنا فیملی بزنس جوائن کرلیا۔ پری اور سبرینہ کا لاسٹ ایئر چل رہا تھا اس لیے ہم کبھی کبھار ان سے ملنے یونیورسٹی چلے جاتے مگر میں چاہ کر بھی پری پر اپنے دل کی خواہش کا کبھی اظہار نہیں کر پایا۔ یہ اس کا گریز تھا یا اس کے وجود پر چھایا وقار کہ میرے دل کی بات ہمیشہ دل میں ہی رہی مگر اسجد اور سبرینہ کی گاڑی پوری رفتار سے پیار کی پٹڑی پر دوڑ رہی تھی۔ پھر ان کی گاڑی کو منزل مل ہی گئی۔ اسجد اور سبرینہ کے گھر والوں نے ان کے رشتے کو منطقی انجام پر پہنچا دیا اور ان کی جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔

☆......☆

''ہاں بھئی برخوردار! تمہارا دوست تو ٹھکانے لگا، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ ہے کوئی حسینہ نظر میں یا پھر یہ کارنامہ بھی [illegible] انجام [illegible] گا؟'' اسجد اور سبرینہ کی شادی کے کارڈز دیکھتے ہوئے ڈیڈی نے اپنے مخصوص نرم گرم انداز میں میری کھنچائی کی تو میں جھینپ کر رہ گیا۔ پہلے تو میرا دل چاہا کہ جھٹ سے پری کا نام ان کے سامنے رکھ دوں مگر پھر اس کا گریز اور اس گریز کی وجہ یاد آگئی۔

☆......☆

''سوری شہروز! جو آپ چاہتے ہیں، وہ نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے علاقے، اپنے قبیلے کی پہلی لڑکی تو نہیں جو یونیورسٹی تک پہنچی ہوں مگر ہاں میں وہ پہلی لڑکی بھی بننا نہیں چاہتی جو اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر ان کا اونچا شملہ جھکا دے، اپنے علاقے کے رسم و رواج کے خلاف جانے کی مجھ میں واقعی ہمت نہیں ہے شہروز اس لیے پلیز اپنے بڑھتے قدموں کو یہیں روک لیں۔ میں اس سفر میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔''

یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے میرے سارے منہ زور جذبوں کو باندھ دیا تھا اور اس نے خاموشی سے اپنی محبت سے دستبردار ہوگیا۔

☆......☆

''ارے نہیں ڈیڈی! ایسی کوئی بات نہیں۔ میری کوئی پسند نہیں اگر ہوتی تو سب سے پہلے امی اور آپ کو ہی بتاتا کیونکہ سارے مرحلے تو آپ دونوں کو ہی طے کرنے تھے ناں۔'' میں نے بمشکل اپنے جذبات کو قابو کرتے ہوئے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا تو امی میری 'فرمانبرداری' پر نہال سی ہوگئیں۔

''دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ ہمارا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ وہ ضرور ہمارا مان رکھے گا اور اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا اختیار ہمیں ہی دے گا۔ آپ تو بس ایسے ہی شکوک کا شکار ہورہے تھے۔''

''ارے بیگم صاحبہ! آپ حالات بھی تو دیکھیں ناں، آج کل تو ہر طرف ایک ہی ہوا چل رہی ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کو صرف اپنی پسند پر ہی بھروسہ ہے وہ کسی اور کی پسند پر اعتبار کرنے کو تیار ہی نہیں تو ایسے میں پھر ہم جیسے بزرگوں کا مشکوک ہونا تو بنتا ہے ناں؟'' ڈیڈی نے اپنی انوکھی منطق کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ امی انہیں گھور کر رہ گئیں اور میری بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ ڈیڈی بھی میرے ساتھ ہی قہقہے لگانے لگے اور امی کچھ دیر تو خشمگین

نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتی رہیں اور پھر خود بھی ہمارے ساتھ ہنسی میں شامل ہو گئیں۔

اسجد اور سبرینہ کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ وہ اپنے والدین کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا تو سبرینہ بھی والدین کی اکلوتی بیٹی اور دو بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ اس لیے دونوں گھرانے اپنے سارے ارمان نکالنے کے چکر میں تھے۔ ان کے باقی فرینڈز کی طرح ہم بھی انوائیٹڈ تھے بلکہ میری اور پری کی تو پوری فیملی ہر فنکشن میں آگے آگے ہی تھی اور یہ شاید ہمارے حق میں بہت اچھا ہو گیا کیونکہ امی کو پری اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اس کی امو جان سے باتوں باتوں میں ان کا سارا بائیو ڈیٹا حاصل کر لیا اور پھر اسجد کی شادی کے فوراً بعد وہ اور ڈیڈی ایک خاص مہم پر روانہ ہوئے۔ مجھے انہوں نے اپنے ہر معاملے سے بالکل انجان رکھا۔ شاید ان کا ارادہ مجھے سرپرائز دینے کا تھا۔ بہرحال ان کی خفیہ کارروائیوں کا مجھے اس وقت علم ہوا جب پری کے بابا جانی اور امو جان اپنی پوری فیملی سمیت ہمارے ہاں ڈنر پر آئے۔ میں اسجد کی شادی میں ان سب سے مل چکا تھا اس لیے بھی اور کچھ وہ پری کے والدین اور بھائی بھائی تھے اس لیے بھی ان سے مل کر ایک خاص قسم کی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

''ہاں تو شہروز میاں! اب آگے کا کیا ارادہ ہے؟ اپنا بزنس اسٹارٹ کرو گے یا پھر کہیں جاب وغیرہ کا پروگرام ہے؟'' اسفند بھیا نے گرین ٹی کا سپ لیتے ہوئے اچانک مجھ سے پوچھا تو گڑبڑا سا گیا کیونکہ اس سے پہلے بات سیاست کی ہو رہی تھی اور ان باتوں میں میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔ میں تو اس گتھی کو سلجھانے کی فکر میں ہلکان ہوا جا رہا تھا کہ پری ان سب کے ساتھ کیوں نہیں آئی کہ بھیا نے اچانک اپنی توپوں کا رخ میری طرف موڑ لیا جس کی وجہ سے میں ہونق ہی ہو گیا۔ میری حالت دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے اور میں شرمندہ ہو گیا۔

''جی وہ! اپنا بزنس تو ابھی نہیں شروع کروں گا، ہاں چند جگہ اپلائی کر رکھا ہے۔ اچھی کمپنیز ہیں، امید ہے کہ جلد ہی جاب مل جائے گی ان شاء اللہ۔'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے قدرے انکساری سے کہا تو بابا جانی تائیدی انداز میں سر ہلا کر جیسے مجھے سراہنے لگے۔

''بھئی اسفند بیٹا! آپ ہمارے بیٹے کو انڈر اسٹیمیٹ مت کریں۔ یہ جو بھی سوچتے ہیں کر گزرتے ہیں اور جو بھی ٹھان لیں پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتے، کر کے دکھاتے ہیں۔ بہت فوکسڈ اور بہت کمپوزڈ پرسنالٹی ہے ہمارے بیٹے کی ماشاءاللہ۔'' امی نے محبت سے بھرپور انداز میں میری تعریف کی تو میں کھل کر مسکرایا اور قریب بیٹھی امی کے شانوں پر بازو پھیلا کر انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ شاید ہم ماں بیٹے کی دلی محبت کا اثر تھا یا پھر واقعی قسمت مجھ پر بہت مہربان تھی کہ بابا جان نے اسی وقت مجھے سند قبولیت بخش دی۔ بس، پھر باقی کے سب معاملات خود بخود طے ہوتے چلے گئے اور صرف دو ماہ بعد ہی پری میری زندگی میں محبتوں اور خوشیوں کے رنگ بھرنے کے لیے میری جیون ساتھی بن کر ہمیشہ کے لیے چلی آئی۔

پری وش نے واقعی ہمارے گھر کو جنت نظیر بنا ڈالا تھا۔ ڈیڈی کو گارڈننگ کا بے حد شوق تھا اور ان کے اس شوق کو کمپنیز پری نے کیا۔ وہ خود بھی پھولوں پودوں کی دیوانی تھی، سو اس نے اور ڈیڈی کے مشترکہ شوق اور محنت نے ہمارے لان کو جنت کے ٹکڑے میں تبدیل کر دیا۔ امی کو کوکنگ اور ننگ کا شوق تھا اور پری یہاں بھی ایک ایکسپرٹ کی طرح ان کے ساتھ تھی۔ سو، لان کی طرح ڈائننگ ٹیبل پر بھی خوب رونق اور بہار نظر آتی۔ راوی ہر طرف چین ہی چین لکھ رہا تھا مگر ہر وقت کا سکھ چین بھی شاید بندے کو راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کشش کسی بھی چیز کی صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ ہماری دسترس میں نہیں آ جاتی۔ دسترس میں آ جانے کے بعد تو شاید وہ نور بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے اور یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

ہماری شادی کو دس سال بیت چکے تھے۔ ڈیڈی اور امی اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ پری کی کشش اب بھی ویسے کی ویسی ہی تھی۔ حالانکہ ہمارے دو بچے ہو چکے تھے۔ آٹھ سالہ بہروز اور پانچ سالہ مہروز۔ دونوں میں دادا دادی کی جان تھی۔ پری کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی ان کی تربیت میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب پر تھا اور اب تو ترقی کرتے کرتے جی ایم کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ میری جاب

اور پھر امی ڈیڈی کا سوشل سرکل ایسا نہیں تھا کہ ہم گمنامی کی زندگی گزارتے۔ ہماری پرسنل لائف بھی بہت سوشل اور ایکٹو تھی۔ ہر ہفتے ہمیں کہیں نہ کہیں سے انویٹیشن ملتے رہتے اور ہم بھی مہینے میں ایک دو پارٹیز تو ضرور ارینج کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان پارٹیز کو پری ہی پیچ کرتی تھی اور اس کی ارینج کی ہوئی پارٹیز دیکھ کر مجھے اپنی منعقد کی گئی محفلیں واقعی جلسے جلوس ہی لگتی تھیں۔ وہ ہر بار ایک نیا اور اچھوتا آئیڈیا لاتی اور ہماری ہر پارٹی پہلی سے زیادہ کامیاب تصور کی جاتی۔ ان سارے ہنگاموں اور اس قدر شدید مصروفیات کے باوجود بھی ہم ایک لمحے کے لیے بھی ایک دوسرے سے غافل نہیں رہتے تھے۔ یہ شاید ہم سب کا آپس میں پیار تھا یا پھر ہماری کیمسٹری ایک دوسرے کے ساتھ اتنی ملتی تھی کہ بن کہے ہی دوسرے کے دل کی بات سمجھ جایا کرتے تھے۔

وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔ میرا وقت بھی آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ ہماری برانچ میں کچھ ورکرز ٹرانسفر ہو کر آئے۔ سب ہی اچھے عہدوں پر تھے اور ملک کے دوسرے علاقوں سے پرموٹ ہو کر آئے تھے۔ میں ان سب کی کیس ہسٹری دیکھ رہا تھا اور یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ نئے آنے والوں میں کون کس کیٹیگری کا ہے۔ یہ میرے آفس کے ماحول اور میرے کام کے لیے بہت ضروری تھا۔ ان نئے آنے والوں میں سے سب ہی پرموشن پا کر آگے آئے تھے سوائے ایک بندے کے اور اس ایک بندے کے کوائف نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ جنید کا تعلق پشاور برانچ سے تھا اور وہ وہاں جس پوسٹ پر تھا، یہاں بھی اسے جوں کا توں ہی بھیج دیا گیا تھا۔ کیوں؟ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مسز اکرم (میرے پی اے) نے سب اسٹاف سے تعارف کے لیے فوری میٹنگ ارینج کی تھی اس لیے میں میٹنگ میں چلا گیا اور پھر وہاں موجود سب لوگوں سے مل کر مجھے ہمیشہ کی طرح اچھا ہی لگا۔ ہمارا نیا اسٹاف بھی پہلے کی طرح بہت قابل اور اچھا تھا اور مجھے پوری امید تھی ہم سب کے مل جل کر محنت سے کام کرنے سے ہماری برانچ بہت آگے جائے گی۔ جنید کو دیکھ کر البتہ میں عجیب سے احساسات کا شکار ہوا تھا۔ کچھ تھا اس بندے کی آنکھوں میں، کچھ ایسا جو مجھے بار بار چونکا رہا تھا۔ کیا؟ میں خود نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

جلد ہی سب لوگ آفس کے ماحول میں ایڈجسٹ ہو گئے اور ہم نے بھی ان سب کو اپنے آفس کا حصہ بنا لیا۔ جنید کا رویہ میرے ساتھ بہت نیاز مندانہ سا تھا۔ اس کے اتنے عقیدت اور عاجزی بھرے انداز سے مجھے کبھی کبھار کوفت ہونے لگتی اور کبھی کبھی میں خواہ مخواہ شرمندہ بھی ہو جاتا۔ وہ میرے علاوہ اپنے دوسرے افسرانِ بالا کے بھی آگے پیچھے پھرتا پایا جاتا۔ اس کا خوشامدی انداز اور سب کی جی حضوری کی عادت اس کی شاندار پرسنالٹی سے بالکل بھی میچ نہیں کھاتی تھی۔ وہ بلا کا وجیہہ تھا۔ جانے اسے اس کی وجاہت کا احساس نہیں تھا یا پھر وہ یہ احساس کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال اس کی ان عادتوں کی وجہ سے وہ اکثر اسٹاف کے مذاق کا نشانہ بھی بن جاتا مگر حیرت کی بات تھی کہ وہ کسی کی باتوں کا کبھی بھی برا نہیں مناتا تھا۔

☆......☆

''شہروز! آج تمہارے آفس سے کوئی مسٹر جنید اپنی مسز کے ساتھ آئے تھے۔'' میں ڈنر کے بعد بہت ریلیکس ہو کر لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی پر اپنا فیورٹ ٹاک شو دیکھ رہا تھا کہ پری نے میرے سامنے گرین ٹی کا کپ رکھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں اطلاع دی۔

''کیا...... جنید......؟ اور یہاں...... ہمارے گھر؟ ارے وہ کیوں آیا تھا؟ اور اس کو اجازت کس نے دی یہاں آنے کی؟'' میں جنید کا نام سنتے ہی جھلا گیا اور ایک دم اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھتے ہوئے اس سے بھی تیز لہجے میں بولا تو پری کے ساتھ امی اور ڈیڈی بھی میرا منہ دیکھنے لگے جو قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

''شہروز! کیا بات ہے بیٹا! یہ کونسا طریقہ ہے بات کرنے کا؟'' امی نے اپنا کپ میز پر رکھتے ہوئے بہت سنجیدہ اور ٹھنڈے لہجے میں مجھ سے کہا تو میں ایک دم سنبھل گیا۔

''سوری امی! وہ...... جنید کا نام سنتے ہی مجھے جانے کیوں غصہ آ گیا اور میں ایک دم ہی ہائپر ہو گیا۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ میرا مزاج ایسا نہیں ہے۔'' میں نے سب کے تاثرات دیکھتے ہوئے خفت زدہ سے انداز میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کہا تو پری سنجیدگی سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

''شہروز! ایسا کیا ہے کہ جنید صاحب کا نام سنتے ہی آپ کو غصہ آ گیا، آخر پہلے بھی تو آپ کے کولیگز وغیرہ آتے رہتے ہیں ہمارے گھر۔ کبھی پارٹیز میں تو کبھی ویسے ہی۔ آپ نے اس طرح تو کبھی بی ہیو نہیں کیا۔ اب ایسا کیا ہو گیا۔'' پری کی سنجیدہ اور اندر تک کھوجتی نگاہوں نے مجھے اور بھی گڑبڑا کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ امی اور ڈیڈی کی سوالیہ نگاہوں کا بھی مجھے سامنا تھا۔

''ارے نہیں نہیں، ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہے پری۔ تم خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔ میں تو بس ایسے ہی......''

''ہاں تو وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ 'ایسے ہی کیا؟' آپ تو ان کی آمد کا سن کر ہی اتنے ہائپر ہو گئے کہ ہمیں بھی پریشان کر دیا۔ اب اگر آپ کو یہ پتا چلے کہ وہ ہم دونوں کو ڈنر پر انوائیٹ کر گئے ہیں تو......!''

''کیا......؟ ڈنر......؟ اور وہ بھی ہم دونوں کو...... ارے پری کہیں تم نے انویٹیشن قبول تو نہیں کر لیا؟ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں کہیں نہیں جا رہا۔''

''شہروز! انف از انف! بس بہت ہو گئی تمہاری یہ بیوقوفوں والی باتیں۔ اب اگر تم نے کوئی فضول بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔'' ڈیڈی سے شاید میرا احمقانہ رویہ بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا اس لیے انہوں نے اپنے مخصوص کھردرے انداز میں آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تو میں ایک دم حواسوں میں واپس آ گیا۔

''ڈیڈی! معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے آج واقعی میری طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے اس لیے......!''

''حالانکہ ہمیں لگ رہا ہے کہ آج تمہارا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ کیوں پری بیٹا، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟'' امی نے بھی میری بات کاٹتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور ظاہر ہے ان سب کی مسکراہٹوں میں میری جھینپی جھینپی مسکراہٹ بھی شامل تھی۔

''شہروز! میں نے مسز جنید کا انویٹیشن ایکسپٹ کر لیا ہے اور اس سنڈے کو ہم ان کی طرف جا رہے ہیں۔ تم یاد رکھنا اور پلیز اب اس دن کسی اور مصروفیت کا بہانہ مت بنا لینا۔ مجھے تمہاری نیت پر ابھی سے شک ہونے لگا ہے۔'' پری نے گرین ٹی کے خالی کپ سمیٹتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں صرف ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔

☆......☆

ہفتے کی شام ہم دونوں تیار ہو کر جنید کے دیے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے۔ ہمیں گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی کافی ٹائم لگ گیا۔ اس سے بھی میرا موڈ کافی حد تک خراب ہو چکا تھا مگر پری کی وجہ سے میں خود پر کنٹرول کیے ہوئے تھا۔ جیسے ہی ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچے، جنید اور اس کی بیوی کو پہلے ہی اپنا منتظر پایا۔ وہ دونوں گھر سے باہر نکل کر سڑک پر بے چین کھڑے ہماری راہ تک رہے تھے۔ ہماری گاڑی جیسے ہی ان کے قریب رکی، جنید نے تیزی سے آگے بڑھ کر پری کی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور بہت عاجزانہ انداز میں اسے ویلکم کہا تو ایک لمحے کے لیے پری بھی گڑبڑا گئی۔ پری کے باہر نکلتے ہی میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور برے موڈ کے ساتھ باہر قدم نکالا مگر اپنے سامنے کھڑی اپسرا کو دیکھ کر، بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آیئے ناں سر! آپ کا انتظار میں تو ہماری آنکھیں ہی پتھرا گئی تھیں۔ سچ، بہت انتظار کروایا آپ نے۔'' اس حسین ترین لڑکی کا بولنے کا انداز بھی بے حد خوب صورت تھا۔ اس کی آواز، اس کا انداز اس قدر دلنشین تھا کہ ایک لمحے کو تو میرا سانس ہی رک گیا۔ میں ہونقوں کی طرح اس مہ جبیں کو دیکھتا جا رہا تھا۔

''شہروز! چلیں ناں! کیا ہوا آپ کو۔ آپ رک کیوں گئے؟'' پری جو گاڑی سے باہر نکل کر میرے انتظار میں کھڑی تھی، مجھے آدھا گاڑی کی اندر اور آدھا باہر بت بنا دیکھ کر ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

''جی سر! آیئے ناں پلیز!'' اس حسینہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک خاص ادا سے کہا تو میں گڑبڑاتا ہوا فوراً باہر آ گیا۔ پری کچھ فاصلے پر کھڑی عام اور سرسری انداز میں ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اب وہ حسینہ پری کی طرف متوجہ ہو چکی تھی اور اس سے بڑی محبت سے مل رہی تھی۔ پری بھی اس سے مل کر خوش نظر آ رہی تھی۔ اگلے چند منٹ کے بعد ہم ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ جنید نے اس حسینہ کا تعارف خوشبو کے

نام سے کروایا۔ وہ واقعی مہکتی ہوئی خوشبو کی طرح ہی تھی۔ میں جس قدر برے موڈ اور برے دل کے ساتھ وہاں گیا تھا، اب اتنا ہی خوش اور شاد تھا۔ خوشبو کسی پروانے کی طرح میرے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ جنید پری کو فل پروٹول دے رہا تھا تو خوشبو مجھے ہاتھوں ہاتھ لے رہی تھی۔ ہم نے وہاں بہت اچھا وقت گزارا۔ جنید کی چند اور خوبیاں مجھ پر کھلی تھیں۔ وہ بہت ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھا۔ ذہین بھی تھا اور شاید محنتی بھی مگر پھر بھی اس کی ابھی تک ترقی نہیں ہو پائی تھی۔ کیوں؟ اس کی وجہ میری سمجھ نہیں آسکی تھی۔ ہم رات گئے جنید اور خوشبو کی سنگت میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ کھانے اور گرین ٹی سے فارغ ہونے کے بعد جنید کے کہنے پر خوشبو اپنا ستار اٹھالائی۔ اس کی آواز بھی اس کی طرح بے پناہ حسین تھی۔ پری بھی اس کی آواز کے سحر میں بری طرح گرفتار ہوگئی۔ اب اس کی خوشبو سے پکی دوستی ہوگئی اور مجھے بھی اپنے پچھلے ردعمل پر دل ہی دل میں افسوس ہونے لگا تھا۔

☆.....☆

جنید کا اب میرے ساتھ دوستی کا سا رشتہ بنتا جا رہا تھا۔ وہ اکثر گھر سے کچھ نہ کچھ بنوالاتا اور بڑے اصرار سے مجھے اپنے لنچ میں یہ کہہ کر شریک کرتا کہ یہ سب کچھ خوشبو نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور خاص طور سے میرے لیے بھجوایا ہے۔ پہلے پہل تو مجھے بہت عجیب لگا مگر پھر کچی بات ہے مجھے اچھا لگنے لگا۔ ظاہر ہے بھئی میں کوئی زاہد خشک تو تھا نہیں کہ اتنی حسین وجمیل ہستی میرے آگے پیچھے پھرے، میرے لیے اپنے حسین ہاتھوں سے لذیذ کھانے بنا بنا کر بھیجے اور میں اسے اگنور کرتا چلا جاؤں۔ اس لیے میں بھی اس خصوصی پروٹوکول کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میں جنید اور خوشبو کے اس قدر قریب ہو گیا کہ اگر چند دن بھی ان کے گھر کا چکر نہ لگا پاتا تو ایسے لگتا جیسے صدیوں کی پیاس من کے اندر پھیل گئی ہو۔

"شہروز جی! آپ آج لنچ میرے ساتھ کر سکتے ہیں پلیز!" میں اپنے آفس میں بیٹھا بہت ضروری فائلز کے ساتھ الجھا ہوا تھا کہ مجھے خوشبو کا فون موصول ہوا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل نے کہا کہ اسے منع کردوں کیونکہ آفس میں ان دنوں کام بہت زیادہ تھا۔ کلوزنگ سیزن چل رہا تھا، کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا اور ایسے وقت میں اس طرح کی عیاشی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا مگر کیا کریں کہ خوشبو کے انداز میں اتنا مان، اتنی محبت اور اتنی التجا تھی کہ میں خود کو روک ہی نہیں پایا اور مجھے اقرار کرتے ہی بنی۔

"اں! ٹھیک ہے خوشبو، میں تمہاری خوشی کے لیے آجاؤں گا مگر یاد رکھنا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا اس لیے میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں پاؤں گا۔" میں نے اس سے وعدہ کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

"جی، جی شہروز جی! آپ چاہیں تو تھوڑی دیر بعد ہی واپس چلے جایئے گا۔ مجھے تو بس آپ سے ملنا، آپ کو دیکھنا ہی ہے۔ آپ کتنے دنوں سے آئے ہی نہیں ملنے مجھ سے۔ میرا بہت دل چاہ رہا ہے آپ کو دیکھنے، آپ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے کو۔ آپ بس تھوڑا سا وقت میرے ساتھ گزار لیں گے تو میں مطمئن ہو جاؤں گی۔" اس کی باتیں میرا دل بے چین کر گئی تھیں۔ میرے لیے باقی کا وقت آفس میں گزارنا مشکل ہو گیا تو میں وقت سے پہلے ہی وہاں سے نکل آیا۔

"خوشبو! جنید کہاں ہے وہ آج آفس بھی نہیں آیا۔ اس وقت بھی وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" مجھے اس کے پاس بیٹھے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا اور اس دوران جنید کا نہ تو ذکر آیا تھا اور نہ ہی وہ خود نہیں نظر آرہا تھا۔ اب وہ اکثر آفس سے چھٹی مارلیا کرتا تھا۔ کبھی کام آدھا ادھورا چھوڑ کر ہی غائب ہو جاتا اور بعض اوقات تو اس کی آفس ٹیبل پر کام اور فائلز کا انبار لگ جاتا مگر اسے کسی قسم کی کوئی پرواہ ہی نہ ہوتی۔ ایسے وقتوں میں اس کا سب سے آسان حل وہ یہ نکالتا کہ خوشبو کی سفارش ڈلوادیتا اور میں صرف اور صرف خوشبو کی خاطر اس کا کام آفس میں اس طرح تقسیم کرواتا پھرتا کہ کسی کو شک بھی نہ ہو اور کام بھی ہو جائے مگر یہ میری شاید خام خیالی ہی تھی۔ میں جس پوسٹ پر بیٹھا تھا وہاں تو اس قسم کی ہیرا پھیریوں کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ ہی گنجائش مگر میرا نچلا اسٹاف سب سمجھتا اور جانتا تھا۔ انہیں جب اپنے کام کے ساتھ ساتھ جنید کے حصے کا بھی اضافی کام کرنا پڑتا تو وہ ناک بھوں تو ضرور چڑھاتے مگر میرے رعب کی وجہ سے کچھ

نہ پاتے۔ اب ہمارے آفس کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔ شاید جنید کی دیکھا دیکھی سب کو ہی آکو دھاپ پڑ چکی تھی اور پھر آج کل ہیڈ آفس سے بھی روز کی بنیاد پر نت نئے احکامات جاری ہو رہے تھے اور اس لیے بھی دفتر میں ایک سراسیمگی کا عالم تھا اور ایسے میں جنید صاحب کا وہی حال تھا۔ دل کیا تو کام کیا نہیں دل کیا تو خوشبو یا پری بھابی سے ایک فون کروالیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ مجھے ایک دم اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو میں خوشبو سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''جنید تو پشاور گئے ہوئے ہیں شہروز جی۔ ان کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے انہیں جانا پڑا۔ ایک دو دن تک آ جائیں گے واپس۔'' میرے سامنے سلاد کی ڈش بڑے انداز سے رکھتے ہوئے اس نے کچھ اس ادا سے کہا کہ میں اس کے ناز و انداز میں ہی کھو کر رہ گیا۔ وہ اس وقت سیاہ شیفون کی باریک اور نفیس سی ساڑھی میں ملبوس تھی جس پر ننھے منے اسٹونز ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اس کے لمبے سیاہ لہراتے بال اس کی پشت پر آبشار کی مانند پھیلے ہوئے تھے۔ بے حد خوب صورتی سے کیا گیا نفیس میک اپ اس کی خوبصورتی کو دو چند کر رہا تھا۔ میرے نگاہیں بار بار بھٹک رہی تھیں۔ وہ لہراتی بل کھاتی جس طرف جاتی میری نظریں اس کے تعاقب میں اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں اور شاید اپنے بھٹکتے دل و دماغ کو ہی قابو میں رکھنے کے لیے میں نے جنید کا پوچھا تھا مگر خوشبو کے جواب نے مجھے حیران ہی کر دیا۔

''کیا مطلب؟ جنید پشاور گیا ہے اور وہ بھی آفس میں بغیر بتائے؟ اور تم...... تمہیں یہاں اکیلی وہ کس کے سہارے چھوڑ گیا ہے۔ عجیب لاپرواہ بندہ ہے۔ آنے دو ذرا اس کی تو اچھی خاصی کلاس لینی پڑے گی مجھے۔'' میں ایک دم غصے میں آ گیا تھا۔ بھئی ظاہر ہے جی ایم تھا میں آفس کا اور جنید میرا جونیئر ایمپلائی اور اس پر اس کے انداز......! غصہ تو بہرحال مجھے آنا ہی تھا۔

''آپ...... آپ ہیں ناں میرا خیال رکھنے کے لیے۔ وہ مجھے آپ کے سہارے ہی تو چھوڑ گیا ہے شہروز جی۔'' وہ اک ادا سے بل کھاتی آئی اور میرے بالکل قریب بیٹھتے ہوئے میری آنکھوں میں اپنی نشیلی آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی کہ میری بولتی بند ہو گئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے خوشبو! مگر تم خود سوچو کہ تمہیں اس طرح اس اجنبی شہر اور اجنبی جگہ پر اکیلی دیکھ کر اگر کوئی تمہیں نقصان پہنچا دے تو پھر......!''

''نہیں شہروز جی! آپ کے ہوتے ہوئے میرے لیے نہ تو یہ شہر اجنبی ہے اور نہ ہی یہ جگہ اور پھر مجھے کوئی نقصان کیسے پہنچ سکتا ہے جب میں اپنے گھر اور دل کے دروازے صرف اور صرف آپ کے لیے ہی کھولتی ہوں۔''

ایک بار پھر اس کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور اسی ناز و انداز سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اس نے تھوڑی دیر میں ہی کھانا لگا دیا اور مجھے ہاتھ پکڑ کر ٹیبل تک لے آئی۔ اس نے بڑی محبت اور اصرار سے مجھے کھانا کھلایا۔ میں بھی اسے خوش کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کرتا گیا اور اس کے ہاتھوں سے نوالے کھاتا گیا۔ آج شاید کوئی خاص دن تھا یا پھر شاید میرے دماغ میں شیطان نے یہ خیال ڈال دیا تھا اس وقت ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی نہیں اور میں جو چاہوں اس حسینہ کے ساتھ کر سکتا ہوں کہ مجھ پر تو یوں بھی کوئی الزام نہیں آئے گا کہ مجھے فون کر کے بلانے والی بھی یہ قیامت خود ہی تھی مگر میں شاید یہ بھول گیا تھا کہ ایک ایسی ہستی ہر وقت میرے ساتھ موجود رہتی ہے جو میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ میرے دل کا حال تو جانتی ہی ہے، وہ تو میرے ارادوں اور سوچوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے اور اس ہی ہستی نے جیسے میری آنکھوں پر پڑے غفلت کے پردوں کو چاک کرنا تھا جو یہ سب کھیل رچایا گیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خوشبو نے میری فرمائش پر مجھے پشاوری قہوہ پیش کیا۔ میں ابھی پیالی ٹھیک طرح سے پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ جانے کیسے اس کے ہاتھ کانپے اور گرم گرم قہوہ میرے اوپر گر گیا۔ میں ایک دم بوکھلا کر اٹھا تو وہ بھی گھبرا گئی۔

''اوہ...... اوہو...... شہروز جی! یہ کیا ہو گیا۔ آپ...... آپ پلیز میرے ساتھ آئیں، میں کچھ کرتی ہوں۔'' میرے سے زیادہ تو وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اس لیے میں صرف اس کی تسلی کے لیے اٹھ کر اس کے ساتھ چلا آیا ورنہ قہوہ نہ تو اتنا گرم تھا کہ مجھے جلا پاتا اور نہ ہی

میں اس قدر نازک تھا کہ ذرا سی جلن نہ برداشت کر پاتا۔ وہ مجھے لیے ہوئے سیدھی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ ہمارے آپس کے روابط کو ڈھائی تین سال ہونے کو آئے تھے مگر آج پہلی بار میں اس کے بیڈروم میں آیا تھا اور اب عجیب قسم کے احساسات کا شکار ہو رہا تھا۔

''شہروز! آپ یہاں بیڈ پر لیٹ جائیں میں آپ کے پاؤں اور ٹانگ پر برنال لگا دیتی ہوں۔ آپ پلیز......!'' اس نے بیڈ پر ترتیب اور نفاست سے رکھے تکیے اور کشن ٹھیک کرتے ہوئے کہا اور پھر میرا جواب سنے بغیر ہی مجھے پکڑ کر زبردستی لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ مجھے لٹاتے ہوئے وہ مجھ پر جھک سی گئی اور اس کی ساڑھی کا پلو اس کے شانے سے ڈھلک کر میرے سینے پر گرتا چلا گیا۔ ایک لمحہ لگا تھا۔ بس ایک لمحہ...... اور شیطان میرے حواسوں پر پوری طرح قابض ہوتا چلا گیا۔ اس کے مہکتے وجود سے اٹھنے والی خوشبو مجھے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔ میں نے بے ساختہ اسے شانوں سے پکڑا اور ہلکا سا جھٹکا دینے کی دیر تھی وہ کسی شاخ کی طرح میرے اوپر ڈھیر ہو چکی تھی۔ میرے ہاتھ سرسراتے ہوئے اس کے بالوں کے ریشم سے الجھ رہے تھے تو سانسیں اس کی قربت کی وجہ سے دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ وہ ذرا سا کسمسائی اور اور بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی مجھ سے اپنا آپ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی اور زیادہ میرے قریب ہوتی چلی گئی۔ میرے حواسوں پر ایک عجیب سا نشہ چھا رہا تھا۔

''شہروز صاحب! آپ نے کبھی کنول کا پھول دیکھا ہے؟'' ایک دم اس کی سرسراتی کانپتی لرزتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں ایکدم چونک سا گیا۔

''کنول کا پھول؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو خوشبو کھل کر کہو ناں جو بھی کہنا ہے۔'' میرے حواسوں پر چھایا نشہ تو اس کی کانپتی لرزتی آواز سن کر ہی اترنا شروع ہو گیا تھا اور جو میں نے اس کی بجھی بجھی افسردہ شکل دیکھی تو رہے سہے حواس بھی ٹھکانے پر آنے لگے۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں شہروز صاحب! کنول کے پھول کے نصیب میں ہمیشہ کیچڑ ہی کیوں ہوتا، کیچڑ، دلدل، گندا پانی ہی ہمیشہ کنول کا مقدر کیوں بنتے ہیں۔ حالانکہ پھول تو پھول ہی ہوتا ہے چاہے کیچڑ کا ہو یا کنول کا۔ پھر ایک کے نصیب میں حسین باغ، باغیچے اور کیاریاں تو دوسرے کے نصیب میں جھیلیں، ویرانے، دلدلیں کیوں ہوتی ہیں؟ آپ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں شہروز صاحب؟'' وہ چہرہ اس خوشبو کا نہیں تھا جس کے ساتھ میں تھوڑی دیر پہلے شیطان کے دکھائے راستے پر چلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ چہرہ تو ایک بے کس، بے بس معصوم لڑکی کا تھا۔ میرے ضمیر نے میرے منہ پر ایسے زوردار تھپڑ مارا کہ میرا منہ ہی دوسری طرف ٹنگ گیا۔ میں خوشبو کو پیچھے پھینکتا ہوا بستر سے ایسے جمپ لگا کر اٹھا جیسے میرے نیچے نرم نرم گدا نہیں، بلکہ ایسا کانٹوں کا بستر بچھا ہو جس کے نوکیلے، زہریلے کانٹے میرے روح تک کو چھید گئے ہوں۔

''تم...... تم کہنا کیا چاہتی ہو...... اور...... تمہارا مقصد کیا تھا مجھے اس تنہائی میں مجھے بلانے کا...... بولو، بولو خوشبو...... خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ مجھے...... تمہاری اس بے تکلفی اور جنید کی اس لاپروائی کے پیچھے اصل راز کیا ہے...... بولو خوشبو...... اب تم مجھ سے کچھ مت چھپانا پلیز۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اٹھایا اور بری طرح سے اسے جھنجھوڑتے ہوئے تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ کر دی جس کی وجہ سے وہ ایک دم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

''وہ...... وہ...... سر...... وہ جنید کو پروموشن...... بس کسی بھی طرح...... کیسے بھی کر کے اسے ایک بار پروموشن......!''

اس کی اس ٹوٹی پھوٹی باتوں نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

''پر کیا...... پروموشن...... صرف ایک پروموشن کے لیے...... اف...... توبہ......!'' اور پھر میرا اس چھت کے نیچے جیسے دم گھٹنے لگا۔ میں تیزی سے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بھاگتے قدموں سے باہر نکلا اور پھر بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بس بھاگتا ہی چلا گیا۔ واپسی کے راستے میں میرے بند دماغ کی ساری گرہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ جنید کا سارا منصوبہ میری سمجھ میں آ رہا تھا اس کا پروموشن پانے کا جنون۔ اس کی خواہشیں اس کے خواب۔ اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ اس نے انہیں پانے

کے لیے اپنی غیرت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ مجھے پری کی باتیں بھی یاد آرہی تھیں جو وہ پچھلے چند دنوں سے میری حالت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے چند دنوں سے مجھ پر زور ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ میں جنید کو پروموشن دے کر اس سارے قصے کو ختم کردوں اور پہلے کی طرح اس پر اور گھر پر پوری توجہ دوں۔ کیونکہ جنید نے اب اس کو اپنی سفارشی بنالیا تھا اور اٹھتے بیٹھتے اسے اس حوالے سے تنگ کرنے لگا تھا۔ ادھر خوشبو نے میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کا نتیجہ ہی تھا کہ آج میں اس کے گھر سے بمشکل خود کو بچاتا ہوا نکل پایا تھا۔

☆......☆

"اکرام صاحب! آپ کا کیا خیال ہے، یہ مسٹر جنید کی فائل بھی پروموشن کے انتظار میں کافی عرصے سے پڑی ہے؟ اس کا کیا کیا جائے۔ از ہی ڈیزرونگ پروموشن؟" میں نے اکرام صاحب سے جنید کا مسئلہ ڈسکس کرتے ہوئے ان کی رائے پوچھی تو وہ مدبرانہ انداز میں مسکرانے لگے۔

"جی سر! آپ تو سارے حالات کا علم ہی ہے۔ جنید کا جنون ہی اسے در در بھٹکاتا آیا ہے اب تک اسی لیے اس نے کہیں ایک جگہ بھی ٹک کا کام نہیں کیا۔ اس کا جنون صرف اور صرف پروموشن ہی ہے۔ پر میرا خیال ہے اب بھی اگر اس کا یہ خواب، یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو شاید وہ پاگل ہی ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود کو کوئی نقصان پہنچا لے۔ کیونکہ یہ برانچ اس کی لاسٹ امید اور شاید آپ اس کی آخری ہوپ ہیں اس لیے اس نے اپنی ساری کشتیاں یہیں جلا ڈالی ہیں اور میرے خیال میں اب بھی اگر اسے اس کی منزل نہ ملی تو پھر وہ شاید ہمیں کہیں نہ ملے، کبھی نہ ملے۔" اکرام صاحب کی باتیں میرے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھیں۔ میں نے جنید کی فائل اپنے سامنے کی اور اس پر پروموٹڈ کی مہر لگا کر سائن کیے اور فائل اکرام صاحب کی طرف بڑھا دی۔

"شہروز! تم نے پھر کیا فیصلہ کیا جنید کے بارے میں اس کا آج بھی فون آیا تھا، بہت پریشان تھا بے چارا۔ تم پلیز اس کی فائل پر سائن کردو اور اسے......"

"ہاں ہاں کر دیے میں نے سائن اس بے چارے کی فائل پر اور بھیج دی ہے ہیڈ آفس۔ جلد ہی اسے پروموشن لیٹر مل جائے گا تم اب اس کی فکر چھوڑو اور میری فکر کرو۔" میں جو بڑے عرصے کے بعد اپنے کمرے میں خود کو ذہنی طور پر موجود سمجھ رہا تھا اور ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری میں گھرا ہوا تھا کہ پری کے منہ سے پھر جنید اور اس کی ترقی کا قصہ سن کر بیزار ہو گیا اور اس کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے اپنا اندازِ نشست تبدیل کرتے ہوئے اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس طرح لیٹنا مجھے بہت پسند تھا اور پری کو میرے بالوں میں انگلیاں چلانے کا بہت مزہ آتا تھا مگر جب سے ہماری زندگی میں خوشبو اور جنید آئے تھے یہ سارے مزے جیسے خواب ہی ہو گئے تھے۔ اب جو میں نے اپنی محبت کا پرانا انداز اپنایا تو پری بھی کھل کر مسکرا دی، اس کی حسین مسکراہٹ میں ہی میری زندگی تھی۔

☆......☆

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی میں نے جنید کے خلاف کوئی ایکشن کیوں نہیں لیا؟ اور اسے اور خوشبو کو ایسے کیسے چھوڑ دیا؟ نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ میں نے جنید کو ایسے ہی پروموشن نہیں دے دی تھی۔ اکرام صاحب نے ٹھیک کہا تھا۔ اس کی یہ خواہش اس کا جنون بن چکی تھی اور وہ واقعی اپنے جنون میں ہر حد پار کرسکتا تھا۔ میں نے اسے ایک بڑے بھائی کی طرح سمجھایا کہ ڈیڈی ہمیشہ کہتے ہیں کہ اپنے پیروں پر چلنے والوں کے ساتھ تو ہر کوئی چل لیتا ہے مزہ تو تب ہے جب کسی گرنے والے کو اپنے کاندھے پر سوار کروا کر چلا جائے اور یہی اصل مردانگی ہے کہ گرتے ہوؤں کو سہارا دیا جائے نہ کہ انہیں ایک آخری دھکا مار کر زمین بوس کر دیا جائے۔ بس اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا اور جنید کی سمجھ میں بھی بات آگئی اس نے مجھ سے بھی معافی مانگی اور خوشبو سے بھی اس کے پندار نسوانیت کو سب سے زیادہ چوٹ بھی تو جنید نے خود ہی پہنچائی تھی۔ وہ لوگ آج بھی ہم سے ویسے ہی ملتے ہیں میں خوشبو کو بھابی کہتا ہوں اور وہ مجھے بھیا کہتی ہے اور یہ ہم صرف زبان سے نہیں کہتے کہ رشتوں میں اگر حرمت نہ ہو تو پھر کسی رشتے کی کوئی اساس ہی نہیں ہوتی۔

اب آپ ہی بتائیے کہ میرا فیصلہ درست تھا یا غلط۔ میں آپ کی رائے کا شدت سے منتظر رہوں گا۔

☆☆☆

ساتویں داستانِ عشق

بس تھوڑی سی محبت چاہیے......

فلک شیر تابش

اُس ڈاکٹر کی داستانِ عشق، جس کی محبوبہ کو صرف اُس کی تھوڑی سی توجہ چاہیے تھی

گلابی جاڑے کی آمد آمد تھی۔ دن چھوٹے ہو رہے تھے اور راتیں لمبی۔ آج اتوار کی رات تھی صحن اور پائیں باغ کے گھنے چھتنار درختوں پر پرندوں نے بسیرا کرتے ہوئے بے پناہ شور مچا رکھا تھا۔

اس بڑی سی حویلی کا مالک میرا سگا بھائی یوسف ملک، بھابی فاطمہ اور ان کے تینوں بیٹوں نے میرا



استقبال انتہائی شاندار طریقے سے کیا۔ کیونکہ میں ان کے ہاں پہلی دفعہ چند دنوں کے لیے بطور مہمان آیا تھا۔ بھائی یوسف کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا اور وہ اسی سلسلے میں لاہور جانے کے لیے ریڈی تھے۔ باہر ڈرائیور گاڑی لیے محو انتظار تھا۔ بھائی والدین کی خیر خیریت دریافت کر کے باہر نکل گئے۔

میرا تعلق رحیم یار خان کے ایک پسماندہ علاقے سے ہے جہاں زیادہ تر آبادی ناخواندہ ہے اور زرعی لحاظ سے بھی باقی شہروں سے بہت پیچھے ہے جہاں ہماری بستی ہے وہاں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے موجود ہیں۔ بڑے بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی یہ جگہ دریا کی گزرگاہ تھی۔ جب دریا نے رخ تبدیل کر لیا تو پھر کچھ عرصہ بعد یہاں ریت نے ٹیلوں کی شکل اختیار کر لی۔

ناخواندہ سی اس بستی سے میں ہی تھا جس نے تعلیم جاری رکھی اور اب میڈیکل کالج سے فائنل ایئر کے پیپرز سے فراغت پاتے ہی شیخوپورہ چلا آیا۔ شادی کے بعد بھائی یوسف کی یہاں آکر سیٹل ہونے کی بڑی وجہ بھابی فاطمہ تھی۔ چونکہ بھابی فاطمہ یتیم تھی اور والدین کی چھوڑی ہوئی ساری جائیداد کی اکیلی وارث! اس لیے اتنی زمینوں وغیرہ کو سنبھالنا اور اتنی بڑی حویلی کی دیکھ بھال کرنا ایک عورت کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

بھابی فاطمہ ان پڑھ ہونے کے باوجود بڑی سگھڑ عورت تھی۔ اللہ نے انہیں یکے بعد دیگرے تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ بڑا بیٹا آٹھویں میں تھا اور باقی چھٹی اور چوتھی کلاس میں ساتھ والے گاؤں کے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

یہاں زیادہ تر چاول کی کاشت ہوتی ہے یا پھر لوگ مال مویشی پال کر اپنی گزر اوقات کرتے ہیں۔ یہاں عورتیں بھی زیادہ تر سیاہ لنگی باندھتی ہیں اور اوپر سے سیاہ یا سبز رنگ کی قمیض یا کرتا استعمال کرتی ہیں۔

جب میں گھر سے روانہ ہوا تھا تو میرے والدین اور مجھ سے چھوٹی بہن ارشاد نے بھابی کے علاوہ بچوں کے لیے بھی ڈھیر سارے گفٹ پیک کر دیئے تھے، جو میں نے وہاں پہنچتے ہی سب میں تقسیم کر دیئے۔ لیکن ایک سونے کی انگوٹھی میں نے سرپرائز کے طور پر رکھ لی تھی کہ جب واپسی ہو گی تو بھابی کو پہنا کر چونکا دوں گا۔

یہ اوائل نومبر کے دن تھے۔ سردی شروع ہو چکی تھی۔ اتوار کی اس اجلی دودھیا رات میں ایک دھان پان سی نوخیز لڑکی شرماتی، لجاتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی جس میں کئی طرح کے لوازمات موجود تھے۔

''سلام ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے کہا تو میرے کانوں میں جلترنگ سے بج اٹھے۔ بھابی نے اس کا تعارف کروایا۔

''یہ ہماری ملازمہ ہے۔ شازیہ نام ہے اس کا۔ اور شازو شازو ہی سارے پکارتے ہیں۔ ماں تو اس کی فوت ہو چکی ہے مگر والد ہے، وہ بھی نشہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی گھر آجاتا ہے ورنہ کئی کئی دن باہر ہی رہتا ہے۔ شازو ہمارے پاس ہی رہتی ہے۔''

شازو ایک چارپائی پر براجمان تھی اور کئی دفعہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ چکی تھی۔

''شازو جاؤ جلدی سے میرے ڈاکٹر دیور کے لیے خالص دیسی گھی کا حلوہ اور بریانی بھی لے آؤ۔'' بھابی نے اسے حکم جھاڑا تو وہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی باہر نکل گئی۔ جب وہ گرما گرم حلوہ اور بریانی ٹیبل پر رکھ رہی تھی تو میں نے اس کے حسن کو گستاخ نظروں نے دیکھا اور میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اتنی ٹھنڈک ہونے کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے کچھ قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ پندرہ سولہ کی عمر، گھنے لمبے سیاہ بال، تراشیدہ لب، دراز قد اور بدن۔ وہ مجسم حسن کی دیوی تھی مگر وہ شاید اپنی خوبصورتی سے بے نیاز اور بے پرواہ تھی۔

بھابی اور بچے دوسرے کمرے میں جا چکے تھے۔ رات دھیرے دھیرے رینگنے لگی تھی جب وہ برتن سمیٹنے کے لیے میرے کمرے میں آکر کرا کری اور چائے کے کپ اٹھانے لگی تو میں نے بادل نخواستہ اس کی سرخ و سفید کلائی کو پکڑ لیا۔

''شازو! پلیز ایک منٹ رک جائیے۔'' مارے بے بسی کے چیخ نما آواز اس کے حلق سے پھنسی پھنسی برآمد ہوئی تھی۔

"جی آپ!"

"مم...... میں۔" وہ نروس ہو کر دروازے کو تکنے لگی تھی۔

میں نے اٹھ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ وہ ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ تو گئی تھی مگر ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کی جانب جھکتے ہوئے سراسیمگی سے جھکی نگاہوں کو دیکھا، مارے گھبراہٹ کے گھنیری لرزتی پلکیں اسے مزید خوبصورت بنا رہی تھیں۔ اس کی زندگی میں ایسا شاید پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک اجنبی کی سنگت میں تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر اسے پریشان کر رہا تھا مگر وہ خود پر کنٹرول کرتی رہی۔ آنکھوں کی گستاخیاں تھیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک ہمارے درمیان گھمبیر خاموشی حائل رہی۔

"آپ بولتی نہیں ہیں؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے چھیڑا، کیونکہ یہ میرا بھی کسی لڑکی کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے کا پہلا موقع تھا۔ حالانکہ میڈیکل کالج میں کئی لڑکیوں نے مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں پتھر تھا نہ پگھل سکا۔ آج نہ جانے اس دیہاتی، بھولی بھالی شاذو جو پیار کے لفظ سے بھی ناآشنا تھی، کو دیکھ کر یوں لگا تھا جیسے یہی میری منزل ہے۔ پلکوں کی چلمن اٹھی اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر صاحب! میں جاؤں؟ مالکن بہت سخت ہے۔ اگر اسے میرے یہاں ہونے کا علم ہو گیا تو وہ میری جان نکال لے گی۔"

جب وہ مجھ سے جانے کی اجازت مانگ رہی تھی تو اس کا دل بے ہنگم طریقے سے دھڑکا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر نکلنے والی تھی کہ میری آواز پر رک گئی۔

"شازیہ! آپ بہت حسین ہیں۔" میری اس پذیرائی پر وہ مسکرائی تھی۔ اس کے موتیوں جیسے سفید دانت یوں شربتی لبوں سے نظر آئے تھے جیسے یک لخت ساری کلیاں کھل اٹھی ہوں۔

رات اس دل نشین شاذو کی یادوں میں گزری۔ رات دن میں تبدیل ہونے لگی تھی جب نیند نے مجھے آغوش میں لیا اور جب جاگا تو سورج چڑھ آیا تھا۔

دیسی گھی سے بنے پراٹھے ساتھ دیسی انڈوں کا آملیٹ جسے بھابی نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر شاذو کے ہاتھوں کمرے میں بھجوا دیا تھا۔ ناشتا میز پر رکھ کر وہ جانے لگی تو بے ساختہ میرے منہ سے "شاذو جان" نکل گیا۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔ غیر شعوری طور پر سر کو خم دیتے ہوئے ایک آسودہ احساس اس کے چہرے پر آ گیا اور وہ باہر نکل گئی۔

دوپہر کو بھائی صاحب بھی واپس پہنچ گئے تھے۔ پھر حویلی کے باغ میں جو محفل شروع ہوئی تو پورا گھر قہقہوں سے گونجتا رہا۔ شاذو وہاں موجود نہیں تھی۔ شاید وہ غسل کرنے باتھ روم میں تھی۔ جب وہ نہا کر باہر نکلی تو میری نگاہیں غیر ارادی اس پر اٹھ گئیں۔ سبز رنگ کے لباس میں وہ کوئی حور پری لگ رہی تھی۔ ڈریس کی مناسبت سے اس نے اپنے خوبصورت پاؤں میں کھسہ نما جوتا پہن رکھا تھا جو بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

شاذو کو بھابی فاطمہ کی طرف سے چائے کا آرڈر مل چکا تھا جو اس نے چند منٹوں میں ہی پورا کر دیا۔ یہ آغاز محبت کا اثر تھا یا واقعی چائے میں ایسی مٹھاس اور ذائقہ تھا کہ میں نے دو کپ پی ڈالے۔

مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ شازیہ کے دل میں پیار کی جو شمع میں نے جلائی ہے وہ روشن ہو چکی ہے۔ اس کا بار بار مجھے دیکھنا اور اس کے معصوم لبوں کی مسکراہٹ، پیار کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ رات بھی میں نہ سو سکا۔ ایک عجیب سی بے چینی نے میرے وجود کا احاطہ کیے رکھا۔ دماغ سن ہو چکا تھا۔ مجھے اپنا جسم برفیلی آہٹوں میں منہدم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ بار بار شاذو کا سراپا آنکھوں میں گھوم جاتا۔

بچے اسکول روانہ ہو چکے تھے۔ بھائی یوسف اور بھابی فاطمہ لاہور نکل گئے۔ انہوں نے بچوں کے لیے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ فاطمہ بھابی نے جاتے جاتے شاذو کو بتا دیا تھا کہ تابش کا خیال رکھنا۔ دیسی مرغ کی بریانی اور کشمیری چائے انہیں ضرور دینا...... وغیرہ وغیرہ۔ جس کے جواب میں اس نے سر ہلا دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے شاذو سے کہا کہ وہ کچھ نہ کرے بس میرے سامنے آ کر میرے پاس بیٹھ جائے۔

میری ریکوئیسٹ پر وہ کچھ بوکھلا سی گئی تھی۔ لیکن میرے ہاتھ جوڑنے پر وہ مان گئی اور ڈرائنگ روم میں اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بے حد نرمی سے میں نے اس کی شیشے جیسی کلائیوں کو پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ بہت ڈر رہی تھی۔

''شازو! میں ہمیشہ لڑکیوں سے کتراتا تھا۔ تم میں کوئی غیر معمولی چیز ایسی ہے، کوئی بات ایسی ہے جو میری روح تک کو تمہاری طرف کھینچ رہی ہے۔ میری آنکھوں کی سچائیاں پڑھو شازیہ۔ میں تمہارے سر کا آنچل بننا چاہتا ہوں۔''

میرے مضبوط ہاتھوں کا لمس پا کر اس کی دلفریب آنکھوں میں پیار کی قندیلیں روشن ہو رہی تھیں۔ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیاں بن رہے تھے۔ اس کے انگ انگ سے اٹھنے والی مسحور کن خوشبو پاگل کیے جا رہی تھی۔

''ڈاکٹر تابش...'' وہ بولی تو ہلکا سا ارتعاش اس کی آواز میں تھا۔ ''مالکن فاطمہ نے آپ کے آنے سے پہلے ہی مجھے آپ کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا کہ آپ بہت شرمیلے ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہو۔ جب پہلی نظر آپ کو دیکھا تھا تو مجھے آپ بہت اچھے لگے تھے۔ مگر آپ کہاں اور میں کہاں....'' وہ کچھ بجھ سی گئی تھی۔

''نہیں شازیہ.... میں تمہیں ان فرسودہ روایات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا۔''

''پلیز تابش۔'' وہ میرے پاؤں پکڑنے لگی تھی جیسے کوئی پجارن اپنے دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر اس کی پرستش کرتا جا رہی ہو۔

''میں ایک نچلی اور غریب باپ کی اولاد ہوں اور آپ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔'' اس کی آواز میں دکھ بھری بے بسی امڈ آئی۔ وہ خاموشی سے گیلی لکڑی کی مانند سلگتے دل کی دھرتی پر آنسو گراتی رہی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی بے چینی اور گھبراہٹ کو میں محسوس کر رہا تھا۔ بمشکل رکے ہوئے آنسو اچانک اس کی پلکوں کی اوٹ سے باہر چھلک آئے اور پھر ان پر بند باندھنا میرے لیے کافی مشکل ثابت ہوا۔ اچانک باہر گیٹ پر دستک ہوئی۔ شازو نے گیٹ کھولا تو دونوں بچے اسکول سے واپس آ چکے تھے۔ وہ سیدھے میرے پاس ہی آ گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد میرے بھائی کا بڑا بیٹا بھی اپنی بائیک سمیت گھر میں داخل ہوا۔ ہم سب نے بریانی اور کشمیری چائے سے دل بہلایا مگر شازو نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔

اچانک ہی موسم تبدیل ہوا تھا ہوائیں کچھ تیز چلنے لگی تھیں اور آسمان پر بادل منڈلانے لگے تھے مگر ابھی تک بارش کی کوئی بوند زمین پر نہیں گری تھی۔ شازو جلدی جلدی گھر کا سامان اندر کی طرف سمیٹ رہی تھی۔ بچے باہر موسم کا لطف لینے جا چکے تھے۔ وہ کچن میں تھی کہ میں نے اچانک اسے ڈرا دیا۔ وہ کسمسائی مگر جلد اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ تابش کوئی ایسی نازیبا حرکت نہیں کرے گا جو گناہ کی دلدل میں دھکیل دے۔ اس کی غزالی آنکھوں میں باریک سی نمی پھیل رہی تھی۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب جذبات پر کنٹرول نہیں رہتا لیکن میرے لیے محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے جسے اپنی تسکین پانے کے لیے استعمال کرنا گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔

''شازیہ! میں تمہیں عنقریب خوشخبری سناؤں گا۔ بس اپنے من میں میرے لیے جگہ بنا لو۔'' اس نے پلکیں جھکا کر آمادگی کا اظہار کیا تو میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ چند لمحوں تک یہ کیفیت برقرار رہی تھی کہ اچانک ہی آسمان سے بجلی کی کڑک بلند ہوئی اور بوندا باندی ہونے لگی۔ جب میں ڈرائنگ روم کی طرف جا رہا تھا تو اس کے چہرے پر موجود شفق کی سرخی نے اس کے اندر کا پیار ظاہر کر دیا تھا۔ شام کے قریب بھائی اور بھابی بھی گھر پہنچ گئے تھے۔ اس سال چاول کی فصل پر بہار خوب جم کر آئی تھی۔

☆.....☆

دھان کے بھرے بھرے اور سرسبز و شاداب کھیت لہلہاتے ہوئے بہت حسین لگ رہے تھے۔ بھائی مجھے صبح ہی صبح فصلیں دکھانے لے گئے تھے مگر میرا ذہن تو شازو میں الجھا رہا۔ پھر انہوں نے مجھے بھینسوں کا باڑہ اور پوری حویلی کا بیرونی حصہ دکھایا۔ اندرونی حصہ تو میں تفصیلاً دیکھ چکا تھا مگر پھر بھی بھائی

کے اصرار پر ہر کمرہ دیکھا گیا۔ بڑے بڑے تخت پوشوں پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ فرش پر ایرانی کارپٹ اور ہر کمرے میں قیمتی فانوس آویزاں تھے۔ باغ میں مالی پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھا۔ اس سے بھی میرا تعارف ہوا۔

''یہ میرا چھوٹا بھائی فلک شیر تابش ہے۔ رحیم یار خان سے ملنے آیا ہے اور عنقریب ڈاکٹر بننے والا ہے۔''

''سلام صاحب۔'' مالی نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

بھابی اور شازو کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ میں بڑی محویت سے شازو کو دیکھ رہا تھا۔ اس سادہ سی، پرکشش دل رکھنے والی لڑکی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ جی چاہتا کہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں چھپا کر کہیں دور لے جاؤں جہاں پیار کے سوا کچھ نہ ہو۔

دن گھنٹوں میں اور گھنٹے منٹوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ پورے دس دن گزر چکے تھے مجھے آئے ہوئے اور پانچ دن بعد مجھے واپس جانا تھا۔

بھابی فاطمہ جہاں ایک سگھڑ سمجھ دار خاتون تھیں وہیں ذہین اور نظریں چار رکھنے والی بھی تھیں۔ کہتے ہیں عشق اور مشک کبھی نہیں چھپتا۔ بھابی کافی کچھ سمجھ گئی تھیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ انہوں نے شازو سے ہماری محبت سے متعلق بہت کچھ پوچھا تھا اور وہ ہوں ہاں کرتی رہی تھی۔

''شازو! کان کھول کے سنو....'' بھابی نے کہا۔ ''کیا میرا دیور تجھے شادی کا عندیہ دے چکا ہے؟ حالانکہ بچپن میں ہی اس کے ماموں کی بیٹی کنول تابش سے منسوب کر دی گئی ہے۔'' شازو کی زبان سوکھ گئی۔ سختی سے جڑے ہوئے ہونٹوں کو جنبش ہوئی، ہاتھ کانپ گئے اور اس کی رنگت ایک دم پھیکی پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بے قراری سے آنسو کروٹیں لینے لگے۔ آنکھوں کے کنارے بھیگے، لبوں کے گوشے کئی مرتبہ تھرتھرائے۔ پھر اس نے بھابی کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ بھابی فاطمہ نے ابھی تک مجھے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

☆....☆

بادل آج بھی زور سے برسے تھے۔ بھائی اور بھابی فصلوں کی طرف نکلے تھے اور بچے اسکولوں کی طرف۔ شازیہ خود ہی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹی پھوٹی اور بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے رتجگے نمایاں تھے۔ وہ کب سے گم صم بیٹھی تھی اور بار بار آنسو گلا رندھ رہے تھے۔ عجیب اضطرار تھا اس کے چہرے پر۔

''تابش! تم بے انتہا حسین انسان ہو۔ تمہارا معیار بہت بلند ہے، ہونا بھی چاہیے۔ کنول کے ہوتے ہوئے مجھ عام سی لڑکی کو تم کیونکر پسند کرتے۔ میں ہی پاگل لڑکی ایسی اوٹ پٹانگ سوچیں سوچنے لگی تھی.... میں.... میں پاگل۔ مجھ جیسی لڑکیاں ان دیکھے خوبصورت راہ گزاروں پر چل نکلتی ہیں لیکن ہمیشہ کے لیے زار خار جھاڑیوں سے خود کو لہولہان کر لیتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں کر بیٹھتے ہیں ہم....'' اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر رخساروں پر پھیل گئے۔ اس وقت وہ اضطراری کیفیت سے گزر رہی تھی۔ شازو نے بھابی فاطمہ کی باتیں میرے گوش گزار کر دی تھیں۔

''شازیہ میں تمہارے لیے واقعی سنجیدہ ہوں۔ کنول سے میرا ایسا کوئی ناتا نہیں۔ وہ میری کزن ضرور ہے مگر میں نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ بچپن کے جاہلانہ فیصلوں کو میں تسلیم ہی نہیں کرتا۔ میں بھابی فاطمہ کے علاوہ بھائی اور اپنے ماں باپ کو بھی راضی کروں گا۔ تمہارا ساتھ پا کر، تمہارا قرب حاصل کر کے زندگی کتنی خوبصورت ہو گئی ہے، یہ میں ہی محسوس کر سکتا ہوں۔'' میں نے دل کی گہرائیوں اور سچائیوں سے اسے سب کچھ کہا تھا۔

رات کو میں نے بھابی فاطمہ سے تفصیلاً بات کی تھی۔ چونکہ وہ مجھے بہت چاہتی تھیں اس لیے جلد ہی مان گئی۔

''دیکھ لو تابش بیٹا! زندگی ایک بار ملتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پشیمانیوں کے موسم تمہارے اندر گھر کر جائیں۔'' وہ مجھے دیر تک سمجھاتی رہی لیکن مجھے تو شازیہ کے علاوہ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا بھابی جی۔'' میں شازو کو اتنی

خوشیاں دوں گا کہ وہ پچھلی ساری محرومیاں اور سارے دکھ بھول جائے گی۔''

''کنول اور ماموں کیا سوچیں گے؟'' بھابی نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

''یہ آپ میرے اوپر چھوڑ دیں کیونکہ زندگی میں نے گزارنی ہے..... پلیز بھابی! آپ شازیہ کو اپنی بیٹی ہی سمجھیں۔ میری اس امانت کو آپ اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔ جونہی حالات سازگار ہوئے میں اسے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔'' جہاں بھابی رضامند ہوئیں وہاں بھائی یوسف کو اس خبر سے بہت خوشی ہوئی۔ بلکہ اس خوشی پر تو وہ فوراً ایک من لڈو منگوا کر بچوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ وہ تو رسم منگنی بھی ادا کرنا چاہتے تھے مگر میں نے روک دیا۔

یہ خبر جب شازو نے سنی تو اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ بھابی نے شازو سے کہا۔

''بیٹی! مجھے معاف کر دینا، تمہارا پیار سچا ہے۔ میں نجانے غصے میں کیا کیا کہہ گئی تھی تجھے۔ ٹاٹ کا پیوند مخمل میں کبھی نہیں لگتا لیکن تابش نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان سب برابر ہیں۔ کسی کو خاندانی لحاظ سے برتری نہیں ہوتی۔'' خوشی کے مارے شازو کے تو پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ جب رات کو مجھے کھانا دینے آئی تو اس کے گلنار چہرے پر دھنک کے سارے رنگ موجود تھے۔ چہرے پر جھولتی بالوں کی لٹ کو میں نے چھوا اور ہلکی سی پھونک ماردی۔ بال اس کے چہرے پر سرسرائے۔

''ہوں.... ہوں یہ کیا حرکت ہے۔'' وہ بولی اور پھر پیار بھرا بوسہ میں نے اس کی چمکتی پیشانی پر ثبت کر دیا اور ساتھ ہی لبوں پر یہ بول آگئے۔

''بخش دینا پیار کی گستاخیاں..... دل ہی قابو میں نہیں ہم کیا کریں۔''

وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆......☆

آج وہاں میری آخری رات تھی۔ صبح مجھے رحیم یار خان کے لیے روانہ ہونا تھا اور اس رات کو میں شازو کی قربت میں گزارنا چاہتا تھا۔ مگر وہ مان نہیں رہی تھی۔

''مت ماری گئی ہے تمہاری تابش۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''کچھ نہیں ہوگا جان۔ میں ہوں نا، سب سنبھال لوں گا۔'' میں نے اسے حوصلہ دیا تو اس نے ہتھیار پھینک دیے۔

سرد ہوا سرشام ہی چلنا شروع ہوگئی تھی۔ پام اور سرو کے قد آدم دیوہیکل درخت کسی دیو کی طرح جھوم رہے تھے۔ جاڑے کی اس ڈھلتی ہوئی خوبصورت سرمئی شام جب اندھیری رات میں تبدیل ہو چکی تو شازیہ سبک خرامی سے چلتی ہوئی اندر آگئی۔ اس کے شربتی لبوں پر مسکان تھی۔ وہ اس پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ ہی وہ میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں نے کمرہ بند کر دیا تھا اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آتے ہی میں نے اس کی شبنمی آنکھوں میں جھانکا جہاں پیار کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ نازک تتلی اپنا سب کچھ مجھ پر قربان کرنے کو تیار تھی۔

''عورت جب کسی سے پیار کرتی ہے تو صرف ایک بار اور وہ بھی ٹوٹ کر۔'' ایک ان پڑھ دیہاتی لڑکی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ شازو عام لڑکیوں سے ہٹ کر ہے۔

''تابش..... میں تیری ہوں اور ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی۔ زندگی وفا کرے نہ کرے میں نے تمہارے پیار کا تاج محل بنالیا ہے جس میں ہر وقت محفوظ ہوں..... تم اپنی چاہت کو سولی پر لٹکنے کے لیے تنہا چھوڑے جا رہے ہو۔'' وہ خاصی پریشان اور مغموم تھی۔

''جانِ تابش! میں بہت جلد تمہیں اپنالوں گا۔ سال چھ مہینے میں ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ میں تمہیں الگ بنگلہ بنوا کر دوں گا۔''

''اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ میں جھونپڑی میں بھی گزارا کر سکتی ہوں۔ بس تم ابھی نہ جاؤ۔'' اس کا لہجہ اٹل فیصلہ لیے ہوئے تھا۔ میں اس کی اداسی سے بہت پریشان تھا۔ بار بار اسے تسلیاں دیتا رہا۔

''میں جب واپس تمہیں لینے آؤں گا تو ہم جا کر ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے جہاں ہمارے بچے

ہوں گے، گھر ہوگا اور..... اور.....''

''بس کرو تابش..... بس کرو.....'' اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں رک رہے تھے جو اس کے چاند چہرے کو گیلا کرنے لگے تھے۔

وہ قیامت خیز رات باتیں کرتے کرتے گزر گئی۔ اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ جب فجر کا وقت ہوا تو وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا عہد لے چکی تھی اور مجھے پکا قول دے چکی تھی کہ وہ زندگی میں کیا مرنے کے بعد بھی میری ہی رہے گی۔

جاتے ہوئے میں نے اس کی مخروطی انگلی میں سونے کی رنگ ڈال دی جو میں نے اتنے دن سے محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ وہ انگوٹھی کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے تیزی سے باہر چلی گئی۔

میرا واپسی کا سارا سامان پیک ہو چکا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ بھائی یوسف بھی مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے اور یوں میں بارہ گھنٹوں کی مسافت طے کر کے میں اپنے ماں باپ کے پاس بیٹھا تھا۔

☆......☆

وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا۔ رزلٹ آؤٹ ہوتے ہی مجھے نشتر اسپتال ملتان تعینات کر دیا گیا اور میں مریضوں میں ایسا گم ہوا کہ شاذو کی یادیں دل سے محو ہو گئیں۔ پورے تین سال گزر چکے تھے۔ وقت اتنی تیزی سے گزرے گا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ ادھر میری شادی کے لیے زور دیا جا رہا تھا۔ میں جب بھی گھر جاتا امی اور ابو کی ایک ہی رٹ ہوتی کہ تابش بیٹا! کنول نے اب ایم بی اے کر لیا ہے اور ماموں چاہتے ہیں کہ اب کنول کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔''

کئی دنوں سے مجھے شاذو کی بھولی بسری یادیں ستانے لگی تھیں۔ انجانے وسوسوں اور اندیشوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ وہ بیچاری نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ میری راہ تکتے تکتے کہیں وہ مر ہی..... اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔ پھر اچانک میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی... میں ایک حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ شاذو کو اپنانے کا فیصلہ.....

میرے اس فیصلے سے سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ماموں جان بہت غصے میں تھے۔ کنول نے بھی رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ کہتے ہیں لگن سچی ہو تو انسان ضرور منزل پا جاتا ہے۔

آج رات میں نے عجیب خواب دیکھا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''خزاں کے دیس سے آنے والی ہواؤں کا نہ پتا پوچھتے ہیں اور نہ ہی انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مایوسی بھری چادر کو خود پر سے اتار دو۔ بہاریں آپ کی منتظر ہیں، ورنہ..... ورنہ پچھتاوے کی آگ میں ہمیشہ جلتے رہو گے۔''

☆......☆

آج صبح سویرے میری گاڑی کا رخ ملتان سے سیدھا شیخوپورہ کی طرف تھا۔ دل میں عجیب سی بے کلی تھی۔ میری چھٹی حس پکار پکار کر کسی آنے والے طوفان کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

فیصل آباد پہنچنے پر اچانک ہی ڈاکٹر ریحان کا خیال دل میں آ گیا۔ ریحان اور میں نے اکٹھے ہی ایم بی بی ایس کیا تھا اور آج کل وہ الائیڈ اسپتال فیصل آباد میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں نے سوچا ریحان کو ملتا چلوں۔ آگے دو گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ شام سے پہلے شیخوپورہ پہنچ جاؤں گا۔

جب میں ریحان سے ملا تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ آج اس کی اسپتال میں نائٹ ڈیوٹی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ میں یہ رات اس کے ساتھ گزاروں۔

''یار ڈاکٹر تابش! اتنے عرصے بعد ملے ہو، چند گھنٹے ہمیں بھی دے دو۔ صبح چلے جانا..... پلیز یار.....'' اس نے اس انداز میں رکنے کو کہا تھا کہ میں نے رکنے کا فیصلہ کر لیا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ پھر اس نے اپنی شادی کی تفصیل سنائی۔ وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔

میری شادی کے متعلق سوال پر وہ حیران ہوا تھا۔

''یار! تو ابھی تک اکیلا ہے؟'' میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی تمہاری ہونے والی بھابی کم عمر ہے۔

ابھی ہماری باتیں جاری ہی تھیں کہ فیملی وارڈ کی نرس کے فون نے ڈاکٹر ریحان کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں شاید کسی مریض کی حالت درست نہیں تھی اور نرس

نائٹ ڈیوٹی ڈاکٹر کو وارڈ میں بلا رہی تھی۔

''چل یار ریحان! میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔'' اور یوں ہم دونوں ٹی بی سیل وارڈ میں اس مریضہ کے بیڈ پر پہنچے جس کی فائل پر بیڈ نمبر ۵ لکھا ہوا تھا۔ جب میری نام پر نظر پڑی تو میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رپورٹس میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ سے نیچے گر گئی، جنہیں میں نے جلدی سے اٹھایا۔ شازیہ نام لکھا تھا فائل پر، عمر بیس سال اور جو ایڈریس تھا اسے دیکھ کر میرے پاؤں سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

وہ اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کا سانس بہت تیز چل رہا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھی، وہ میری اپنی شازو تھی جسے میں نے تین سال پہلے اپنے دل کی دھڑکنوں میں سمو لیا تھا۔

آج جسے میں اپنی دلہن بنانے جا رہا تھا وہ بستر مرگ پر لیٹی ہوئی زندگی کی سانسیں پوری کر رہی تھی۔

میرے ماتھے پر پڑی تفکرات کی شکنیں اور چہرے پر فکرمندی کے اثرات دیکھ کر ریحان بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ مریضہ سے میرا واسطہ ضرور ہے۔ میرے پاؤں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں دھنستے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں گر جاتا، ڈاکٹر ریحان نے مجھے تھام لیا۔ میرے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات اس کے گرد اپنا حصار تنگ کر رہی ہے۔

ریحان نے فوراً گاڑی منگوائی اور مجھے اپنے دفتر لے آئے اور نرس کو فون پر سخت آرڈر دیتے ہوئے کہا کہ ''بیڈ نمبر ۵ والی مریضہ کو فوراً شعبہ انتہائی نگہداشت میں شفٹ کرو۔'' اس نے چیسٹ فزیشن کو ایمرجنسی کال کر دی تھی کیونکہ جب ہم آئی سی یو میں پہنچے تھے تو چیسٹ فزیشن کے ساتھ اور بھی ڈاکٹرز مریضہ کی جان بچانے میں مشغول نظر آئے۔ وہ بیہوش تھی، شاید کومے میں تھی۔ پھر ڈاکٹرز کے متفقہ فیصلے سے اسے وینٹی لیٹر پر ڈال دیا گیا۔ مصنوعی سانس کا یہ آلہ مریض کی زندگی بچانے کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ چونکہ شازیہ کو پھیپھڑوں میں ٹی بی آخری اسٹیج پر تھی اور اسے سانس لینے میں بہت دشواری ہو رہی تھی اس لیے ضروری تھا کہ اس کا سانس بحال کیا جائے۔

وہ رات میں نے سجدوں میں گزاری۔ میں رب کے حضور شازو کی زندگی کی دعائیں گڑگڑا کر مانگتا رہا۔ صبح بھائی یوسف اور بھابی فاطمہ بچوں سمیت پہنچ چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ پھر میرے گلے لگ کر دیر تک روتے رہے۔ بھابی فاطمہ نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی۔

''تابش بیٹا! جب سے تم شازو کے دل میں پیار کے دیپ جلا کر گئے اس دن سے وہ کافی اداس رہنے لگی تھی۔ دو سال بعد اس کا باپ بھی مر چکا تھا۔ اس دن وہ بہت روئی تھی۔ اس نے مجھے کئی مرتبہ آپ سے رابطہ کرنے کو کہا تھا۔ ہم نے آپ کی طرف دو تین دفعہ ٹیلی گرام بھجوائے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ (یہ جس زمانے کی بات ہے تب ٹیلی فون کا دور تو تھا نہیں۔) پھر ایک دن اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ جب ایکسرے کروایا تو پتہ چلا کہ پھیپھڑوں میں پانی ہے جو ٹی بی کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہم نے اسے پھر اچھے سے اچھے ڈاکٹرز کو دکھایا مگر رزلٹ زیرو ہی رہا۔ آج سے پانچ دن پہلے یہاں الائیڈ اسپتال میں اسے داخل کروایا ہے۔ باقی حالات آپ کے سامنے ہیں۔''

بھابی چپ ہوئیں تو ان کی آنکھیں رو رو کر لال ہو چکی تھیں۔ اس نے واقعی شازو کو اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا تھا۔

دل باغی ہونے لگا تھا اور میں اپنے آپ کو شازو کا مجرم گرداننے لگا تھا۔ میرے اندر سے آواز آئی۔

''تابش سزا تو تجھے ملنی چاہیے تھی، اس بے چاری کا کیا دوش۔ تو نے ہی اسے سبز باغ دکھائے تھے، سہانے خواب دکھائے تھے۔ پیار کی خوبصورت باریکیوں سے روشناس کرایا تھا۔

لیکن میں نے تو دل کی گہرائیوں سے تجھے چاہا تھا۔ وہ سراب نہیں تھا حقیقت تھی۔ میری چاہت کم نہیں ہوئی، تمہیں کھو کر کیا میں زندہ رہ پاؤں گا؟ ہرگز نہیں شازیہ، ہرگز نہیں! مجھے منجدھار میں چھوڑ کر تم نہیں جا سکتیں۔ اگر تو نہ رہی تو میں بھی نہیں رہوں گا۔'' میری حالت دیکھ کر بھائی یوسف نے مجھے سنبھالا دیا۔ وہ بھی رات بھر شازیہ کے لیے دعائیں مانگتے رہے تھے۔

چوبیس گھنٹے بعد شاذو کو وینٹی لیٹر سے خلاصی ملنی تھی اور اس کی زندگی موت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس دوران مجھے انجانے خوف اور اندیشوں نے گھیرے رکھا۔ میری سوچ کا محور شاذو کی موت تھا۔ اس کے پاس تو کتنی کی چند گھڑیاں ہیں، پھر وہ کبھی کھلی آنکھوں سے اس حسین کائنات کو نہ دیکھ سکے گی۔ زندگی کتنی خوبصورت ہے، محسوس نہ کر پائے گی۔ خدا نے تین چیزیں ہی تو خوبصورت بنائی ہیں۔ کائنات کا حسن، محبت اور زندگی..... کیا ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی کوشش کر کے ان چیزوں سے اس کی روح کو روشناس کرا سکیں؟

چوبیس گھنٹے پلک جھپکتے گزر گئے۔ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ جب وینٹی لیٹر اتارا جا رہا تھا تو میں بھابی فاطمہ اور بھائی یوسف وہاں موجود تھے۔ مجھے میرا سانس سینے میں گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سوگوار ماحول میں سب ہی سہمے ہوئے تھے۔

نرس نے وینٹی لیٹر ہٹا دیا مگر شاذو کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں زندگی کا رنگ نظر آیا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ سب۔'' کسی نادیدہ قوت نے مجھ سے یہ الفاظ اگلوائے تھے اور میں دیوانوں کی طرح شاذو کو جھنجھوڑنے لگا۔

''اٹھو شاذو! میں آ گیا ہوں۔ تمہیں زندہ رہنا ہے، میرے لیے ورنہ قبریں دو بنیں گی۔'' میں نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ مجھے تھوڑی سی دھڑکن محسوس ہوئی۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھتے ہوئے اظہار نہیں کیا۔ ''آنکھیں کھولو شاذو۔''

شاید وہی لمحہ قبولیت کا تھا۔ شاذو نے ایک لمبی سانس لی اور ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے منہ سے جو پہلا لفظ نکلا وہ ''تابش'' تھا۔

سب عملہ حیران کھڑا تھا۔ سب کے لبوں پر دعائیہ کلمات تھے۔ قدرت نے وہ لمحات گویا امر کر دیے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اللہ رب العزت نے اسے زندگی سے نواز دیا تھا۔

جب میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بٹھانا چاہا تو وہ میری بانہوں میں سمٹ گئی۔ وہ سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔

''تابش! میں جب تک زندہ ہوں ہر گزرتے لمحے کو تمہارے قرب میں خوبصورت اور امر بنا دوں گی۔''

دو دن بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج کروا لیا گیا۔ بھائی اور بھابی کا اصرار تھا کہ شیخوپورہ چلیں مگر میں شاذو کو وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا جہاں اس نے انتظار کی طویل اور تکلیف دہ گھڑیاں گزار کر اپنے اندر یہ دکھ پال لیا۔ میری کار ملتان کی طرف رواں تھی۔

سورج اپنی آخری کرنیں بکھیرتا ہوا اترنے لگا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے پنچھی ڈاروں اور قطاروں کی صورت ستلج کی لہروں پر کانپتی کرنوں کے بیچوں بیچ پرواز کرتے ہوئے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف گامزن تھے۔ خنکی بڑھنے لگی تھی۔ شازیہ سردی محسوس کرنے لگی تھی تو میں نے گاڑی کا ہیٹر آن کر دیا۔ جب رات نے اجالے اپنے دامن میں نگلنے شروع کر دیے تو ہم ملتان شہر کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔

شازیہ بضد تھی کہ آج رات ہی نکاح کیا جائے۔ مگر میں نے اسے نشتر اسپتال کے وی آئی پی روم میں داخل کرا دیا تاکہ کچھ عرصہ مکمل علاج ہو سکے۔ مجھے سرکاری رہائش گاہ جلد ہی مل گئی۔ شازیہ جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی اب تیزی سے صحت مندی کی طرف رواں تھی۔

پھر ایک خوبصورت شام شازیہ مسز تابش بن کر ہمیشہ کے لیے میرے نام ہو گئی۔ یہ تقریب بڑی سادگی سے انجام پائی جس میں میرے والدین اور بہن کے علاوہ اسپتال کے کچھ ڈاکٹرز بھی شامل تھے۔

نکاح کے بعد حجلہ عروسی میں بیٹھی شازیہ آج سے تین سال پہلے والی شازیہ لگ رہی تھی۔ اس کے مکھڑے پر قوس قزح کے رنگ اتر رہے تھے..... وہ بار بار بڑی بے قراری سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی اور..... اس کی آنکھوں میں کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ میری مریض عشق زندگی پا گئی تھی۔ ہے ناں اندھی محبت؟ جس نے آج ہم دونوں کو مکمل کر دیا تھا۔

تیرے لیے ہم ہیں بنے



افتخار چوہدری

محبتوں کی گواہی لیے ایک یادگار داستانِ عشق

شہر کے سب سے بڑے مدینہ ہارڈویئر سٹور کا بند شٹر میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں دوسرے شہر سے ساٹھ کلومیٹر کا سفر طے کر کے یہاں پہنچا تھا۔ میں اپنے ساتھ اس ہارڈ ویئر سٹور کے مالک نوید کی طرف سے آرڈر کیے ہوئے ہارڈ ویئر مشین کے کچھ پرزے بطور سیمپل لے کر آیا تھا۔

اب یہاں سے خالی ہاتھ واپس مڑنا گویا ایک قیمتی دن ضائع کرنے کے مترادف تھا، چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے اپنے سیل فون سے نوید کا نمبر ملایا، تو اس نے پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو فضل صاحب کیسے یاد کیا۔"

ایئرفون سے نوید کی خوشگوار آواز برآمد ہوئی۔

"جناب یاد تو میں واقعی آپ کو کر رہا ہوں، اور وہ بھی آپ کی دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"سوری فضل صاحب میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔ دو دراصل ہماری مارکیٹ یونین نے جمعے کی بجائے اتوار کو ہفتہ وار چھٹی کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اسی لیے آج دوکان بند ہے۔" دوسری طرف سے نوید کی شرمندہ سی آواز سنائی دی۔

جیسے اسے واقعی میرے فضول سفر کرنے پر دکھ ہوا ہو۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے۔" ... میرا اس شہر

میں اگلا وزٹ دس دن سے پہلے ممکن نہیں۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے اپنی مجبوری کی وضاحت کی۔

"نہیں فضل صاحب ہم اتنے دن مزید انتظار نہیں کر سکتے، ہمیں یہ سیمپل فوری چاہیے اگر آپ تھوڑی سی تکلیف اور کریں، اور میرے غریب خانے پر تشریف لے آئیں تو اس طرح آپ کا سفر بھی رائیگاں نہیں جائے گا، اور ہمیں بھی سیمپل مل جائیں گے، آپ کے اگلے وزٹ تک ہم کسی سیمپل کو فائنل بھی کر لیں گے۔" اس نے ایک اور راہ سجھائی۔

"ٹھیک ہے آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سینڈ کریں میں آ رہا ہوں۔" میں نے ہامی بھرتے ہوئے کال منقطع کر دی۔ میرے گاڑی میں بیٹھنے تک اس نے اپنے گھر کا ایڈریس مجھے سینڈ کر دیا تھا، جو کہ ایک پوش ایریے کا تھا۔

نوید ایک پڑھا لکھا کاروباری شخص تھا، جو مارکیٹ کے مزاج کو سمجھتا تھا، اسی لیے دھن اس پر بارش کی طرح برستا تھا، امیر کبیر ہونے کے باوجود منکسر المزاجی اس کے مزاج کا حصہ تھی، وہ چالیس کے پیٹے کا انتہائی خوبصورت شخص تھا، اس کی خوش مزاجی کی وجہ سے میری اس سے گاڑھی چھنتی تھی، لین دین کے معاملے میں وہ کھرا اور سچا آدمی تھا۔

میرے جیسے چھوٹے بزنس مینوں کو ایسے ہی صاف گو کاروباری لوگوں کی تلاش رہتی تھی، پچھلے کئی سالوں سے ہفتے دس دن میں میرا اس کی دوکان پر ایک چکر ضرور لگ جاتا تھا،

ہمارے درمیان بے تکلفی کا رشتہ بن چکا تھا۔

میں اس کے گھر کے سامنے پہنچا جسے وہ غریب خانہ کہہ رہا تھا، وہ ایک بنگلہ نما کوٹھی تھی، جس کے گیٹ پر بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان چوکیدار کلاشنکوف لیے کھڑا تھا۔

''خان صاحب میرا نام فضل ہے۔نوید صاحب نے مجھے بلوایا ہے۔''میں نے اپنا نام اور آنے کا مقصد بتایا۔

''صاحب آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔آپ گاڑی اندر ہی لے آئیں۔''اس نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔میں گاڑی سیدھا پورچ میں لے گیا، ابھی میں گاڑی سے اتر ہی رہا تھا جب ندیم خود وہاں پہنچ گیا۔''آئی ایم سوری فضل صاحب آپ کو تکلیف دینے کے لیے۔''اس نے ہمیشہ کی طرح منکسر المزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

چوکیدار کو میری گاڑی سے کیپسل کا کارٹن اتارنے کا کہہ کر وہ مجھے ساتھ لیے ایک شاندار ڈیکوریٹڈ سٹنگ روم میں لے آیا۔''جی فضل بھائی کیا لیں گے آپ، ٹھنڈا یا گرم۔''نوید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے آپ تکلف نہ کریں۔''

''لو فضل بھائی اس میں تکلف والی کیا بات ہے، ایسا کرتے ہیں کہ پہلے کھانا کھاتے ہیں، بعد میں چائے پئیں گے۔''نوید نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے منع کرتا، دو انتہائی خوبصورت بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور نوید سے لپٹ گئے۔ ان کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ ہوگی، دونوں بہن بھائی حیرت انگیز حد تک ہم شکل تھے، اس سے پہلے میں نے دو بھائیوں یا دو بہنوں کو تو ہم شکل دیکھا تھا مگر بہن بھائی کی ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت پہلی بار دیکھ رہا تھا، ہلکی فیروزی شفاف آنکھوں میں ہیروں کے جیسی چمک تھی، جبکہ ان کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ان کا ایک جیسا قد ان کے جڑواں ہونے کی چغلی کھا رہا تھا، ان میں اس قدر مشابہت تھی کہ اگر دونوں کی ہیئر کٹنگ ایک جیسی کر دی جاتی تو ان میں لڑکی یا لڑکے کی تمیز کرنا مشکل ہو سکتا تھا، میں نے اپنی جاگتی آنکھوں سے اتنے زیادہ خوبصورت بچے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے کبھی پیارے بچے نہیں دیکھے تھے، مگر ان جیسے واقعی نہیں دیکھے تھے۔میں حقیقتاً نظریں جھپکانا بھول گیا تھا۔

''فضل بھائی یہ میرے گلشن کے دو جڑواں پھول ہیں۔''



نوید نے اپنے بچوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ میں جس محویت سے انہیں دیکھ رہا تھا، مجھے لگا کہ اگر میں اسی طرح دیکھتا رہا تو کہیں میری نظر ہی نہ لگ جائے، یہ سوچ کر میں نے ان پر سے نظریں ہٹائیں اور آیات کریمہ پڑھ کر ان پر پھونک مارتے ہوئے پیار کیا تو وہ روئی کے نرم گالوں کی مانند تھے۔

''ماشاء اللہ بہت پیارے بچے ہیں۔'' میں نے ان کی تعریف کی۔ ''آپ انہیں میرے صبر کا پھل کہہ سکتے ہیں۔'' نوید مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ نہ سمجھنے والے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا، میں کھانے کا کہہ کر آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بچوں کو لے کر گھر کے اندر چلا گیا، جبکہ میں اس کی بات میں الجھ کر رہ گیا۔ ''فضل صاحب کیا سوچ رہے ہیں۔'' نوید نے واپس آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سوچنا کیا ہے جناب آپ کے صبر والی بات میں الجھا ہوا ہوں کہ اولاد کون سے صبر کا پھل ہو سکتی ہے۔'' میں نے ایک بار پھر نئے سرے سے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''میری آپ بیتی کچھ طویل ہے اور آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا۔'' نوید نے مجھے وقت کی کمی کا احساس دلایا۔

''میرا آج کا کام صرف آپ کو سیمپل پہنچانا تھا، اگر آپ کو کوئی ضروری کام نہ ہو تو میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' میں نے تجسس بھرے لہجے میں کہا، تو وہ سوچتی ہوئی نظروں سے دیوار پر ٹنگی ہوئی پینٹنگ کو دیکھنے لگا، اس کے انداز سے لگ رہا تھا، جیسے وہ الفاظ کو ترتیب دے رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے، کچھ دیر بعد وہ گویا ہوا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں گریجویشن کر کے فارغ ہوا تھا، چند دن تو دوستوں کے ساتھ موج مستی میں گزر گئے، پھر ایک دن والد مرحوم نے میرے لیے آرڈر جاری کر دیا کہ میں اسٹور پر آیا کروں تا کہ کاروباری اونچ نیچ کو کچھ سکھوں، گھر میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ابو کے سامنے دم مارے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجھے بھی اسٹور پر جانا پڑا۔ میرے دو بڑے بھائی بھی کاروبار کے مکمل ایکسپرٹ ہو چکے تھے، جو ابو کی نگرانی میں تمام کاروبار سنبھالے ہوئے تھے، شروع کے دنوں میں تو بارہ گھنٹے دکان پر گزارنا مجھے جیل میں رہنے جیسا لگتا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ عادی ہوتا چلا گیا اور مجھے کاروبار کی سمجھ بوجھ بھی آنے لگی تھی۔ دوستوں کی شدت سے یاد آتی تھی مگر مجبوری تھی، اس لیے ان سے ملاقاتیں کم ہو گئیں۔

ایک دن ابو نے مجھے کہا کہ تم خانیوال چلے جاؤ وہاں دو کام ہیں، ایک تو میرے چچازاد بھائی اسلم کی بیٹی کی شادی ہے، تمہیں اس تقریب میں شامل ہونا ہے، اور دوسرا وہاں جن دو کانوں پر ہمارا مال جاتا ہے وہاں سے ہمارے مال کے بارے میں چند شکایتیں موصول ہوئی ہیں، وہ بھی دیکھتے آنا۔ میرا سفر کرنے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر ابو کو انکار کرنے کی جرأت کہاں سے لاتا، اسی لیے میں اگلے دن ہی روانہ ہو گیا، میرا ارادہ تھا کہ پہلے دن دو کانوں کا وزٹ کرلوں اور پھر دوسرے دن شادی کی تقریب بھگتا کر واپس آ جاؤں گا۔

خانیوال پہنچنے پر پہلے دن تو میں اپنے کاروباری بکھیڑوں میں الجھا رہا اگلی رات مائیوں میں تقریباً تمام مہمان پہنچ چکے تھے، مہمانوں کی گہما گہمی میں ایک حسین چہرہ دیکھ کر میرا وہی حال ہوا جو کچھ دیر پہلے میرے بچوں کو دیکھ کر تمہارا ہوا تھا، میں بھی نظریں ہٹانا بھول گیا تھا۔

دل تو جیسے میرے کانوں میں آ کر دھڑکنے لگا تھا، زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ بے خودی کی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔

مہک سے سرسری سی ہائے ہیلو بھی ہوئی، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ میرے ابو کے دور کے رشتے دار تھے، وہ اپنی فیملی کے ساتھ دنیا پور سے آئی تھی۔

میں خانیوال سے واپس تو آ گیا مگر اپنا آپ وہیں کہیں چھوڑ آیا تھا، کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی، میں زندگی کے معمولات کسی روبوٹ کی طرح انجام تو دے رہا تھا مگر ان میں ذوق وشوق نہیں تھا، ابو بات بات پر مجھے ٹوکنے لگے تھے، کہ تمہارا دھیان کہاں ہے، چند دنوں میں بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ہمارے اسٹور کے ملازم بھی میری حالت پر تبصرے کرنے لگے تھے۔

''صاحب جی کھانا لگا دیا ہے۔'' ادھیڑ عمر ملازمہ نے نوید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو ہم دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نوید اپنی سابقہ زندگی کے اوراق سے مجھے اقتباس سنانے میں اور میں سننے میں اس قدر مگن تھا کہ ملازمہ کب آئی اور کس وقت اس نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگایا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا، کھانے سے فارغ ہو کر ہم صوفوں پر آ بیٹھے تو ملازمہ ہمارے سامنے چائے کے کپ

رکھ گئی، جن میں سے بھاپ کے ساتھ تازگی بھری مہک بھی اٹھ رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اپنے اندر تجسس کا ابال اٹھنے پر پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔" فضل بھائی میرے امتحان کے دن شروع ہو گئے، میں ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا، مجھ سے بڑے ایک بھائی اور دو بہنوں کی ابھی شادی ہونا باقی تھی ان سے پہلے میں کس منہ سے کہتا کہ میری شادی کروا دیں مگر ہزاروں دلیلوں کے بعد بھی نامراد دل کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی رہی۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی، میرے اندر بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ مجھے لگنے لگا کہ اگر میں نے ایک نظر مہک کو نہ دیکھا تو مر جاؤں گا۔

میں جتنی کوشش کر رہا تھا کہ میرے دل کا حال کسی پر منکشف نہ ہو میری بدلتی ہوئی حالت اتنا ہی شور مچا رہی تھی۔

پھر ایک دن تو حد ہو گئی۔ میں نے گاڑی نکالی اور سیدھا خانیوال جا پہنچا۔ ایک بہانہ بنا کر چچا سے مہک کے گھر کا ایڈریس لیا، اور پھر اسی وقت دنیا پور کے لیے نکل کھڑا ہوا مسلسل آٹھ گھنٹے کی ڈرائیو سے میں وہاں پہنچ پایا، جب تک رات ہو چکی تھی، میں نے ان کے گھر جانے کی بجائے کوئی ہوٹل ڈھونڈنے لگا۔ مگر اس چھوٹے سے قصبے میں مجھے رات گزارنے کے لیے کوئی ہوٹل نہیں ملا، ساری رات میں نے گاڑی میں ہی گزاری، مہک کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کرتی ہے، میرا ارادہ بس اسے ایک نظر دیکھ کر واپس مڑ جانے کا تھا۔ صبح اذان ہونے پر میں قریبی مسجد میں چلا گیا، اس روز میرے ہونٹوں پر بس ایک ہی دعا مچل رہی تھی کہ کسی طرح اس دشمن جاں کا دیدار نصیب ہو جائے۔ سورج نکلنے پر میں ان کی گلی میں پہنچ گیا، اطراف کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں میں چھپ کر کھڑا ہو سکتا تھا، اور اس کے گھر سے نکلنے پر آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

انتظار کے لمحے تو ویسے بھی طویل ہوتے ہیں مگر اس دن تو جیسے وقت تھم سا گیا تھا، میں اگر چاہتا تو سیدھا ان کے گھر جا سکتا تھا، مگر میری جو حالت ہوئی تھی، وہ اس کے گھر والوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی، اور میں اپنی وجہ سے اس کے والدین کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

بہر حال جان گسل امتحان کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ اسپرز دروازے سے نمودار ہوئی، دل کو جیسے ٹھنڈک پڑ گئی تھی، وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گھر سے نکلی تھی، چند گلیوں کے فاصلے پر وہ ایک اسکول میں داخل ہوئی تھی۔

پھر اگلے آٹھ گھنٹے کے سفر سے جب میں گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی ساری فیملی ایک جگہ اکٹھی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ابو کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑے۔

"کہاں تھے تم۔" یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب مجھے ان سے ڈر نہیں لگ رہا تھا، میں بس شرمندہ سی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میں بنا بتائے دو دن گھر سے غائب رہا تھا ان کی پریشانی اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی کیونکہ اس سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

ابو مسلسل مجھ سے سوال پوچھ رہے تھے مگر میں بت بنا کھڑا تھا، میرے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب ہوتا تو دیتا، پھر بڑے بھائی اخلاق کی مداخلت سے میری جاں بخشی ہوئی، مگر تب تک ابو کے تھپڑوں سے میرے گال اور کان سرخ ہو چکے تھے، جن میں سے نکلتی ہوئی تپش مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔

بھائی اخلاق مجھے لے کر میرے کمرے میں آ گئے، وہ کافی دیر تک میری آنکھوں میں جھانکتے رہے ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے کو تھے۔

"یار آج سے پہلے تو تمہیں خراش بھی آتی تھی تو تم میرے پاس دوڑے چلے آتے تھے مگر اب ایسا کیا مسئلہ ہو گیا کہ تم اکیلے ہی جھیل رہے ہو، بتاؤ مجھے۔"

بھائی اخلاق نے پیار بھرے لہجے میں کہا تو میں سسک پڑا میرے اندر رکا ہوا سیلاب ان کے کندھے کو بھگو گیا۔

میں نے ساری بات اخلاق بھائی کو بتا دی، بھائی اخلاق سب سے بڑے تھے، وہ ابو کی کاربن کاپی تھے، ان کے اپنے چار بچے تھے، لیکن وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کرتے تھے۔

"یار یہ کیا طریقہ ہے محبت کرنے کا۔ اگر تمہیں شادی ہی کرنی ہے تو پوری برادری میں سے جس لڑکی سے کہو گے میں اسی سے تمہاری شادی کروا دوں گا، اور اگر وہ لڑکی تمہیں اتنی ہی پسند آ گئی تھی تو تم مجھ سے کہتے میں خود ہینڈل کر لیتا۔" میری ساری بات سننے کے بعد اخلاق بھائی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"او کے اب تم نے یہ بات کسی سے نہیں کرنی میں دیکھتا ہوں کہ یہ مسئلہ کیسے سلجھ سکتا ہے، اور یہ شیو وغیرہ بناؤ اور اپنی صحت کا خیال کرو، چند دنوں میں ہی سالوں کے بیمار لگنے لگے ہو۔" بھائی نے واپس جاتے ہوئے کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے پچھلے چھتیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا۔

چند دن بعد اخلاق بھائی رشتے کے لیے دنیا پور گئے مگر واپسی پر ان کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"مہک بچپن سے ہی اپنے کزن سے منسوب ہے۔" یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری تھی، میری سنبھلتی ہوئی حالت ایک بار پھر پہلے سے بھی ابتر ہونے لگی۔ میں اگلے دن منہ اندھیرے ایک بار پھر دنیا پور کے لیے نکل پڑا۔

میں جب وہاں پہنچا تب سکول سے چھٹی ہونے والی تھی، میں نے چھپ کر اس کا دیدار کیا اور پھر لوٹ آیا، پھر تو میری روٹین بن گئی۔ ہفتے میں دو دن تو ہر حال میں دنیا پور جایا کرتا تھا، کبھی کبھار طبیعت زیادہ بے چین ہو جاتی تو تین چکر بھی لگ جاتے تھے۔

اسکول کے سامنے موجود نان پکوڑے کی دوکان والے سے میری دوستی ہو گئی تھی، دیر سویر ہو جاتی تو اس کی دوکان میں ہی رہ جاتا تھا، پہلے پہل تو میرے اس رویے پر گھر میں خوب ہنگامے ہوئے مگر پھر سب نے غیر اعلانیہ طور پر مجھ سے لاتعلقی اختیار کر لی۔

"بس بھائی اخلاق اور امی ہی تھے جو مجھے سمجھانے بیٹھ جاتے تھے مگر میں ہر بار اپنی دلی کیفیت بتانے میں ناکام ہو جاتا تھا۔

"یار نوید کیوں اس نامراد مرض میں جل مرنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو، خود پر اور اپنی فیملی پر رحم کرو، یہ سراب ہے اور سراب کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا، ایک دن ساجد نے پکوڑوں کا پور والتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں سکول کے گیٹ سے چھٹی کر کے نکلتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہا تھا ساجد کی بات سن کر مسکرا دیا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، اس کی دوکان پر معصوم بچوں کی یلغار ہوئی تو وہ ان میں الجھ کر رہ گیا۔

آج چھٹی کو کافی وقت ہو گیا تھا، مگر مہک سکول سے نہیں نکلی تھی، جبکہ اس کی ساتھی ٹیچرز بھی جا چکی تھیں، میرا انتظار تشویش میں بدلنے لگا۔

پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا، کہ گیٹ سے ایک چھوٹا سا لڑکا نکلا اور سیدھا میری طرف آیا۔

"انکل آپ کو مس مہک بلا رہی ہیں۔" اس نے معصوم سے لہجے میں پیغام دیا تو میں سکتے میں آ گیا، اُسے میری یہاں موجودگی کا علم کیسے ہوا، یہ سوال کسی ہتھوڑے کی طرح میرے ذہن پر برسنے لگا، میں تو کبھی بھی اس کے سامنے نہیں ہوا تھا، بس دور سے ہی ایک نظر دیکھ کر پلٹ جایا کرتا تھا۔

میں اٹھ کر بچے کے ساتھ ہو لیا، گیٹ سے اندر داخل ہوا تو وہ مہ جبیں سامنے ہی کھڑی تھی، اس کی فیروزی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، جبکہ پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کپکپا رہے تھے، وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"کیسی ہو مہک!" میں نے شرمندہ سے لہجے میں پوچھا۔

"نوید میرے والدین انتہائی عزت والے لوگ ہیں، کیوں ہماری عزت خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہو، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو، میں عمر بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو اس کی فیروزی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گرنے لگے۔ اس کی بات سن کر میری روح تک لرز گئی۔

"مہک میں تو......"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ اب اگر تم کبھی یہاں آس پاس بھی نظر آئے تو میں سمجھوں گی کہ تم چاہتے ہو کہ میں زندہ نہ رہوں، خدا کی قسم اب اگر تم کبھی یہاں نظر آئے تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

مہک نے میری بات سنے بنا ہی حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

میرے لیے وہاں مزید کھڑے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا، میں کانپتی ٹانگوں کے ساتھ واپس ساجد کی دوکان تک پہنچ گیا مگر وہاں پہنچتے ہی میری ہمت جواب دے گئی، بس مجھے اتنا یاد ہے کہ ساجد مجھ سے کچھ پوچھ رہا تھا، جب میری ٹانگوں نے میرا وزن سہارنے سے انکار کر دیا تو میں منہ کے بل فرش پر جا گرا۔

جب ہوش آیا تو میں ساجد کے گھر تھا فرش پر منہ کے بل گرنے کی وجہ سے ماتھے اور ناک پر چوٹ آئی تھی، ہونٹ بھی پھٹ کر سوج چکے تھے۔

"ساجد میرا ایک کام کرو گے پلیز، اس کے بعد میں کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔" میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"مجھے دوست کہتے ہو اور بات اجنبیوں کی طرح کرتے ہو۔" اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تو اس کے خلوص نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔

"یار اس بار جب میں آیا تو میری گاڑی ورکشاپ گئی ہوئی تھی، میں بھائی کی گاڑی لے آیا تھا، پلیز اسے کسی طرح لاہور ہمارے گھر پہنچا دینا، اور میرے بارے میں انہیں کچھ مت بتانا۔" میں نے ہنڈا کارڈز کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور اسے ایڈریس بھی بتا دیا۔

"مگر تم کہاں جا رہے ہو۔" اس نے میری طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کہاں جاؤں گا۔" اس نے مجھے نظر نہ آنے کے لیے کہا ہے۔

"میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اپنی باقی سانسیں اسی شہر میں لوں جہاں وہ رہتی ہے، ویسے بھی مجھے یہاں کی ہر چیز سے انسیت سی ہو گئی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا، ساجد اور بھابی نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی مگر میں نہیں مانا، اور گھر سے نکل آیا۔

وہ اذان کی آواز تھی جسے سن کر میں خالی الذہنی کی کیفیت سے نکلا تھا، اطراف کا جائزہ لیا تو میں قصبے کے آخر میں موجود ایک چھوٹی سی مسجد کے قریب کھڑا تھا، جس سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی، میں مسجد کے اندر چلا گیا، عصر، مغرب کے بعد عشاء بھی ہو گئی، مگر میرا وہاں سے اٹھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں گم صم سا بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ نورانی چہرے والے بزرگ اس مسجد کے امام تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" انہوں نے اپنائیت سے پوچھا، تو میں سسک پڑا۔

"میں سب کی پریشانیوں کو دور کرنے والے کے گھر میں بیٹھا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ وہ میری التجا سن لے۔"

میری بات سن کر انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا، شاید معرفت کے کسی درجے پر فائز تھے جو میرے کہے بنا ہی سب کچھ سمجھ گئے تھے۔

"یہ ساتھ ہی حجرہ ہے تم اس میں رہ سکتے ہو۔" انہوں نے مجھے مسجد میں رہنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ مسجد میں چند گنے چنے نمازی ہی آتے تھے، میں کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔

ایسے ہی نجانے کتنے مہینے بیت گئے، پھر ایک دن ساجد اور بھائی اخلاق مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گئے، بھائی میری حالت دیکھ کر رونے لگے۔

"یار اللہ نے تمہاری دعائیں سن لی ہیں، مہک کے والدین رشتہ دینے کے لیے مان گئے ہیں۔"

بھائی کے منہ سے یہ خبر سن کر مجھے سکتہ سا ہو گیا، گھر واپسی تک میں اسی کیفیت میں رہا۔

"مگر بھائی وہ تو اپنے کزن سے منسوب تھی۔" میرے سوال پر چند ثانیے بھائی خاموش رہا اور پھر گویا ہوا۔

"میں نے مہک کے کزن کے بارے میں ساری معلومات حاصل کی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک نکما نوجوان ہے اور اسے جوئے کی بھی لت ہے۔ جب میں نے اسے تمہاری اس حالت کے بارے میں بتایا اور مہک سے دستبردار ہونے کی قیمت پوچھی، تو اس نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے بدلے میں یورپ بھجوانے کی شرط رکھ دی، اور میں نے اس ڈیل کو فوراً ڈن کر دیا۔ مجھے میرا بھائی چاہیے تھا اس کے لیے مجھے چاہے کوئی بھی قیمت ادا کرنا پڑتی۔ اس نے ڈیل ڈن ہونے کے بعد منگنی ختم کر دی۔" بھائی اخلاق نے تفصیل بتائی تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"بھائی یہ کیا کر دیا آپ نے، مہک کیا سوچے گی میرے بارے میں؟"

"اسے کوئی بتائے گا تب سوچے گی نہ، تم اپنے دماغ پر زیادہ زور مت دو، بس یہ دیکھو کہ وہ تمہیں مل رہی ہے۔" بھائی نے مجھے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر واقعی چند دن میں ہی میری شادی مہک سے ہو گئی، اور وہ نازک اندام دلہن بن کر میرے آنگن میں اتر آئی۔

خوشی کے مارے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، مگر میری ساری خوشی اس وقت کافور ہوئی جب میں نے مہک کا گھونگھٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نوید تم نے مجھے حاصل تو کر لیا ہے، لیکن میں ایک جیتی جاگتی لاش جیسی ہی ہوں، اور یاد رکھنا، اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

میں اتنے میں ہی خوش تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے، میں [illegible] بیٹھ کر اسے دیکھتا رہتا تھا، گھر والوں کے سامنے، مجھ

سے نارمل بی ہیو رکھتی تھی مگر کمرے میں جا کر وہ بالکل اجنبی ہو جاتی تھی۔

اس طرح بارہ سال گزر گئے، میں قالین پر سوتا رہا اور وہ بیڈ پر۔

آہستہ آہستہ مایوسی میرے اندر گھر کرنے لگی، اور میں اس کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا، میں اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ جی چاہتا تھا خود کو ختم کرلوں، میں نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسے بی ہیو کرتی جیسے میں وہاں موجود ہی نہ ہوں، کئی دفعہ اس کے لیے اپنی پسند کے کپڑے لے کر آیا اور صرف ایک دفعہ پہن کر دکھانے کی فرمائش کی لیکن وہ تو جیسے پہن کر نہ پہننے کی قسم کھائے بیٹھی تھی۔

میری شادی کے چند سال بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو جائیداد کا بٹوارہ بھی ہو گیا۔ سب بھائیوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ دکانیں بنالی تھیں مگر رہائش مشترکہ ہی تھی۔ میں نے مہک کو بتائے بنا اپنی ساری جائیداد مہک کے نام کر دی تھی۔ ایک دن بھائی کے سسرال میں شادی تھی سب گھر والے شادی میں گئے ہوئے تھے گھر میں صرف میں اور مہک تھے، میں اسٹور پر چلا گیا۔

ہلکی ہلکی بارش رومان پرور ماحول بنا رہی تھی، تب میرے اسٹور کے گودام میں بیس سے زائد افراد کام کرتے تھے، میں نے سب کو اکٹھا کیا، اور ہر ایک کو اس کی تنخواہ کا پانچ گنا بونس دیا، اور پھر ہوٹل سے بہترین کھانا منگوا کر کھلایا، وہ سب خوشگوار حیرت میں مبتلا تھے، جب وہ کھانے سے فارغ ہو گئے تو میں نے ان کو چھٹی دے دی کہ جا کر انجوائے کرو۔

موسم اتنا پیارا ہو رہا تھا لیکن میرے اندر کا موسم اتنا ہی ویران ہو رہا تھا آج مجھ پر مایوسی کی انتہا ہو چکی تھی، میں نے سٹور بند کیا اور میڈیکل اسٹور سے ڈیزی فام گولیوں کی پوری بوتل لے کر گھر پہنچ گیا۔

مہک کچن میں مصروف تھی، میں نے چپکے سے اسے دیکھا تو اس نے آج میری پسند کا سوٹ پہنا ہوا تھا، جو میں بڑے پیار سے اس کے لیے لے کر آیا تھا مگر کئی بار کہنے کے باوجود اس نے پہن کر نہیں دکھایا تھا مگر آج پتہ نہیں کیوں اس نے خود ہی پہن لیا تھا۔

میرا دماغ سن ہو رہا تھا، میں نے شیشی سے ساری گولیاں نکال کر ہاتھ پر رکھ لیں اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا گلاس اٹھا لیا، میرے اندر مایوسی اتنی گہری ہو چکی تھی کہ سانس آنا مشکل ہو رہا تھا، اس مشکل سے آتی ہوئی سانسوں کو ختم کرنے کے لیے میں ہاتھ میں موجود گولیوں کو منہ کی طرف لیجا ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑ لیا۔

گھر میں اس وقت مہک کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور اس برستی بارش میں کسی کی آمد کی توقع بھی نہیں تھی۔ میں نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا تو وہ مہک تھی جو بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

”پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ مجھے آج ہی اپنی ایک دوست کے ذریعے حقیقت کا علم ہوا ہے، میں جس کی محبت دل میں لیے بیٹھی رہی وہ محض چند ٹکوں کی خاطر مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ جبکہ تم نے دھتکارے جانے پر بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔“

بھائی اخلاق نے جو بھی کچھ کیا وہ تو انہوں نے اپنے بھائی کو بچانے کے لیے کیا۔“ مہک نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی جبکہ میں اپنے دل میں اپنے رب کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے حرام موت سے تو بچا ہی لیا تھا، ساتھ ہی میرے صبر کا پھل بھی عطا کر دیا تھا۔

”یہ کیا ہے۔“ مہک نے میرے ہاتھ پر رکھی ہوئی گولیاں دیکھیں تو بدحواس ہو گئی۔

”آج میں اپنی موت ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اگر تم چند سیکنڈز اور دیر کر دیتیں تو تم بھی آج خالی ہاتھ رہ جاتیں۔“ میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا تو اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے گولیاں چھین لیں، اور دیوانہ وار میرے ہاتھوں کو چومنے لگی اس کی فیروزی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں پر گرتے ہوئے آنسوؤں کی گرمائش کو میں اپنی روح کی گہرائیوں تک محسوس کر رہا تھا۔

آج یہ دونوں بچے میرے صبر کا پھل ہیں اور بھائی، میری محبت اب میرے دل میں دھڑکتی ہے۔“ یہ کہہ کر نوید تو خاموش ہو گیا مگر میرے دل میں نوید اور مہک کی محبت کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ سچ ہے محبت کرنے والے دل آخر ایک ہو ہی جاتے ہیں اور صبر کا پھل ہمیشہ لازوال ہوتا ہے۔

میں واپس اپنے شہر تو آ گیا لیکن میرے دل میں تو نوید کی محبت اپنی سادگی سمیت ہمیشہ مقید رہے گی۔ واقعی خدا نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا تھا۔

☆☆☆

نوین داستانِ عشق

بس تری گلی میں...

حمیرا خان

ایک ایسی داستانِ عشق ”جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے“ تک کی حقیقی تصویر ٹھہری

محبت زندگی کا استعارہ ہے ٭ کبھی تو یوں ہے
زیست میری ہے حق تمہارا ہے

کارڈ پر لکھی اس نظم کو وہ بلاشبہ دسیوں بار پڑھ چکی تھی مگر ہر بار پھر اسی اشتیاق سے اتنے ہی دھیان سے پڑھنے لگتی جیسے پہلی بار پڑھ رہی ہو۔ وہ لفظ اس کے لیے بہت اہم تھے بہت زیادہ اہم۔ لفظ اہم نہیں ہوتے لفظوں کی اہمیت تو ان سے وابستہ لوگوں



کی اہمیت سے جڑی ہوتی ہے اور یہ الفاظ جس انسان نے لکھے تھے وہ اس کے لیے بہت اہم تھا۔ بہت نہیں بہت زیادہ اہم بہت زیادہ بھی نہیں سب سے زیادہ اہم۔ وہ جانتی تھی وہ لفظ نہیں ہیں وعدہ ہیں، محبت کا مان ہیں جو اسے بخشا گیا ہے، کارڈ پر بے دھیانی سے انگلیاں پھیرتی عروب سب کچھ بھول کر ایک خوبصورت خیال میں اس طرح گم تھی اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ کالج سے لیٹ ہو رہی ہے وہ جانے کب تک اسی کیفیت میں رہتی لیکن کچن سے آتی اماں کی آواز نے اسے چونکا دیا جو اسے ناشتے کے لیے بلا رہی تھیں۔ اماں کو جواب دیتے ہوئے اس نے کارڈ کو بہت پیار اور احتیاط کے ساتھ الماری میں رکھ دیا وہاں ایسے اور بھی بہت سے کارڈز اور نیکلس رکھے ہوئے تھے، الماری کا یہ خانہ کتنا قیمتی تھا یہ کوئی عروب احمد سے پوچھتا تو وہ کہتی اس کا مول تو پوری دنیا بھی نہیں ہو سکتی۔ الماری بند کرتے ہوئے عروب کو یاد آیا اس نے ایک بار آپ کے پوچھنے پر کچھ اسی قسم کا جواب دیا تھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ الماری بند کر کے اس نے ٹیبل پر رکھا سرخ گلابوں کا بکے اٹھایا اور سارے پھول بیڈ کے سرہانے رکھے گلدان میں سجا دیے۔ پھولوں کو پیار سے سہلاتی اور ان کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتی وہ کمرے کا دروازہ بند کرتی کچن کی طرف چلی آئی۔ ناشتے کے نام پر جلدی جلدی چائے کے دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اتارتی اماں کی ڈانٹ پر کالج میں ناشتہ کرنے کی تسلی کراتی عروب خود کو بے حد خوش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

☆.....☆

گاڑی روڈ پر لاتے ہوئے اس نے بیک مرر سیٹ کیا اور ڈرائیونگ پر دھیان دینے کی کوشش کرنے لگی لیکن آج دھیان اس کے کنٹرول میں تھا ہی کب۔ "اماں کو کیسے بتاتی کہ آج مجھے بھوک ہی نہیں ہے اگر یہ بتاتی تو پھر یہ بھی بتانا پڑتا کہ بھوک کے غائب ہونے کے پیچھے کیا ہے اور وہ میں اماں کو کیسے بتا سکتی تھی۔ [illegible]

بھی۔ کچھ نالائق ڈرائیورز کی وجہ سے عروب پچھلے دس منٹ سے ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے کالج پہنچنے میں دیر ہو رہی تھی لیکن اسے کوئی پریشانی نہیں تھی اس نے مرر میں اپنے آپ کو دیکھا اور پھر ساتھ والی سیٹ پر رکھے پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی لیکن مطلوبہ چیز نہ ملنے پر اس نے پرس واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا پھر اچانک سے کچھ خیال آنے پر ڈیش بورڈ کھولا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی سامنے وہی لپ اسٹک پڑی ہوئی تھی جو دو ہفتے پہلے شاپنگ سے واپسی پر آپ نے یہ کہتے ہوئے ڈیش بورڈ میں رکھ دی تھی کہ اللہ توفیق دے تو کبھی اس بوتھے پر لگا کر دوسروں کو خوش ہونے کا موقع فراہم کر دینا۔" اس وقت تو عروب نے منہ بنایا تھا لیکن آج اسے اپنی اس پیاری سی دوست پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا، وہ لپ اسٹک لگا کر فارغ ہوئی تھی اس کے آگے والی گاڑیاں رینگتی ہوئی آگے نکل گئیں تو اس نے بھی گاڑی کو گیئر لگا دیا۔ جیسے جیسے اس کی گاڑی آگے کی طرف بڑھ رہی تھی اس کا ذہن پیچھے جا رہا تھا پیچھے بہت پیچھے کئی سال پہلے کے اس دن میں جو آج کے دن کی طرح بہت اہم تھا، اس روز وہ بہت روئی تھی لیکن وہ ان آنسوؤں کی بارش میں تنہا نہیں بھیگی تھی کوئی اور بھی نم پلکیں لیے اس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆

"کیسی ہو کزن؟" عروب چھت پر بیٹھی ڈوبتے سورج کے نظارے میں گم تھی یا کہیں خیالوں میں برہان کی آواز پر چونک کر دوپٹہ سنبھالنے لگی تھی جو اس کے کندھوں سے ڈھلک کر زمین کو بوسے دینے کا شغل فرما رہا تھا۔

"آپ اس وقت یہاں کیسے؟" وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کیوں میرے اس وقت آنے پر کوئی پابندی ہے کیا؟" برہان نے عادت کے خلاف بات بڑھائی۔

"پابندی تو نہیں ہے لیکن آپ کے پاس [illegible]

"بتائیں بھی کیسے آنا ہوا؟" اس کی نظروں سے گھبرا کر عروب نے سوال دہرایا۔

"تمہاری بہت شکایتیں مل رہی تھیں سو آنا پڑا۔" کیسی تھکن اتری تھی برہان کے لہجے میں جس نے عروب کے دل کو بے چین کر دیا تھا۔ "اب میں نے کیا کیا ہے؟ اماں تو یونہی مجھ سے خفا رہتی ہیں اور پھر آپ کو شکایت لگا دیتی ہیں، آپ بھی بنا کچھ سوچے سمجھے مجھے ڈانٹنے چلے آتے ہیں۔" وہ ناراضگی سے دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ "تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی عروب؟" وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ چکا تھا اس لیے اس کا انداز دوٹوک تھا۔

"میں نے ایسا کب کہا ہے؟" اس کے انداز نے عروب کو بوکھلا دیا تھا سوچتی تھی جب بھی ایسا وقت آیا تو سیدھا سیدھا بتا دے گی لیکن اب جب وہ وقت آیا تھا تو اس کی ساری ہمت، سارا حوصلہ ہوا ہو گیا تھا۔

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا عروب نے شاید ہی کبھی اس کو اتنا سنجیدہ دیکھا ہوگا۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" آخر اسے کچھ تو کہنا تھا کہ وہ جواب لیے بغیر جانے کے موڈ میں نہیں لگ رہا تھا۔

"کیوں نہیں کرنی؟" برہان کا انداز ہنوز تھا۔

"کیونکہ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں، ماسٹرز کرنا ہے مجھے" سر جھکا کے دھیمے لہجے میں بولتی عروب کی آواز آنسوؤں سے بھیگنے لگی تھی۔ "ٹھیک ہے تو میں پھوپو سے بات کر لیتا ہوں فی الحال تمہاری منگنی کر دیتے ہیں شادی جب تم چاہو گی تب کر دیں گے۔" وہ فیصلہ سنا کر وہاں سے اٹھنے لگا تھا کہ عروب بے اختیار اس کا بازو تھام گئی۔

"ایسا مت کریں پلیز۔" آنسو اس کے گالوں پر بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔ برہان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ دوبارہ عروب کے پاس بیٹھ گیا۔

"اس راستے پر مت چلو عروب! اس میں بہت [illegible]

[illegible]

اٹھنے لگا تھا جب عروب نے دوبارہ سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے عروب" برہان نے غصے کے پردے میں اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کی۔

"آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں نا؟" کتنی امید تھی عروب کے لہجے میں برہان کا دل چاہا کہ کچھ بھی سوچے سمجھے بنا "ہاں" کہہ دے لیکن اگلے ہی لمحے دماغ نے اسے ٹوک دیا دل و دماغ کی اس کشمکش میں وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا عروب اب بھی اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو عروب مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں، خاص طور پر ابو کے انتقال کے بعد تو چھوٹی سے لے کر بڑی تک ہر ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے اور میرے پاس کوئی ڈھنگ کی جاب تک نہیں ہے" وہ خود کو سمجھا رہا تھا یا عروب کو مگر سمجھانے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔

"میں ہمیشہ ساری عمر آپ کا انتظار کر سکتی ہوں" برہان کے اقرار نے گویا عروب کو کائنات کے خزانوں کی چابی تھما دی تھی اور اب وہ کسی صورت اب اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"پاگلوں والی باتیں مت کرو عروب یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک لوئر کلاس کے بے روزگار انسان کے لیے پانچ بہنوں کی شادی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شاید پوری عمر گزر جائے گی مجھے یہ سب کرتے کرتے اور تم...... میں تمہیں کیوں انتظار کی سولی پر لٹکاؤں؟" برہان کو غصہ آ رہا تھا پتا نہیں کس بات پر...... عروب کی ضد پر یا اپنی بے بسی پر وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"کیونکہ میں انتظار کرنا چاہتی ہوں اس لیے آپ مجھے انتظار کرنے دیں، میں آپ سے کبھی بھی کچھ بھی نہیں کہوں گی۔" وہ [illegible] اسے یقین دلا رہی تھی اور برہان کا دل [illegible] "تم میری [illegible]

[illegible]

شادی کرلی پھر؟؟" برہان اسے چھیڑنے لگا۔

"تو میں ایک اچھی کزن کی طرح آپ کی شادی میں شریک ہوجاؤں گی۔" عروب نے جواب دینے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہیں کی جواب میں برہان ہنس دیا تھا۔

"تمہیں اتنی بڑی قربانی کبھی نہیں دینا پڑے گی لیکن سنو! پھوپو سے کیا کہو گی؟" اسے اچانک پھوپو کا خیال آیا تھا جنہوں نے اسے عروب کو شادی کے لیے منانے کی ذمہ داری سونپ کر بھیجا تھا۔ "ان کی بھی فکر مت کریں۔ میں انہیں سمجھا لوں گی چلیں نیچے چلتے ہیں میں آپ کو اچھی سی چائے پلواتی ہوں" وہ اسے ساری فکروں سے آزاد کرتی خود پر سارے بوجھ لینے کے باوجود کتنی مطمئن لگ رہی تھی، شام کے دھندلکے میں جگمگاتی آنکھوں والی وہ لڑکی برہان کے اندر بہت اندر تک اتر گئی تھی اسے اپنی محبت پر ناز ہو رہا تھا۔

اسمبلی کا ٹائم گزر چکا تھا۔ ٹیچرز کی مخصوص جگہ پر گاڑی پارک کرتے ہوئے وہ پرس اٹھا کر نیچے اتری اور گاڑی لاک کر کے اسٹاف روم کی طرف جانے لگی، اسٹوڈنٹس پہلے کی اس یاد نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ "گڈ مارننگ میم یہ آپ کے لیے" ابھی وہ چند قدم ہی چلی تھی کہ تین لڑکیوں کے گروپ نے اس کا راستہ روک لیا، ان کے ہاتھوں میں مہکتے گلاب تھے، اس نے شکریہ کہہ کر گلاب تھام لیے اور آگے بڑھنے ہی لگی تھی کہ "ایکسکیوزمی میم" کی آواز پر پھر سے رک کر ان لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ اسنگ لگ کر آپ بہت زیادہ پیاری لگ رہی ہیں۔" ایک شوخ سی لڑکی بڑے مزے سے اسے بتا رہی تھی اور وہ اتنی بڑی اور ان کی ٹیچر ہونے کے باوجود اس طرح تعریف سن کر سرخ پڑ گئی تھی، جواب میں صرف مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

"اف آج کل کے بچے کیسے آرام سے سب کہہ دیتے ہیں۔ ایک ہم تھے جن کی گھگھی بندھ جاتی تھی ٹیچر کے سامنے بات کرتے ہوئے، وقت بہت بدل گیا ہے" وہ دل ہی دل میں خود سے باتیں کرتی اسٹاف روم میں داخل ہوئی سب کو مشترکہ سلام کرتے ہوئے ٹیبل پر سے رجسٹر اٹھا کر حاضری لگائی اور ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کے بھی کیا مزے ہیں مس عروب! ہر روز یہ خوبصورت پھول آپ کو ہی تحفے میں کیوں ملتے ہیں ارے جناب ہم بھی تو پڑھاتے ہیں ادھر" مس رافیہ ہونٹوں کو مسکراہٹ کے انداز میں پھیلائے مخصوص طنزیہ انداز میں عروب سے بولیں تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں تھامے پھول ان کی طرف بڑھا دیے۔

"اپنا گفٹ کسی کو نہیں دیتے عروب یہ اچھی بات نہیں ہوتی" مس صائمہ حسب عادت بولے بنا نہیں رہ سکی تھیں ویسے بھی ان کی مس راضیہ سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ مس راضیہ جو پھول پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی تھیں صائمہ کی بات پر منہ بنا کر رہ گئیں۔ عروب جو یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اب دیکھو کتنی دیر گولہ باری ہوتی ہے مس راضیہ کے اس طرح خاموش رہنے پر سوالیہ نظروں سے مس صائمہ کو دیکھنے لگی تو صائمہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے مس راضیہ کے سامنے رکھے پیپرز کے بنڈل کی طرف اشارہ کر دیا تو عروب بھی ان کی مجبوری سمجھ کر مسکرا دی۔ اس کا پہلا اور دوسرا پیریڈ فری تھا۔ اسٹاف روم میں کبھی لوگ دسمبر ٹیسٹ چیک کرنے میں مصروف تھے جبکہ عروب ایک دن پہلے ہی اس کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ سب کو مصروف چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ ہر طرف سردیوں کی نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی ان کا جی چاہا دھوپ کا مزا لیا جائے، دائیں طرف کے گراؤنڈ میں پہلے ہی کچھ ٹیچرز دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ گپ شپ میں مصروف تھیں۔ مس نبیلہ نے عروب پر نظر پڑتے ہی ہاتھ ہلا دیا۔ وہ بھی ان کی طرف چلی آئی وہاں وہی روز کی باتیں زیر بحث تھیں وہ غائب دماغی سے ان کی باتیں سنتی اور سر ہلاتی رہی۔ "لو جی یہ سال بھی جانے کو ہے پتا ہی نہیں چلا کیسے سال گزر گیا" مس طوبیٰ کی بات پر سب اپنی اپنی رائے دینے لگیں جبکہ عروب کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس نکل گئی "خوش قسمت ہیں آپ لوگ جو سال گزرنے کا پتا نہیں چلتا یہاں تو ایک ایک لمحہ قیامت بن کے گزرا ہے" وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی زور سے بول کر ایسی بات کہنے پر اس کی شامت ہی آجاتی تھی۔ سب نے اپنے اپنے قیاس کے گھوڑے دوڑانا شروع کر دینا تھے۔ ایک آدھ نہیں پورے چھ سال تھے جو اس نے اس طرح گزارے تھے کہ ہر صبح عروب نئی امید کا دامن تھامتی تو ہر شام امید کا سورج مایوسی اور پریشانی کے اندھیروں میں ڈوب جاتا۔

☆......☆

عروب اور ریحان اپنے ماں باپ کی دو ہی اولادیں تھیں ریحان عمر میں عروب سے بڑا تھا، ماسٹرز کے بعد ریحان اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ سدھار گیا تھا اب گھر میں عروب اور اس کے ماں باپ ہی رہ گئے تھے۔ برہان عروب کے اکلوتے ماموں کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کا اکلوتا میل کزن بھی اسے سنڈے "اکلوتوں" نے برہان کی اہمیت کو کچھ زیادہ ہی بڑھا دیا تھا

ماں اور پانچ بہنیں تو اپنی ہر ضرورت میں اسے پکارتی ہی تھیں ریحان کے جانے کے بعد اس نے بنا کسی کے کہے عروب کے گھر کا خیال بھی ایسے ہی رکھنا شروع کر دیا تھا جیسے اپنے گھر کا۔اس کی اس بات پر جہاں عروب کے ماں باپ اس کے صدقے واری ہوتے وہیں اس کی اپنی ماں کو بیٹے کا اپنی پھوپو کی طرف اس قدر جھکاؤ خاصا ناگوار گزرتا، عروب کے ماں باپ سے تو ان کی کوئی خاص رنجش نہیں تھی البتہ اکلوتے بیٹے کی ماں ہونے کے ناتے خوبصورت نازک سی عروب ان کی نظروں میں خاصی کھٹکتی تھی، اگر چہ برہان نے کبھی عروب کو کوئی خصوصی اہمیت نہیں دی تھی لیکن ماں تو پھر ماں ہوتی ہے بنا کہے بھی بہت کچھ سمجھ لیتی ہے۔یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔

☆.....☆

اس روز کی بات کے بعد عروب اور برہان کے درمیان ایک خوبصورت رشتہ بن گیا تھا جسے وہ دونوں محسوس کر سکتے تھے، برہان نے خود پھوپو سے بات کر کے عروب کو اس مشکل مرحلے سے بچا لیا تھا، انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا برہان ہمیشہ ان کی گڈ بک میں رہا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں عروب کی پسندیدگی بھی ان کے سامنے تھی سو ذہن میں اٹھتے کئی سوالوں اور الجھنوں کو انہوں نے آنے والے وقت پر چھوڑ دیا تھا۔اور آنے والا وقت اتنا آسان نہیں رہا تھا۔برہان کے اچھی جاب پر جاتے ہی اس کی امی اور بہنوں کو پھوپو کی فیملی کچھ زیادہ ہی بری لگنے لگی تھی۔

ایک ایک کر کے چار بہنوں کو اپنے گھر کا کرنے میں برہان کی زندگی کے پانچ سال گزر گئے تھے اس دوران اس نے سی ایس ایس کی تیاری کر کے پیپر دے دیئے، کامیابی نے اس کی محنت کا خوش آمدید کہا اور جس دن وہ انٹرویو میں کامیاب ہوا وہ تو گویا ان سب کے لیے عید کا دن تھا۔خاندان بھر سے دعوتوں کے پیغام آئے تھے لیکن برہان نے ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب سے معذرت کر لی تھی وہ ان دعوتوں کا بوجھ اٹھانے کے حق میں بالکل نہیں تھا جن کے پیچھے کوئی نا کوئی مطلب چھپا ہوا تھا۔اس دوران عروب کا ماسٹرز بھی مکمل ہو گیا، اگلے سال ہی لیکچرار شپ کے امتحان میں پاس ہو کر وہ قریبی کالج میں پڑھانے لگی۔اس کا خیال تھا کہ اب تو ممانی کی نظروں میں اس کی کچھ نا کچھ عزت و اہمیت بڑھ ہی گئی ہوگی لیکن دوسری طرف رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔جہاں ہر اپنا بیگانہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہا تھا وہاں مڈل کلاس سندی لیکچرار بہو ان کی نظروں میں بھلا کیا سماتی۔ہر نئے کوئی نہ کوئی بہن ناں سے ملنے آتی اور پھر برہان کی شان کے حوالے سے خوب خوب منصوبے بنائے جاتے اگر یہ باتیں کبھی برہان کے سامنے ہوتیں تو وہ ہنسی مذاق میں ٹال دیا کرتا۔لیکن دل ہی دل میں فکر مند ضرور ہو جاتا کہ عروب کے سوا کسی اور کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

☆.....☆

برہان کے گھر پکنے والی اس کھچڑی کی خبر جیسے تیسے عروب تک بھی پہنچ ہی جاتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو عروب کو لگتا تھا جیسے اس تک خاص طور سے یہ باتیں پہنچائی جاتی تھیں تا کہ وہ کسی قسم کی کوئی امید نہ رکھے اور یہ باتیں واقعی اسے مایوس کر دیا کرتی تھیں لیکن برہان کی تسلی اسے سب کچھ بھلا کر پھر سے مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔اسی کشمکش میں اتنے سال گزر گئے، برہان کی ٹریننگ بھی مکمل ہو گئی تھی اور آج وہ آنے والا تھا اور وہ اکیلا نہیں آرہا تھا بلکہ وصال رت بھی اس کے ہمراہ تھی۔وہ آج صبح گھر پہنچنے والا تھا اور آج شام امی کو لے کر ان کے گھر آنے والا تھا۔امی کو منانے کے لیے اس نے کیا کیا اور کتنے پاپڑ بیلے تھے یہ برہان ہی جانتا تھا۔موبائل کی آواز اسے پھر سے خیالوں سے کھینچ لائی، وہ خیالوں میں کتنے سالوں کا سفر کر آئی تھی اور وہاں ابھی تک موسم میں ہونے والی تبدیلیاں ہی زیر بحث تھیں۔گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی سکرین پر برہان کا نمبر نظر آرہا تھا وہ سب سے ایکسکیوز کرتی ہوئی موبائل لے کر تھوڑے فاصلے پر چلی آئی۔لیکن اس کے ہیلو کے جواب میں ایک اجنبی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے فون کان سے ہٹا کر ایک بار پھر نمبر دیکھا تھا کال تو برہان کے نمبر سے ہی آرہی تھی پھر یہ کون بول رہا تھا۔"دیکھئے محترمہ ہمارے پاس آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے، یہ فون جن صاحب کا ہے ان کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے۔آخری فون آپ کے نمبر پر کیا گیا تھا اس لیے ہم نے آپ کو فون کر دیا" وہ اور بھی جانے کیا کیا کہہ رہا تھا عروب نے سہارے کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارا لیکن قریب کچھ بھی نہ تھا دوسرے ہی لمحے موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور وہ خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئی، ٹیچرز اور بچیاں اسے اس طرح گرتے دیکھ کر اس کی طرف بھاگیں۔کوئی پانی لینے دوڑا تو کوئی اسے ہلا ہلا کر آوازیں دینے لگا، ایک ٹیچر نے ایمبولینس کال کر لی لیکن یہ سب بے سود رہا، وہ فون سنتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔اس کی ہر نا امیدی کو امید میں بدلنے والا جا چکا تھا اور اس کے بنا شاید ایک لمحہ بھی اس دنیا میں رہنا عروب کے لیے بے وفائی تھا۔تبھی وہ عہد وفا نبھانے برہان کے پیچھے چل دی تھی۔

☆☆☆

محبت کا دی اینڈ



ضرغام محمود

محبت منزل پاتے پاتے اچانک سے تائب ہو جائے تو...... عشق نمبر کے لیے ایک بہت منفرد کہانی

کبھی کبھی آدمی اپنی بے وقوفی سے ایسی صورتحال سے دوچار ہو جاتا ہے جس سے نکلنے کا راستہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج میرے ساتھ بھی ایسی ہی صورتحال پیش آئی ہوئی ہے۔ میں نے ایک اڑتے تیر کے سامنے اپنا سینہ بے وقوفی میں تان لیا ہے۔ میں نے ایک ازیل بیل کو سینگ مار کر اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے اور اب اس صورتحال سے نکلنے کا راستہ مجھے سجھائی نہیں دے رہا۔

میں آپ کو زیادہ کنفیوز نہیں کرتا ہوں اور اصل بات بتاتا ہوں۔ اصل میں مسئلہ میرے عزیز دوست فرید کا ہے۔ فرید میرا لنگوٹیا یار ہے۔ ہم دونوں نے اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک ساتھ تعلیم حاصل کی اور اب ساتھ ہی ہم دونوں ایک ہی دفتر میں نوکری بھی کررہے ہیں۔ فرید ایک یتیم، یسیر شخص ہے یتیم، یسیر ان معنوں میں نہیں کہ وہ کوئی سیدھا سادھا غریب بندہ ہے بلکہ ان معنوں میں کہ اس کے ماں اور باپ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ فرید اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے اس لئے اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں ہے۔ فرید کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب فرید میٹرک میں تھا مگر فرید کی والدہ نے نہایت خوش اسلوبی سے فرید کے لئے ماں اور باپ دونوں کا رول ادا کیا فرید کے والد بینک آفیسر تھے لہٰذا روپے پیسے کی تنگی کا مسئلہ بھی فرید کے ساتھ نہیں ہوا۔ پھر فرید تعلیم مکمل کر کے نوکری پر آیا تو اس کی والدہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور فرید بالکل تنہا رہ گیا۔ اب ایک جوان لڑکا جس کے پاس روپے پیسے کی کمی بھی نہ ہو یقیناً تھوڑا بہت تو بھٹکے گا لہٰذا فرید بھی تھوڑا سا لڑکھڑایا اور بھٹکا۔ کتنی ہی لڑکیوں سے فرید کی دوستی رہی اس سلسلے میں، میں صرف فرید کو قصوروار قرار نہیں دوں گا قصور ان لڑکیوں کا بھی تھا جو فرید کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں پھر فرید کبھی کبھی گانا وغیرہ سننے اس مخصوص علاقے میں بھی چلا جاتا تھا جہاں کا نام بھی شریف آدمی زبان پر نہیں لاتا نہ صرف یہ بلکہ ایک وقت میں فرید کو جوئے اور شراب کی لت بھی لگ گئی تھی مگر جلد ہی اس نے اپنے اوپر قابو پالیا اور شراب اور جوئے سے تائب ہو گیا مگر چونکہ وہ تنہا رہتا تھا لہٰذا کبھی کبھار کا شوق کر لیتا تھا میں نے کتنی مرتبہ اس سے کہا۔

''فرید شادی کرلے۔''

''مجھے جب بھی کوئی لڑکی پسند آئی میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس سے شادی کرلوں گا۔'' فرید کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا تھا

اس پسند ناپسند میں فرید تیس سال سے زیادہ کا ہوگیا

تھا حالانکہ ہم دونوں ہم عمر ہیں اور میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں اور میں دو نٹ کھٹ شرارتی بچوں کا باپ بن چکا ہوں۔

ہمارا دفتر جس بلڈنگ کی پانچویں منزل پر تھا اس بلڈنگ کی دوسری منزل پر ایک کارگو بکنگ آفس تھا۔ فارینہ اس کارگو بکنگ آفس میں کام کرتی تھی دفتر آتے جاتے فرید اور فارینہ کی دوستی ہوگئی اور جلد ہی یہ دوستی پیار میں بدل گئی۔ فارینہ اپنے نام کی طرح خوبصورت تھی وہ نہ صرف حسین اور خوش گفتار تھی بلکہ بلا کی ذہین تھی۔ وہ خوابوں میں رہنے کے بجائے عملی جدوجہد پر یقین رکھتی تھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسی لڑکیاں جو خوابوں میں رہنے کے بجائے عمل پسند ہو۔ وہ نہایت وفادار ہوتی ہیں اور بروقت صحیح فیصلہ کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتی ہیں۔

☆......☆

پھر ایک دن فرید نے مجھے اور میری بیوی کو اپنا بڑا بنا کر فارینہ کے گھر بھیجا تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ فارینہ کے ماں باپ بھی فارینہ کی طرح سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ انہیں فارینہ کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

اور پھر ایک شام پروقار تقریب میں فرید نے فارینہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی مگر...... مگر اب یہ انگوٹھی میرے سامنے میز پر پڑی ہے اور میرا منہ چڑا رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیسے اس انگوٹھی کو فرید کو واپس کروں اور کیسے اسے بتاؤں کہ فارینہ نے اس سے منگنی کیوں توڑی اور اس نے منگنی کی انگوٹھی واپس دیتے ہوئے کیا کہا۔

میں آپ کو پورا واقعہ بتاتا ہوں یہ آج صبح کی بات ہے فرید دفتر کے کام سے شہر سے باہر ایسی جگہ گیا ہوا ہے جہاں موبائل کے سگنل بھی نہیں آتے اور یہ سارا سیاپا ہوا بھی اسی وجہ سے ہے۔

میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے موبائل آن کر کے کان سے لگایا تو فارینہ کی میٹھی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی اس نے مجھ سے کہا۔



"سنو تم جلدی سے دفتر سے باہر آؤ مجھے تم سے انتہائی ضروری کام ہے۔"

فارینہ کی بات سن کر میں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور عجلت کے ساتھ دفتر سے باہر نکلا۔ باہر سڑک پر آ کر میں نے دیکھا کہ فارینہ اپنی کار میں بیٹھی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں جلدی سے اس کی کار کی جانب بڑھا اور اس کی کار کے قریب پہنچا مجھے اپنی کار کے پاس دیکھ کر فارینہ نے کار کا دروازہ کھولا تو میں کار کی فرنٹ سیٹ پر فارینہ کے برابر بیٹھ گیا۔

"میں کل رات سے فرید سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر اس سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔" میرے کار میں بیٹھتے ہی فارینہ بولی۔

"فرید دفتر کے کام سے سرحدی علاقے کی جانب گیا ہے وہاں موبائل کے سگنل نہیں آتے اس لئے تمہارا رابطہ فرید سے نہیں ہو پا رہا ہے" میں نے فارینہ کو جواب دیا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" فارینہ ہلکے سے بولی۔ "فرید آج رات واپس آ رہا ہے پلیز تم اسے یہ دونوں چیزیں دے دینا۔" فارینہ نے اتنا کہا اور اپنے ہینڈ بیگ سے ایک لفافہ اور ایک چھوٹی سے مخمل کے استر والی ڈبیہ نکالی اور دونوں چیزیں میری جانب بڑھائیں۔ میں ڈبیہ دیکھتے ہی پہچان گیا۔

"مہربانی کر کے یہ دونوں چیزیں فرید کو دے دینا۔"

"یہ...... یہ تو تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ اور ڈبیہ فارینہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" فارینہ نے مختصر سا جواب دیا میں نے غور سے فارینہ کے جانب دیکھا اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں شائد وہ رات بھر روتی رہی ہے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جس چیز کا مجھے اندیشہ تھا آخر وہی ہوا۔ فرید کے ماضی نے فرید کا مستقبل تباہ کر دیا۔

"فارینہ! تمہاری اور فرید کی تو پندرہ دن بعد شادی ہے۔" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"شادی تھی...... میں نے فرید کو اس خط میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ تمام وضاحتیں دے دی ہیں مہربانی کر کے یہ خط اور انگوٹھی فرید کو ضرور دے دینا اگر میرا فرید سے رابطہ ہو جاتا تو میں تمہیں یہ تکلیف نہیں دیتی۔" فارینہ دھیمے لہجے میں بولی۔

فارینہ کی بات سن کر میں نے افسردگی سے سر ہلایا میرے بدترین اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا اور سوچنے لگا پھر میں نے آہستہ سے فارینہ کو مخاطب کیا۔

"سنو فارینہ! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ فرید میرے بچپن کا دوست ہے ہم ساتھ کھیلے کودے ہے اور ہم دونوں نے اسکول سے لے کر یونی (یونیورسٹی) تک ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ میں اسے اندر اور باہر سے اچھی طرح جانتا ہوں وہ۔ وہ بہت۔ بہت اچھا لڑکا ہے بس تھوڑا نادان ہے۔ نادانی میں اس سے کچھ حماقتیں ہو گئی تھیں مگر پلیز تم...... تم نے جو کچھ فرید کے متعلق سنا ہے اسے بھول جاؤ اور فرید کو معاف کر دو۔"

"معاف کر دو؟" فارینہ کا لہجہ عجیب سے تھا۔

"دیکھو فارینہ! میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں تمہارے احساسات اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ جب تمہیں ہمارے دفتر میں کام کرنے والی شکیلہ اور فرید کے افیئر کا معلوم ہوا ہو گا تو تمہارے دل پر کیا گزری ہو گی مگر وہ سب فرید کا ماضی تھا حال اور مستقبل تو تم ہو۔ شکیلہ بہت چالاک لڑکی تھی اس نے اکیلا اور مالدار لڑکا دیکھ کر فرید کو پھنسا لیا تھا۔ شکر ہے فرید اس کے چنگل سے نکل گیا اور اب تو فرید نے تمام بری باتیں چھوڑ دی ہیں۔ فارینہ یقین کرو فرید کے متعلق جتنی باتیں لوگ کرتے ہیں ان میں نوے فیصد جھوٹ ہوتا ہے۔" میں نے فارینہ کو قائل کرنا چاہا۔

"مگر دس فیصد تو سچ ہوتا ہے نا۔" فارینہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں میں مانتا ہوں کہ فرید تھوڑا دل پھینک ہے۔ اس کی لڑکیوں سے دوستی رہی ہے مگر یہ سب ماضی کی باتیں تھیں جب وہ ڈرنک وغیرہ کرتا تھا مگر تم سے منگنی کے بعد اس نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ تم دیکھنا فارینہ شادی کے بعد وہ کیسا سدھر جائے گا۔ پلیز فارینہ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو" میں نے دھیمے لہجے میں فارینہ سے کہا۔ فارینہ چند منٹ گہری سوچ میں ڈوبی رہی پھر اس

نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے پھیلایا اور کہا۔

’’خط مجھے واپس کر دو۔‘‘

’’ضرور..... ضرور۔‘‘ میں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

’’فارینہ تم بہت ذہین اور معاملہ فہم لڑکی ہو۔ اس خط کی واپسی تمہاری سمجھداری کا ثبوت ہے۔‘‘ میں نے اپنی گود میں رکھا خط فارینہ کی جانب بڑھا دیا۔

’’بلاشبہ یہ خط واپس لے کر میں نے بہت سمجھداری کا کام کیا ہے۔‘‘ فارینہ دھیمے لہجے میں بولی اور لفافہ مجھ سے لے کر اسے چاک کیا اور اس میں سے خط نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’میرے پاس وقت بہت کم ہے تم جلدی سے اس خط کو پڑھ لو۔‘‘

’’نہیں..... نہیں ...... یہ تمہارا نجی خط ہے۔‘‘ میں نے انکار میں سر ہلایا۔

’’جلدی کرو میرے پاس وقت کم ہے۔‘‘ فارینہ تحکمانہ لہجے میں بولی اور خط زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دیا میں نے مجبوراً خط کے مندرجات پر نظر دوڑائی فارینہ نے لکھا تھا۔

پیارے فرید!

میں کل رات سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر تم شائد ایسی جگہ پر ہو جہاں موبائل کے سگنل نہیں آرہے ہیں اس لئے اس خط کے ذریعے تمہیں اطلاع دے رہی ہوں کہ گاؤں سے ماموں کا فون آیا تھا۔ گاؤں میں میرے نانا کا انتقال ہو گیا ہے اور ہم سب گاؤں جا رہے ہیں اب ہماری شادی کچھ مہینوں کے لیے منسوخ کرنی پڑے گی کیونکہ میری نانی اماں عدت میں بیٹھ گئی ہیں لہٰذا اب شادی چار چھ ماہ بعد ہی ہو سکتی ہے اور یہ منگنی کی انگوٹھی میرے ہاتھ میں بہت ڈھیلی ہے اور اس کا ہیرا بھی نکل رہا ہے تم نے کہا تھا کہ تم اس انگوٹھی کو ٹھیک کروا دو گے لہٰذا میں انگوٹھی اور یہ خط تمہارے عزیز دوست کو دے رہی ہوں۔ شہر واپس آ کر مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔

تمہاری اور صرف تمہاری

فارینہ

خط پڑھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ فارینہ نے ہاتھ بڑھا کر خط میرے ہاتھوں سے لے لیا اور اسے پرزے پرزے کر کے کار سے باہر ہوا میں اڑا دیا۔ میں نے انگوٹھی کی ڈبیہ اٹھا کر فارینہ کو دینی چاہی۔

’’اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے والدین نے صرف میری پسند کی وجہ سے کسی قسم کی چھان بین کیے بغیر اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے فرید کا رشتہ منظور کیا تھا۔ مگر آج آپ نے فرید کی ساری حقیقت مجھ پر واضح کر دی۔ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ فرید جیسے شخص سے شادی کرنے کا میرا فیصلہ بہت بڑا رسک ہے اور زندگی ایک بار ملتی ہے اور میں کم از کم ایسا رسک نہیں لے سکتی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے نادانستگی ہی میں سہی مگر اپنے دوست کی زندگی کی حقیقی تصویر میرے سامنے پیش کر دی۔ جب فرید واپس آئے تو اس کو یہ انگوٹھی واپس کر دینا اور کہنا کہ وہ ایسی لڑکی پسند کرے جو اس کو اس کی تمام برائیوں کے ساتھ اپنا سکے۔ جس کا اتنا حوصلہ ہو کہ وہ اس کی ہرجائی طبیعت برداشت کر سکے۔ میرا اتنا حوصلہ نہیں ہے۔‘‘ فارینہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی پھر اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور کہنے لگی۔

’’میرے والدین میرا انتظار کر رہے ہیں ہمیں گاؤں کے لئے نکلنا ہے۔ تو پلیز۔‘‘

میں فارینہ کا اشارہ سمجھ گیا اور انگوٹھی کی ڈبیہ اٹھا کر کار سے نیچے اتر گیا۔ میرے کار سے اترتے ہی فارینہ نے کار تیزی کے ساتھ آگے بڑھا دی۔ میں دور تک فارینہ کی کار کے سائلنسر سے نکلتے کالے کالے دھوئیں کو دیکھتا رہا جو میرے منہ پر کالک مل گیا تھا۔

اب میرے سامنے مخمل کے استر والی ڈبیہ رکھی ہے جس میں خوبصورت ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ فرید آج رات واپس آرہا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ فرید کو انگوٹھی کس طرح واپس کروں۔ اسے کیسے بتاؤں کہ اس کی منگنی توڑنے میں اس کے عزیز دوست نے کیا کردار ادا کیا؟

ناول

ایم اے راحت

زرد لومڑی

قسط:09

انتقام کی ایک نئی داستان، جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا۔
برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا معرکتہ الآرا سلسلہ

آرام کے دن میرے مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔ میں تو متحرک رہنے ہی کو زندگی قرار دیتی تھی۔ دل پھینک نوجوانوں کی تڑپ دیکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ میرا خوب صورت بدن اور خوب صورت چہرہ بہت





سے ہنگامون کا محرک تھا اور کبھی کبھی میں یہ کھیل بھی کھیلتی تھی۔ نوجوان مجھ پر ریجھ کر اپنی جیسی کوششیں کرتے اور میں انہیں کسی ویرانے میں لے جا کر ان کی سکائی کر دیتی تھی اس طرح ہاتھ پیروں کی تھوڑی سی ورزش بھی ہو جاتی تھی۔

لیکن ان دنوں میری راتیں بے خواب ہو گئی تھیں۔ مجھ پر ایک آسیب کا سایہ ہو گیا تھا جس کا نام عمران تھا۔ جس کا نام اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میں اسے دوسرے انداز میں سوچتی تھی۔ نہ جانے کیا کیا۔ تین دن کے بعد انکل وانچی نے کچھ اور انکشافات کیے۔

انکل وانچی بھی کمال کی شخصیت ہیں جس چیز کے پیچھے پڑ جائیں کر کے چھوڑتے ہیں انہوں نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔

''کورڈیل کی کالی بھیڑوں کی صفائی کے دوران وہ گارڈز جس نے تمہاری مدد کی تھی......''

انکل وانچی کے اس آغاز پر میں چونکی۔ میرے کسی سوال سے پہلے انکل نے میرے الگ کیس کا حوالہ دیا۔ پھر بولے۔ ''اور آخر میں نہیں بلکہ تازہ ترین ہیمر لیونسکی سازش کیس میں اونیو میں خصوصاً اونیو کا نام لے رہا ہوں کیونکہ اس وقت ہماری الجھن وہی ہے۔''

میری پوری توجہ انکل کی طرف تھی وہ بولے۔ ''وہ شخص ان تینوں کیسز میں تمہارے آس پاس رہا۔ اب میں تمہیں کچھ اور باتیں بتا رہا ہوں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی تبدیلیوں پر غور کیا گیا اور بہت سے عوامل سامنے آئے لیکن دنیا دوسری جنگ عظیم سے نہ بچ سکی اور دوسری جنگ عظیم بے شمار غم انگیز اور بھیانک یادیں چھوڑ گئی۔ اقوام متحدہ کا وجود بھی فعال نہیں رہا اور بین الاقوامی مسائل میں وہ صرف لکڑی کا گھوڑا ثابت ہو گئی۔ دنیا اس لیے گریز نہیں کر سکی اور وہ پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہے لیکن اسے صرف لنگڑا گھوڑا سمجھا جاتا ہے اور کسی بھی ملک کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سیاستدانوں نے بہت کچھ کیا لیکن پھر بین الاقوامی سرمایہ داروں نے سر جوڑ کر غور کیا اور کورڈیل وجود میں آئی۔ لیکن کورڈیل یہودی لابی کے لیے ناپسندیدہ ثابت ہوئی کیونکہ اس طرح بین الاقوامی تجارت جس میں وہ ایک کے چار نہیں ایک کے دس، بلکہ بیس بنا رہے تھے متاثر ہوئی اور انہیں مہنگائی کو آسمان تک پہنچانے کی کوششوں میں رکاوٹ کا احساس ہوا۔ چنانچہ انہوں نے علکوں کے ذمے دار خرید کر انہیں کورڈیل میں داخل کر دیا اور اس ادارے میں بھی ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔

چنانچہ یہ شعبہ بھی کافی حد تک فیل ہو گیا۔ دنیا بھر میں امن کے دشمن جو جنگیں کرا کے اپنے حق میں ہیں بلینوں ڈالر خرچ کر کے بین الاقوامی امن تباہ کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے لاتعداد سازشی ادارے کام کر رہے ہیں اور دنیا کے امن چین، جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور مہنگائی کے فروغ کے لیے نت نئے منصوبے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بھرپور کوشش ہے کہ دنیا میں امن نہ ہو اور ان کا کام جاری رہے چاہے دنیا تیسری جنگ کی لپیٹ میں کیوں نہ آ جائے۔

اس صورت حال کو محسوس کر کے دوسرے اہم لوگوں نے اپنے فرض کی ادائیگی کا آغاز کیا۔ یہ بہت بڑے بڑے سائنسدان اور فوجی سربراہ ہیں اور انہوں نے ساری پابندیوں سے ہٹ کر اپنے طور پر ایک ادارہ بنایا جسے انہوں نے ''پی فورس'' کا نام دیا۔ پی فورس کا کام یہ ہے کہ وہ ان سازشوں کو ناکام بنائیں جو بین الاقوامی امن کے لیے تباہ کن ہیں۔

اس بارے میں بڑی چھان بین کے بعد پی فورس کے عہدیداران کا انتخاب کیا گیا اور تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اس فورس کا سربراہ ایک ایسے شخص کو بنایا گیا جس کی کارکردگی پی فورس کا جس میں اس وقت

تیرہ ممالک کے نمائندے شامل ہیں، بنایا گیا ہے۔
چنانچہ مائی ڈیئر! ایپی پارک وہ شخص جیسا کہ تم نے بتایا کورڈیل کیس میں تمہاری مدد اس کے فرائض میں شامل تھی وہ بھی ان کالی بھیڑوں کو منظر عام پر لا کر ان کی پول کھولنا چاہتا تھا۔ یہی کیفیت ہیمر لیونسکی کیس کی ہے۔ جرائم پیشہ تنظیم ہیمر لیونسکی کو اغوا کر کے لائی چن لے گئی اور شو کیا کہ ہر کارروائی لائی چن کی ہے تاکہ لائی چن اور شائریکا کے درمیان بدترین چپقلش پیدا ہو جائے۔ انہوں نے اس کے بیوی بچے کو بھی اغواء کر کے ان کی جگہ نقلی بیوی اور بچہ فروکش کر دیا۔
اگر وہ ایکس نو ہی ہے جس نے اس کیس میں بھی تمہاری مدد کی ہے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پی فورس نے ہیمر لیونسکی کے اغواء کا فوری نوٹس لیا اور وہ تم سے پہلے ہانگ کانگ پہنچ گیا۔''
نہ جانے کیوں میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ عمران، گارڈ، او نیو، یا کوئی بھی وہ یہ سب میرے لیے نہیں کرتا تھا بلکہ وہ صرف اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ صرف اپنی ڈیوٹی۔ تاہم میں نے کہا۔
''مجھے اس کے بارے میں مزید تفصیلات درکار ہیں انکل۔ کسی وقت میرا اس سے تصادم بھی ہو سکتا ہے اس لیے مجھے اس کے پورے کوائف معلوم ہونا ضروری ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' انکل ترمودا وانچی نے کہا۔
ماڈرن درویش دنیا کے نیکوکاروں میں اپنی تاریخ رقم کر رہے تھے۔ انسانی روپ میں فرشتوں جیسی صفات رکھنے والے عبدالستار ایدھی، ماؤں کے وقار کا آسمان مدر ٹریسا جنہیں مرحوم کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے کہ فرشتے مرحوم نہیں ہوتے صرف چہرے چھپا لیتے ہیں۔ کیا لاوارث بچوں کو جھولوں سے نکال کر سینے میں چھپا کر پروان چڑھانے والے ایدھی کو بھی موت آسکتی ہے، موت ظالم نہیں ہے وہ تو صرف نقاب بانٹتی ہے۔ چہرے چھپ جاتے ہیں، بدن پوشیدہ ہو جاتے ہیں، نام نہیں چھپتے، عمل دفن نہیں ہوتے۔
چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا کام کر لو جس سے کسی کے دل کو سکون کا احساس ہو، کوئی روتے روتے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگے، تم نے آب حیات پی لیا۔ تم عام نگاہوں میں نہ سہی اپنے وجود میں زندہ جاوید ہو گئے۔ کیونکہ تم دنیا ہو، تم ازل ہو ابد ہو۔
کارل ڈی ساترے اور ترمودا وانچی اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ دن رات اپنے طلسم خانے میں کائنات کا گشت کرتے رہتے تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے اور جدید ترین ممالک اس پراسرار مملکت کو تسلیم کر چکے تھے۔ یہ مان چکے تھے کہ ان کی اب تک کی سائنس ابھی اس مملکت تک پہنچنے میں ناکام ہے۔ بہت سے میگزین اس کے بارے میں داستانیں گھڑتے تھے۔ بعض قیاس آرائوں نے تو حتمی فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ سوچی آرگینو خلا کے کسی نزدیکی سیارے پر ہے۔ وہاں سائنسدانوں کا پورا گروہ موجود ہے۔ انہوں نے اس سیارے کو کسی نامعلوم گیس کے حصار میں ملفوف کر لیا ہے اور وہاں نہ جانے کیا کیا خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ اگر وہ کہیں الجھتے تھے تو صرف اس بات پر کہ سوچی آرگینو کسی بھی بڑے سے بڑے کام کا معاوضہ صرف مصنوعی انسانی اعضاء کی تیاری میں مالی اور فنی مدد کی شکل میں وصول کرتا ہے اور ساری دنیا کے معذوروں کو کھلی دعوت دی گئی ہے کہ وہ دنیا بھر میں کہیں ہوں کسی بھی معذوری کی شکل میں اپنے ملک میں موجود سوچی آرگینو سے رابطہ کریں اور بلا معاوضہ مصنوعی اعضاء حاصل کریں اور اپنا علاج کرائیں۔ اس مناسبت سے انہیں ماڈرن درویش بھی کہا جانے لگا تھا جو بغیر کسی لالچ کے یہ نیک کام سرانجام دے رہے تھے۔
انہوں نے ایک روبوٹ ایجاد کیا تھا۔ گوشت پوست کی ایک مشین جوان کے خطرناک سے خطرناک مشن سرانجام دے رہی تھی اور اس کا نام تھا ایپی پارک۔

بڑے سادہ لوح تھے یہ دونوں بزرگ بلکہ یہ دونوں کمپیوٹر، سارتی دنیا انہوں نے اپنی مٹھی میں قید کر لی تھی لیکن ایک نوجوان لڑکی کے جذبات کے ابجد سے بھی نہیں واقف ہو سکے تھے۔ دراز قامت، عمر کا سب سے کافرسن، چمپئی رنگ، بھرا ہوا گداز بدن، ہرن کی طرح بھٹکی بھٹکی خوابیدہ آنکھیں، گلاب کی پنکھڑی کی طرح نازک سے سرخ لب، بدن پر بے قابو لباس جو بدن کی سرکشی پر قابو پانے میں ناکام، جس پر پڑنے والی نگاہ کچھ وقت کے لیے دنیا کے دوسرے جھگڑوں سے آزاد کردے۔ یہ دونوں مدبر یہ بھول گئے تھے کہ وہ اس کی میموری نہیں بدل سکے۔ اس کی رات کے سناٹے بھی چیختے ہیں۔ کائنات کی ان حقیقتوں میں بھٹکتے ہیں جن کے لیے حوا تخلیق کی گئی۔ اس تخلیق کا رخ اس کے مرکز کی طرف سے نہیں بدلا جا سکتا۔

ان کے کمپیوٹر مجھے خطرناک جسمانی تربیت دے رہے تھے۔ جدید ترین ہتھیاروں کا استعمال سکھا رہے تھے۔ مارشل آرٹس کے ایسے ایسے داؤ سکھا رہے تھے جن سے دشمن کو کسی بھی مشکل میں مجھ سے جنگ میں کامیابی نہ ہو لیکن وہ میرے اس دشمن پر غور نہیں کر رہے تھے جو نہ جانے کون سے چور راستے سے میرے سینے میں رینگ گیا تھا۔ گارڈ، الہ دین، اوینو اور عمران، ایکس ٹو، کمبخت میری تنہائیوں میں آ بسا تھا اور پرسکون لمحوں میں میرے بدن کی کسمساہٹ بن جاتا تھا۔ واہ جی انکل وانچی، واہ پاپا جی کسی طرح میرا علاج کرو۔

انکل وانچی زیادہ کام کی چیز تھے۔ پتا نہیں وہ میرے دل میں جھانک چکے تھے یا پھر اپنی عادت کے تحت وہ ایکس ٹو کی کھوج میں لگ گئے تھے۔

''تین ایسے اوزار ہیں جنہوں نے اپنے خاص مضامین میں اس بات کا شک ظاہر کیا ہے کہ محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر جنرل علی رحمان کا بیٹا علی عمران ہی ایکس ٹو ہے۔'' انکل نے بات شروع کی تو میں نے کافی کا پورا گرم گھونٹ حلق میں لے لیا اور وہ گلے سے لے کر پیٹ میں نیچے تک ایک گرم لکیر بناتا ہوا گزر گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے کان کھول لیے۔

''نمبر ایک، تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا۔ ایک بین الاقوامی مجموعہ جس نے فرانس کے الفانسے کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ نمبر دو، مارشل ریچوف روتن، کے جی بی کا سابقہ سربراہ اور نمبر تین پاپا ڈورسن، ایک پراسرار نامعلوم کردار۔ جو آج بھی آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ملکوں کے سربراہوں کے خفیہ راز طشت ازبام کیے ہیں۔ سرمایہ داروں کی خفیہ دولت کی تفصیلات دی ہیں جو حرف بہ حرف ٹھیک نکلی ہیں وغیرہ۔''

''تم ابھی تک عمران کے چکر میں پڑے ہو۔'' پاپا نے کہا تو مجھے ان کی بات پر بہت غصہ آیا۔

''یار وہ ایسا ہی کردار ہے۔ تھوڑی سی تفصیل سنو اس کے بارے میں۔ محکمہ سراغ رسانی کے ڈائریکٹر جنرل کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی ہے۔ اس کا باپ اسے دنیا کا سب سے نکما اور ناکارہ نوجوان سمجھتا ہے۔''

''ارے کیوں؟'' میں بے اختیار بول پڑی۔

''باپ کے اندازے کے مطابق وہ کچھ نہیں کرتا، نکما اور آوارہ گرد ہے۔''

''علی رحمان کو بھی نہیں معلوم کہ وہ ایکس ٹو ہے۔''

''نہیں وہ خود کو احمق پوز کرتا ہے اور حماقت کی حرکتیں کرتا رہتا ہے لیکن انہی حماقتوں میں اس نے وہ وہ کارنامے انجام دیے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ بات تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سائنسدانوں اور فوجی سربراہوں نے مل کر ''پی فورس'' نامی تنظیم بنائی ہے جو بین الاقوامی خوفناک سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ایکس ٹو اس فورس کا سربراہ ہے۔''

''او مائی گاڈ۔'' میرے منہ سے نکلا۔ ''اس کے ساتھ تو بے شمار لوگ ہوں گے۔''

''کچھ پتا نہیں چلا۔'' وانچی نے کہا۔
''ایکس ٹو کی حیثیت سے وہ تنہا ہے؟''
''نہیں سیکرٹ سروس کی ایک ٹیم اس کے ساتھ ہے۔ اس میں ایک سوئس لڑکی جو میا نافٹزواٹر ہے اور دوسرے اس کے ملک کے افراد ہیں سوائے ایک افریقی نژاد دیو کے۔''
''دیو؟''
''ہاں! اس کا نام جوزف ہیریس ہے۔ دنیا کا خطرناک ترین باکسر ہے جو اپنے مکے سے دیوار ہلانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس نے ایک شرط رکھی تھی کہ جو کوئی باکسنگ میں اسے ہرا دے گا وہ باقی پوری زندگی اس کی غلامی کرے گا اور عمران نے اسے اتنی بار ناک آوٹ کیا ہے کہ جوزف کو اس کی گنتی بھی یاد نہ ہوگی اور اب وہ عمران کا غلام ہے۔
میں نے ایک بار پھر ایک جلتا ہوا کافی کا گھونٹ لیا جو اس وقت مجھے بہت سکون دے رہا تھا۔ میرے منہ سے ''ہائے'' نکلنا چاہتی تھی جسے میں نے بمشکل روکا تھا۔ بے اختیار میرا دل چاہا تھا کہ کاش وہ مجھے بھی اتنی بار ناک آوٹ کرے کہ اس کی گنتی بھی یاد نہ رہے۔
دن رات برباد کر دیئے انکل وانچی نے میرے۔ بس میرے خیالوں میں رہتا تھا۔ کمبخت کو خدا غارت کرے میری رات میری نیندوں میں آجاتا تھا اور بس، میں ایلی پارک جیسی خطرناک لڑکی سے ایک رومانوی بھری دوشیزہ بن جاتی تھی۔
مگر وہ کیا تھا۔ کبھی کبھی میں اس میں کھو کر اسے تلاش کرتی تھی۔ کیا وہ بھی مجھ سے متاثر ہے مگر سوچ کی حقیقیں مجھے اداس کر دیتی تھیں۔ ابھی تک کی ملاقاتوں میں ایسا کوئی تاثر نہیں ملتا تھا۔ وہ جتنی بار بھی ملا تھا کسی خطرناک کیس میں مصروف ملا تھا۔ آخری بار ہیر لیونسکی کیس کو بھی فائنل ٹچ اس نے دے دیا تھا ورنہ شاید میں لیونسکی کو شائر یکالانے میں کامیاب نہ ہو پاتی۔
میرے مقدر، میں اس پر گولیاں برسا رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ کاش منحوس اپنی اصلی شکل میں مسکراتا۔ اس وقت تو اس کے مکروہ دانت اس کے ہونٹوں پر رکھے ہوئے تھے توبہ۔ میں نے سونے کی آخری کوشش کی اور کامیاب ہوگئی۔

☆......☆

دوسری صبح ناشتے کی میز پر مثلث مکمل تھا۔ یعنی میں، انکل وانچی اور مسز ساترلے، مسز ساترے کا بایاں گال بار بار پھڑک رہا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ کوئی کیس ان کی مٹھی میں آگیا ہے۔ تب انہوں نے اظہار کر ہی دیا۔
''دو باتیں ہیں ایلی ڈارلنگ۔ نمبر ایک آج سے نو دن بعد سترہ اگست کو ہمیں ایک کیس کی تفصیلات ملنے والی ہیں۔''
''گڈ۔'' میں نے مختصراً کہا۔
''دوسری بات یہ کہ لیگ اسکوائر کے بنگلہ نمبر بیس میں تمہیں مسٹر امر پال جی سے ملنا ہے۔ امر پال مکر جی سری لنکا کے رہنے والے ہیں ہم نے انہیں کمپیوٹر پر دریافت کیا ہے اور تمہارے لیے ہائر کر لیا ہے۔''
''اوہ گڈ! تو آپ میری شادی کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''ایں...... شادی...... یہ کس نے کہا۔''
''تو پھر آپ نے یہ کس سلسلے میں دریافت کیا ہے۔'' میں نے کہا اور انکل وانچی کے حلق سے بطخ جیسی

آواز نکلی جب وہ قہقہہ روکنے کی کوشش کرتے تھے تو ان کے منہ سے ایسی ہی آواز نکلتی تھی۔

''وہ ایک ماہر خنجر زن ہے۔ خنجر کے استعمال میں جو فن اس کے پاس ہے شاید دنیا میں کسی کے پاس ہو۔''

''اور اب وہ فن میرے پاس بھی آجائے گا۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''ٹھیک ہے پاپا جان کیا اس کی رہائش اسی بنگلے میں ہے۔''

''ہاں میں نے اسے کرائے پر حاصل کرلیا ہے اور اسے وہ رہائش گاہ دی ہے۔''

''او کے مجھے کب سے جانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''آج سے۔'' مسز سارتر ے نے کہا۔

☆......☆

امریال مکرجی واقعی باکمال شخص تھا۔ اس نے بچپن سے لے کر 53 سال تک کی عمر ایک سرکس میں گزاری تھی اور خنجر زنی کے کمالات دکھا تا رہا تھا۔ پھر کسی بات پر اس کے مالک سے اختلاف ہو گیا اور اس نے سرکس چھوڑ دیا۔ دو ہی دن میں وہ مجھ سے بہت متاثر ہو گیا۔

''آخر تم خنجر زنی سیکھ کر کیا کرو گی۔ تم جیسی نازک اندام لڑکی سے تو کوئی دھمکی دے کر یہ خنجر چھین سکتا ہے۔''

''بس مجھے شوق ہے۔'' میں نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔

تیسرے دن اس نے کہا۔ ''تم لڑکی ہو یا چھلاوہ۔''

''کیوں؟''

''جس قدر نازک نظر آتی ہو، اتنی نہیں ہو۔'' تیسرے دن اس نے کہا۔ ''جیمس پیٹر سے میری بات کراؤ۔''

''کون جیمس پیٹر۔''

''تمہاری فرم کا منیجر۔ جس نے مجھے یہاں بلایا ہے اور یہ سارے انتظامات کیے ہیں۔'' میں سمجھ گئی کہ مسز سارتر ے اور انکل داچی نے اسے یہاں بلانے کے لیے اس فرضی نام کا سہارا لیا ہے۔''

''آپ ان سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں مسٹر پال؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے تم سے خنجر زنی سیکھنے کے لیے بلایا ہے یا سکھانے کے لیے، تم مجھ سے اچھی خنجر باز ہو۔''

چھٹے دن اس نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ ''بس میرا کام ختم ہو گیا۔ اب میرے پاس تمہیں سکھانے کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔ ساتویں دن وہ اپنے سامان سمیت بھاگ گیا۔'' انکل داچی نے خوب ہنستے ہوئے کہا۔

''تم نے اسے نروس کر دیا۔ بے چارہ اپنا معاوضہ بھی چھوڑ بھاگا۔''

نویں دن مجھے بڑی میٹنگ میں بلایا گیا۔ اس بڑی میٹنگ کے شرکا بھی یہی تین جاندار ہوتے تھے۔ بس اس میں چوتھا ممبر وہ کمپیوٹر ہوتا تھا جس میں کسی کیس کے ضروری کوائف ریکارڈ ہوتے تھے۔ کمپیوٹر اس وقت بھی موجود تھا اور پاپا اسے آپریٹ کر رہے تھے۔

''تفصیل موصول ہو چکی ہے۔ ہمارے کلائنٹ، یعنی شائر یکا فیر ونز اور دوسرے ہم پر مکمل بھروسا کر کے اپنے اہم ترین راز ہمیں سونپ دیتے ہیں۔ انہوں نے ہم پر عنایات کے خزانے کھول دیے ہیں اور ہمیں ہر آسانی فراہم کر دی ہے لیکن ایک اہم اور دلچسپ بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔''

''وہ کیا پاپا؟''

''سیاست دنیا کی سب سے انوکھی چیز ہے۔ ان میں دوستی چند لمحوں میں دشمنی میں بدل جاتی ہے اور دشمنی اس سے بھی کم وقت میں دوستی میں۔''

''میرے لیے نصیحت بھی ہے اور معلومات میں اضافہ بھی۔''

''چنانچہ یہ بھی مت سوچنا کہ لائی چن اپنے کسی بڑے مفاد کے لیے شائریکا، فیروئر یا آرُوس کے ساتھ رعایت کرے گا۔ اس کے پس پردہ کوئی خطرناک کام بھی ہوسکتا ہے۔ میں یہ بات کسی خاص مقصد کے تحت نہیں کہہ رہا صرف تمہارے ذہن میں محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔''

''محفوظ ہوگئی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''دوسری بات چونکہ اب دنیا کے بیشتر ممالک ہماری افادیت اور کارکردگی بلکہ اعلیٰ کارکردگی کو دل سے مان چکے ہیں اور پورے خلوص سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم ان کے لیے بے مثال اور ناگزیر ہیں۔ چنانچہ ہمیں ہر طرح کی مراعات کی پیشکش کی گئی ہے اور ایک ایسے مشترکہ نشان کی منظوری دی گئی ہے جس کے تحت ہمارے مربی ممالک ہمیں ہر جگہ آسانی سے فراہم کریں گے۔''

''واہ! آپ کام بڑھاتے جارہے ہیں پاپا۔''

''لیکن دلچسپ بات دیکھو ہم نے ایک ہی مشین ایجاد کی ہے اور اسی پر انحصار کیا ہے۔ یعنی انی پارک۔'' اس بار انکل وانچی نے کہا لیکن ان کے لہجے کے فخر اور پیار کو میں نے محسوس کیا تھا۔

''میں مشین ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں فلائنگ مشین۔'' وانچی نے کہا۔

''ایک خاص بات بتاؤں آپ کو۔''

''ہاں ضرور۔''

''میں مشین نہیں ہوں۔'' اس نے بڑی رازداری سے کہا اور انکل وانچی نے زبردست قہقہہ لگایا پھر پاپا کی طرف رخ کر کے بولے۔

''سنا تم نے سنا تم نے! یہ وارننگ ہے۔'' اور خوب قہقہے پڑ رہے تھے پھر پاپا نے کہا۔

''انہیں دوست ممالک نے ہمیں ہمارے کام میں آسانیاں دینے کے لیے سوپی آرمنوز میں بظاہر دوسری نوکریاں کرنے والے خاص نمائندوں کو خصوصی لائسنس جاری کیے ہیں جن کے تحت وہ ہمارے لیے مقامی طور پر کام کرسکتے ہیں اور انہیں وہاں کے انتظامی محکموں کی معاونت حاصل ہوگی۔ یعنی جہاں کام کررہی ہوگی وہاں ضرورت پر تمہیں اپنے آدمی حاصل ہوں گے جو بہترین فوجی تربیت یافتہ اور ذہین ہوں گے۔ ایسے بہت سے لوگ بہت سے ملکوں میں اپائنٹ کیے جاچکے ہیں ان کے کوڈ تمہیں بتا دیئے جائیں گے۔''

''کمال کیا ہے آپ نے، کیا ہر ملک کے نمائندوں کے لیے الگ کوڈ ہوگا۔''

''نہیں صرف ایک۔''

''بتائیے۔'' میں نے کہا۔

''زرد لومڑی۔'' پاپا نے کہا۔'' اور میرے دل کو دھکا لگا۔ یہ نام اس نے دیا تھا اور میں نے پاپا کو بتایا تھا۔ پاپا کو میں نے اپنے تاثر کا اندازہ نہیں ہونے دیا اور کہا۔

''اب جو ذمے داری اس بار مجھے دی جارہی ہے اس کے بارے میں بتائیے۔''

''ہاں صورت حال اس بار مختلف ہے۔ تمہیں لندن جانا ہوگا۔'' پاپا نے کہا اور میں بے اختیار ہنس پڑی۔

''یہ لندن میری جان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ جتنا میں اس سے نہیں رہتی اتنا لندن مجھ سے رہتی ہے۔''

''لیکن اس بار تمہیں لندن کا سفر بھی خود مختلف طریقے سے کرنا ہوگا۔ خیر وہ بعد کی بات ہے۔ میں پہلے تمہیں مختصر تفصیل بتا دوں کیونکہ بعد کی تفصیل تمہیں مجھے بتانی ہوگی۔''

''آپ بڑی پراسرار گفتگو کر رہے ہیں پاپا، بتائیے۔'' میں نے کہا اور مسٹر ساتر ے ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ کچھ سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔

اینڈوسنا کی گارس ایک ابھرتا ہوا سائنسدان تھا اور جنگ عظیم دوم کے آخری دنوں میں نازی حکومت کے لیے ریسرچ کا کام کر رہا تھا۔ 1944ء میں اس نے ایک انتہائی خوب صورت لڑکی لتیا ایمبر ون سے شادی کر لی۔ یہ حسین قتالہ کمیونسٹ تھی اور اس کا شمار پارٹی کے آرگنائزروں میں ہوتا تھا۔ گارس کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے کام سے دلچسپی رکھتا تھا اور اپنی بیوی سے عشق کرتا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد لینا نے مشرقی جرمنی کا انتخاب کیا اور گارس نے اپنی بیوی کے ایما پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گیا۔ پھر 50ء میں وہ مغربی جرمنی بھاگ آیا۔ اس نے بیان دیا کہ وہ وہاں کمیونسٹ جبر و تشدد سے تنگ آ کر مشرقی جرمنی چھوڑ آیا ہے نیز اس کی کمیونسٹ بیوی نے بھی اس سے بے وفائی کی جس کی بنا پر اس نے بیوی کو چھوڑ دیا۔ اس نے درخواست کی وہ اس کی بیٹی کو بھی نکال لائیں جو وہاں 49ء میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس کی پرورش غیر کمیونسٹ ماحول میں کرنا چاہتا ہے۔ اس سے وعدہ کیا گیا کہ یہ کوشش کی جائے گی لیکن اس وعدے کا ایفا نہ کیا گیا تو وہ بددل ہو گیا اور اس نے یہ کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس دوران اس کی بیوی کو پارٹی کی طرف سے بوڈاپسٹ میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا اور وہاں اس نے مقامی پارٹی میں بڑا مقام حاصل کر لیا۔ وہ اپنی لڑکی کو جس کا نام ایزونا ہے ساتھ لے گئی تھی۔

ناکی گارس نے بیٹی کے حصول کے لیے جو راستے اختیار کیے وہ اس کے لیے زبردست نقصان دہ ثابت ہوئے۔ وہ چوری چھپے مشرقی جرمنی میں داخل ہوا تو اس کی مخبری ہوگئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی سزا صرف موت تھی لیکن اسے پیشکش کی گئی کہ اگر وہ اپنے چھوڑے ہوئے کام مکمل کر لے تو اسے زندگی دی جا سکتی ہے۔ وہ اس پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے شرط پیش کی کہ اس کی بیٹی اس سے ملتی رہے گی جسے منظور کر لیا گیا۔ اس نے بیٹی سے روابط بڑھائے اور ایک بار پھر مغربی جرمنی فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ایزونا ماں کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی اور گارس ناکام ہو گیا۔ اس نے ہر طرف کوششیں کیں لیکن بیٹی کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کی بیوی لیتا گارس کو انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے پرتگال بھیجا گیا لیکن وہ یہاں ناکام ہوئی اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ اب وہ لڑکی باپ کے ساتھ آنے پر آمادہ ہے لیکن یہ کام حکومت شاریکا کے تعاون سے کیا جا رہا ہے اور شاریکا نے ہم سے رابطہ کیا ہے۔ اور ہم نے تم سے۔''

آخر میں پاپا نے مزاحیہ بننے کی کوشش کی لیکن میں سنجیدگی سے اس پوری کہانی پر غور کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''لیکن پاپا، شاریکا نے اتنی بڑی ذمے داری کیوں قبول کر لی۔''

مسٹر ساتر ے مسکرا دیے۔ انہوں نے وانچی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اور میں نے کہا تھا کہ اپنی بارک میں زبردست امپرووسنٹ ہوا ہے۔ چلو دکھاؤ۔ ان کے خاتمے کے ساتھ میں مسٹر وانچی نے کمپیوٹر آن کر دیا۔ اس پر ایک پچپن سالہ شخص کی تصویر نمایاں ہوئی پھر ایک آواز ابھری۔

''یہ مسٹر جیک اول ہیں۔ شمسی توانائی پروجیکٹ کے انچارج۔ ایک مایہ ناز سائنسدان جن کی حفاظت اور صحت کے لیے شاریکا حکومت ہر ماہ ایک کروڑ ڈالر خرچ کرتی ہے۔ مسٹر اول گارس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

بے حد عمر رسیدہ شخص کی آواز ابھری۔

''نا کی گارس بے حد غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ میرے مدمقابل شمسی توانائی حاصل کرنے کے تجربات کرتا رہا ہے۔ اس نے ان تجربات پر پورا عبور حاصل کرلیا ہے اور وہ کسی بھی وقت اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو عالمی معیشت اور اقتصادیات میں ناقابل یقین انقلاب برپا ہوسکتا ہے جس ملک کے لیے وہ کام کررہا ہوگا اسے سپر پاورز میں برتری حاصل ہوجائے گی کیونکہ شمسی توانائی سے تعمیری اور تخریبی، دونوں کام لیے جاسکتے ہیں اندازہ ہے کہ یہ کامیابی اس کی مٹھی میں ہے اور وہ اس راز کو ذہن میں محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے وہ اس دور کا سب سے بڑا سائنسدان ہے۔''

بزرگ سائنسداں خاموش ہوا تو مسٹر واچی نے کمپیوٹر آف کردیا۔

کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر مسٹر ساترے نے کہا۔

''ایک بار پھر تمہاری ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو آواز دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ اور عوامل بھی ہیں۔''

''کیا پاپا!''

''دنیا ایسے معاملات سے غافل نہیں رہتی۔ جدید ترین ترقی یافتہ ممالک اب عالمی سازشوں اور اس طرح کے معاملات کو کمپیوٹر کے تعاون سے دیکھتے ہیں۔ قارس کا معاملہ بہت سے ملکوں کے سامنے آچکا ہے اور وہ اونٹ کا تعاقب کررہے ہیں۔ یہ خوشی کی بات بھی ہے اور تشویش کی بھی کہ اب تمہاری تلاش بھی جاری رہتی ہے، تم کہاں ہو۔ کیا کررہی ہو۔ یہ سب جاننا چاہتے ہیں۔ خود شاریکن، ایروسس اور دوسرے ملکوں کے ایجنٹ دن رات تمہاری ٹوہ میں رہتے ہیں اور لندن تو تمہاری ننھیال بن چکا ہے۔ وہاں تمہارے بدن کی خوشبو ریکارڈ کرلی گئی ہے جہاں تم نے ایئرپورٹ پر قدم رکھا تمہاری خوشبو نشر ہوگئی۔ چنانچہ اس بار تمہیں خاص طریقے سے لندن پہنچایا جائے گا۔ وہاں ایک چھوٹا سا کام کرکے تمہیں شاریکا پہنچنا ہوگا۔''

مسٹر ساترے مجھے میرا پورا پروگرام بتانے لگے۔

☆......☆

انسان بے شک ہر طرح مطمئن ہو لیکن اس کی زندگی میں سب سے مہلک چیز یکسانیت ہوتی ہے۔ آپ تخت طاؤس پر بھی بیٹھ جائیں تو کچھ وقت کے بعد اکتا جائیں گے۔ میری زندگی میں سب سے شاندار چیز یہی تھی کہ یکسانیت نہیں تھی۔ ہر طرح کی ذہنی اور جسمانی بھاگ دوڑ، خطرات تبدیلیاں، جن کے اثرات مجھے اپنے دل و دماغ پر ہی نہیں جسم پر بھی محسوس ہوتے تھے اور میں زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہورہی تھی۔

مسٹر ساترے اور مسٹر واچی کے مشترکہ منصوبے کے تحت مجھے فلوریڈا پہنچنا تھا یہاں تین دن قیام کے بعد لندن روانہ ہوجانا تھا۔ وہاں ایک شخص سے ملاقات کرلی تھی جو بظاہر سوچی آرگنیو گا ایک ورکر تھا لیکن درحقیقت مسٹر ساترے کے عسکری ونگ کا ایک نمائندہ تھا۔ اس شخص سے کوئی پیغام لے کر مجھے کچھ اور اہم کام کرنے تھے۔

وقت مقررہ پر میں فلوریڈا روانہ ہوگئی۔ مجھے بتادیا گیا تھا کہ فلوریڈا کے ڈولفن میں میرا کمرہ بک ہوچکا ہے۔ فلوریڈا میرے لیے نئی جگہ نہیں تھی۔ میں بہت بار یہاں آچکی تھی اور ڈولفن میرا پسندیدہ ہوٹل تھا جہاں کے کمرے، کھانے اور نت نئے خوب صورت پروگرام مجھے بہت پسند تھے۔

میں بہترین موڈ میں فلوریڈا آگئی اور ڈولفن سے لطف اندوز ہونے لگی لیکن ایک بدبخت نے میرے

حواس پر مکمل سواری گانٹھ رکھی تھی۔ خود بخود میں اس کے خیال میں ڈوب جاتی تھی۔ پتا نہیں وہ کوئی جادوگر تھا یا کیا تھا۔ بس یہی سوچتی تھی کہ اب وہ کون سے روپ میں میرے آس پاس ہوگا۔

ایک خاص فون نمبر مجھے دیا گیا تھا جسے چوتھے دن مجھے استعمال کرنا تھا۔ سائرے کے مقرر کردہ نمائندے مجھے لندن کے لیے روانہ کرنے والے تھے۔ چنانچہ چوتھے دن صبح ناشتے کے بعد میں نے فون کر دیا۔

''زرد لومڑی۔''

''یس میڈم! ہم تیار ہیں۔ شام سات بجے کام شروع ہو جائے گا۔''

''اوکے۔''

ٹھیک سات بجے میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور تین آدمی اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی شناخت کرائی۔ ان میں سے ایک نے میرے چہرے پر کوئی ستر سالہ بوڑھی عورت کا میک اپ کیا۔ وہ میرے لیے اس طرح کا لباس بھی لائے تھے۔ سر پر سفید بالوں کی وگ لگانے کے بعد میں باہر آ گئی۔ مجھے اس میک اپ میں بہت مزہ آ رہا تھا۔ میں نے اپنی چال بھی بوڑھیوں جیسی بنالی تھی۔

''ونڈر فل مسی۔'' ان میں سے ایک نے تعریفی لہجے میں کہا۔

جس شخص نے میرا میک اپ کیا تھا اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ یقین کریں آپ کا میک اپ کرتے ہوئے میرے ذہن میں اپنی نانی کا خیال آ گیا تھا اور میں نے آپ کی شکل انہی جیسی بنا ڈالی۔ اب میں خود حیران ہوں کہ آپ انہی کے انداز میں چل بھی رہی ہیں۔ اگر میری نانی بھی آپ کو دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں گی اور سوچیں گی کہ ان کی کوئی جڑواں بہن تو نہیں تھی۔

پھر ایک فلائٹ نے مجھے فلوریڈا سے لندن پہنچا دیا۔ راستے پر جہاز کے عملے نے مجھ بوڑھی عورت کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔ ایئر پورٹ سے بھی کچھ اجنبی چہروں نے زرد لومڑی کے کوڈ کے ساتھ مجھے ریسیو کیا اور ایک خوب صورت فلیٹ میں پہنچا دیا جہاں میں تنہا تھی۔

فلیٹ بھی میرے شایان شان تھا۔ تھی بھی بہت عمدہ جگہ۔ یہاں سے بکاڈلی اسکوائر سامنے نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے کشادہ کمرے تھے اور شاندار بیڈ روم۔ انگڑائیاں لیتے ہوئے وہ پھر میرے پاس آ گھسا۔

''اے تو کیا میرے اس وقت اس کیس میں تیری انٹری کب اور کس شکل میں ہوتی۔ خدا کے لیے اب کسی منحوس شکل میں میرے سامنے مت آنا۔'' میں نے کہا اور خود ہی ہنس پڑی۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کیا بے تکا کردار ہے۔ ایک طرف ایک شاطر اور خطرناک لڑکی اور دوسری طرف کسی کی محبت میں ڈوبی ارمان بھری۔ اپنی سوچ بتاؤں، محبت کا احساس، کسی کی چاہت زندگی کا انمٹ ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں اور کارکردگی سست پڑ جاتی ہے۔

عمران! گر وہ تم ہی ہو۔

میرے منہ سے نکلا اور میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ محبوب کے تصور نے آنکھیں بند کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنی دیر اس کی آغوش میں سمٹی ہوئی کسمساتی رہی کہ سیل پر وائبریشن ہوئی اور میں نے اسے آن کر لیا۔

''میرا نام موزرین جیمز ہے اور میں زرد لومڑی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کرو۔'' میں نے کہا۔

''رات آٹھ بجے ٹاور برج لندن کے سامنے مجھے دریائے ٹیمز کے پاس آ کر ملیے۔''

''او کے اور کچھ.....''
''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

☆......☆

لندن بہت خوب صورت ہے۔ سات دن جاگتا ہے لیکن کہر کا غلاف اسے ہر وقت خود میں لپیٹے رہتا ہے۔

اس وقت بھی بھیگا بھیگا لندن کہر کے دبیز غلاف میں لپٹا ہوا تھا۔ موسم تو ایسا تھا کہ گرم بستر میں کسی بالوں بھرے گرم سینے پر رخسار رکھ کر سو جاؤ۔ گہری آسودہ نیند لیکن یہ وہ تمنا ہے جسے پوری ہونے کے لیے بے شمار مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ذمے داری، ذمے داری ہوتی ہے اور مسز سارتر ے کی بنائی ہوئی ان میں آ رہی کے لیے بھلا یہ کہاں ممکن تھا۔

پونے آٹھ بجے میں فلیٹ سے نکلی تو باہر بغلوں میں منہ چھپائے پلکیں جھپکاتی ہوئی شرمائی شرمائی روشنیاں نظر آئیں۔ ان میں جو روشنیاں متحرک تھیں وہ کاروں اور دوسری گاڑیوں کی تھیں۔ انہی میں سے ایک متحرک روشنی میرے پاس آکر رک گئی۔ یہ ٹیکسی تھی۔ میں دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور میں نے ڈرائیور کو پتا بتا دیا۔

مطلوبہ جگہ پہنچ کر میں ٹیکسی سے اتری تو کہر کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔
''اگر تمہیں وقت نہ ہو تو یہیں میرا انتظار کرو۔''
''یس میڈم! میں یہاں ہوں۔''

مہذب انگریز نے کہا اور میں اندازے سے پل کی طرف چل پڑی۔ پل کی ریلنگ ایک آدھ جلتا سگریٹ نظر آیا جس سے پتا چلتا تھا کہ اور بھی لوگ ہیں جو اس موسم میں گرم کمروں میں ہونے کے بجائے دوسری ذمہ داریاں پوری کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی کسی کو ٹائم دیا ہو یا پھر وہ ٹھنک اچھے ہوں جو سیاحوں کی تاک میں ہوں۔

میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹاور کے سامنے ریلنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وقت ہو چکا تھا چنانچہ کچھ ہی لمحوں کے بعد کہر کے ایک حصے نے ایک ہیولے کی شکل اختیار کر لی جو خاص طور سے اپنے وزنی جوتوں کی ٹھک ٹھک کرتا میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنے لمبے کوٹ کے کالر ابھار رکھے تھے اور فلیٹ ہیٹ کو ماتھے پر جھکا رکھا تھا ہاتھوں تک پر ربر کے دستانے پہنے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر دریا کی طرف منہ کر کے ریلنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''انگلینڈ کی شناخت دریائے ٹیمز سے ہوتی ہے۔'' اس کی بھاری آواز ابھری۔
''پانی کی سطح پر کبھی کبھی زرد لومڑی جیسی دوڑتی نظر آتی ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ فاصلہ ختم کر کے میرے قریب آ گیا۔ پھر تعبیر کی تمہید کے بعد بولا۔
''پہلا پیغام آج سے پندرہ دن پہلے ملا تھا اور دوسرا پرسوں ملا ہے۔ پہلے پیغام میں کہا گیا تھا کہ مارک جیفر ایمن کوٹ کے ساتھ بارہ بجے کی فلائٹ سے آ رہا ہے، اس کے پاس سامان نہیں ہے بس وہ مستقبل کا تحفظ چاہتا ہے لیکن دوسرے پیغام میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔''
''تفصیل کا الوضاحت چاہتا ہے۔''
''اس میں کہا گیا ہے کہ پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ پھر کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔'' وہ الجھے الجھے انداز میں خاموش ہو گیا۔

''کیا؟'' میں نے کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار کر کے کہا۔ وہ کس قدر کھو گیا تھا۔ چنانچہ اس کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''اس کے بعد نشریات متاثر ہو گئیں۔ صرف ایک آواز سنائی دی۔ 'نیلا بھیڑیا، نیلا بھیڑیا۔' بس چند لمحوں کے لیے یہ نشریات متاثر ہوئی تھیں اور کچھ الفاظ درمیان سے نکل گئے تھے۔ صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ شاید اسے قتل کر دیا گیا تھا۔''

''اوہ۔'' میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا تو وہ بولا۔

''اس سے زیادہ معلومات نہیں حاصل ہو سکیں۔ نیلا بھیڑیا اہم نام ہے۔ اصل میں ایروی بلاک سے فرار ہو کر آنے کے کچھ راستے بے حد خطرناک ہیں اور انہیں عبور کرنے کے لیے کچھ مخصوص کوڈ میں جن کی تلاش جاری ہے۔ میرے پاس تمہارے لیے آئندہ کی مصروفیات موصول ہو گئی ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ زرد لومڑی اپنے کام سے واقف ہے۔ جس کے آگے کا شیڈول اسے دیا جائے۔

اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ سوچی آرگنیو کے اس لفافے کو میں اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ اسے بڑی تکنیک سے تیار کیا گیا تھا۔ میں نے لفافہ لے کر احتیاط سے اپنے اندرونی لباس میں رکھ لیا۔ پھر سرد لہجے میں کہا۔

''اور کچھ......!''

''نہیں۔'' وہ بھی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اس سے فرمائش کروں کہ وہ اپنا چہرہ دکھا دے۔ لیکن اس سے زیادہ احمقانہ فرمائش اور کوئی نہ ہوتی چنانچہ میں نے خود کو سنبھال لیا اب وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ کوئی رسمی لفظ نہ کہا گیا اور ہم دونوں واپسی کے لیے مخالف راستوں پر مڑ گئے۔ میں اپنے اطراف سے پوری طرح محتاط تھی۔ کسی بھی طرف سے مجھ پر حملہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت یہ لفافہ میرے لیے بے حد قیمتی تھا جس میں مجھے اس سے آگے کے اقدامات کی ہدایت تھی۔

میرا ٹیکسی ڈرائیور میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے میرے ہوٹل چھوڑ دیا اور میں اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ ضروری امور سے فراغت کر کے میں بستر میں داخل ہو گئی اور سب سے پہلے میں نے اس پر اسرار شخص کا تجزیہ کیا جس سے ملاقات کر کے آئی تھی۔ اس کا قد و قامت، اس کے بولنے کا انداز، اس کی تو ند......! نہیں وہ عمران نہیں ہو سکتا۔ عمران کے انداز میں کوئی بات تھی۔ کوئی ایسی بات جو کسی بھی شکل میں اسے منفرد ظاہر کرتی تھی۔

اور مس ایلی پارک، کہیں یوں نہ ہو کہ تمہیں خود سے نفرت ہو جائے۔ کیوں اپنی شخصیت کو خاک میں ملا رہی ہو۔ لوگ تمہارے لیے تڑپتے ہیں اور تم ایک ایسے شخص کے لیے تڑپ رہی ہو جس نے تمہیں اپنی صورت تک دکھانا پسند نہیں کی۔

میں نے خود کو خوب برا بھلا کہہ کر تیز روشنی کی اور لفافہ کھول لیا۔ اس میں سے جو کاغذات برآمد ہوئے ان میں بہت کچھ تھا۔ انوکھا اور منفرد۔

اور دوسری صبح میں مستعدی سے ہدایات کے مطابق اپنے کام کے لیے تیار تھی۔ اس بار میرے ظالم باپ نے مجھے ایک منفرد چیلنج دیا تھا اور اسے یہ مشورہ دوسرے بوڑھے یعنی ترمودا وانجی نے دیا ہو گا۔ کام واقعی منفرد تھا اور کسی بوڑھے مرد کی اداکاری میرے لیے ایک امتحان کی حیثیت رکھتی تھی۔

جس جگہ جا کر مجھے پروفیسر آرلینو کی حیثیت اختیار کرنی تھی۔ وہ ایک کاسمیٹک اسٹور تھا۔ جہاں مسٹر گریک نے میرا میک اپ کر کے میرا فیس بدل دیا۔ اب میں ایک عمر رسیدہ پروفیسر آرلینو تھی۔ یا تھا۔ میں

میں آسٹریا کے شہر سالسبرگ میں پیدا ہوا تھا اس کے بعد آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ اب مجھے سیاحوں کے ایک گروپ کے ساتھ آسٹریا جانا تھا اور انسبرگ جا کر اس گروپ میں شامل ہو کر آسٹریا اور ہنگری سے ہو کر بوڈاپسٹ جانا تھا۔ وہاں سے اس گروپ کو چھوڑ کر مجھے اپنا اصل کام سرانجام دینا تھا۔ یعنی نا کی گارس اور اس کی بیٹی اتیرونا کو لے کر واپس آنا۔ جس کی تفصیلات اور متعلقہ افراد کی شناخت مجھے تصویری شکل میں دے دی گئی تھی۔

یہ میرا مکمل شیڈول تھا جو مجھے اس لفافے سے موصول ہوا تھا اور ان پوائنٹس کی نشاندہی کر دی گئی تھی جہاں سے مجھے میری ضرورت کے مطابق سب کچھ مل سکتا تھا۔ چنانچہ بوڑھے پروفیسر آرنیٹو کا سفر جاری ہو گیا اور میں اپنے بارے میں دوسرے لوگوں کے چہروں اور عمل کے تاثر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ مجھے انیرونا کی تصویر بھی اس لفافے سے حاصل ہو چکی تھی۔ کمبخت کچھ زیادہ ہی خوب صورت تھی۔ اسے ذہن میں محفوظ کر کے اس کی تصویر پھاڑتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا تھا اور میں نے اس کے کچھ زیادہ ہی پرزے کر دیے تھے۔

☆......☆

فلائٹ نمبر 727 کینیڈی ایئرپورٹ سے سیدھی میونخ جاتی تھی۔ ایک پرسکون سفر طے کر کے میں اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ طیارے سے اتر کر اور ضروری قوانین سے فارغ ہو کر میں نے ٹیکسی کی اور اسٹیشن پہنچ گئی جہاں سے مجھے انسبرگ جانے والی ٹرین پر سفر کرنا تھا مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں ہر جگہ عمر رسیدہ لوگوں کی پذیرائی ہوتی ہے اور یہ ایک اچھی بات ہے۔

آخر کار میں ہوٹل ایسٹ میں پہنچ گئی جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔ ہوٹل میں کوئی دو گھنٹے ریسٹ کے بعد میں باہر نکل آئی ایک بوڑھے مرد کا کردار ادا کرتے ہوئے مجھے بہت مزہ آ رہا تھا۔ میں خاص طور سے لوگوں کے چہروں کا تجزیہ کر رہی تھی اور کسی بھی چہرے پر اپنے لیے کوئی شبہ نہ پایا تھا۔ یہ میرے لیے فخر کی بات تھی۔ اپنے تمام ضروری کاموں کو میں نے سیر تفریح قرار دے دیا تھا اور مختلف مقامات دیکھتی ہوئی ڈھلتی شام میں میوزیم ٹریسے پہنچ گئی۔

گلی چوڑی تھی۔ یہاں خوبی یہ تھی کہ گلیوں میں سائیکل کے سوا کسی سواری کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ گلی کافی چوڑی تھی اور اس میں کیفے ہی کیفے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دکانیں فوٹوگرافروں اور ریڈی میڈ کپڑوں کی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے نوجوان لڑکیاں قابل توجہ لباس میں ملبوس تاریکی میں بند دکانوں کے سامنے کھڑی یا دیواروں سے لگی گاہکوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

جس کی مجھے تلاش تھی اسے انہی لڑکیوں میں مجھ سے ملنا تھا۔ میں اس کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لڑکیوں کو گھورتی آگے بڑھ رہی تھی۔ گاہکوں کی متلاشی مجھ بوڑھے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں جسے گرم شہر کی نہیں، نرم تابوت کی ضرورت تھی۔

پھر وہ مجھے نظر آ گئی۔ مضبوط کاٹھی کی ایک بے حد خوب صورت لڑکی۔ اس کا سڈول جسم بے حد دلکش تھا۔ کمال کی صحت رکھتی تھی۔ میں اس کے سامنے سے گزر کر پھر واپس پلٹی اور اس کے موتیوں جیسے سفید دانت چمکے۔ تب میں اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

''پانچ سو شلنگ۔'' اس کی آواز بھی اس کے پورے وجود کی طرح دلکش تھی۔

''زیادہ ہیں۔ لیکن تم خوب صورت ہو۔'' میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''کہاں چلنا ہے۔''

''میرے پاس کمرہ ہے۔''

''چلو۔'' میں نے کہا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مجھے پکڑے آگے بڑھی تو کئی عورتوں نے ہنس کر ہم پر فقرے کسے۔ اس کا کمرہ ایک کینٹے کی اوپری منزل پر تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو اس نے دروازہ بند کیا اور بولی۔
''کچھ پیو گے پروفیسر۔''
''پہلے تمہارا نام پوچھوں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔
''جنیفر۔'' وہ مسکرا کر بولی۔
''تمہیں ساری تفصیل معلوم ہے جینی۔'' میں نے اس کا نام مختصر کر لیا۔
''ظاہر ہے مجھے اس کام کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔''
''تمہارے ساتھ پارٹی ہے۔''
''ہاں سوچی آرگینو پارٹی۔'' اس نے دلکش لہجے میں کہا اور ہنس پڑی۔
''تو پھر کیا پروگرام ہے۔''
''ہم کل صبح سابرگ دیانا روانہ ہوں گے۔ سابرگ میں لنچ کریں گے پھر سیر کریں گے پھر شام کو دیانا پہنچیں گے اور رات وہیں ٹھہریں گے۔ پرسوں صبح براٹ سلوویا سے سرحد پار کریں گے۔''
''وہ کیسے۔'' میں نے پوچھا۔
''بس کے ذریعے۔ پھر بس سے اتر کر لانچ سے بوڈاپسٹ جائیں گے وہاں ہم ایک دن اور دو راتیں گزاریں گے اور باہر کے علاقوں کا گشت کریں گے۔''
''کیا وہی ہمارے مطلوبہ علاقے ہوں گے۔''
''یقین کرو، میں نہیں جانتی۔'' اس نے کہا اور پھر ایکدم اچھل سی پڑی۔
''کیا ہوا؟''
''کوئی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولی اور برق رفتاری سے ایک کھڑکی کے پاس پہنچی۔ پھر پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور کچھ لمحوں کے بعد پلٹ آئی۔ ''میرا اندازہ ٹھیک تھا۔''
''کیا؟''
''ہم دشمنوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں وہ اپنا کام کر رہے ہیں۔''
''اس وقت جو شخص چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا، کے او ٹی میں اس کی تصویر موجود ہے اور گرے پاؤنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ سنو میں تمہیں کچھ ضروری باتیں بتا دوں باقی سب بعد میں۔''
''او کے۔'' میں نے کہا اور وہ بولی۔ ''مجھے ہدایات ہیں کہ میں تمہیں وہ مختصر تفصیل بتا دوں۔ بوڈاپسٹ میں قیام کی دوسری رات ہم اوپیرا میں جائیں گے اور دوسرا ایکٹ شروع ہونے سے پہلے جب گھنٹی بجے گی تو تم مردانہ ٹوائلٹ میں جاؤ گے وہاں دیوار کے ساتھ والی بوتھ میں کوئی تمہارا منتظر ہوگا۔ بس اس کے بعد کھیل تمہارے ہاتھ میں ہوگا۔''
''ٹھیک۔ مجھے یہاں کتنی دیر رکنا ہوگا؟''
''جتنی دیر تمہاری عمر ساتھ دے سکے۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑی۔

(ایلی پارک ...... جاسوسی کی دنیا میں اب کیا تہلکہ مچائے گی۔
اس کا اگلا شکار کون ہوگا؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔)

نمایاں شخصیات، سچے واقعات



سُروں کی ملکہ......ناہید اختر



احمد سجاد بابر

وہ گلوکارہ جس کی آواز کا جادو آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے

''آپ خوش شکل بھی ہیں اور خوش گلو بھی...... کبھی اداکاری کا نہیں سوچا؟'' معین اختر نے چلبلے انداز میں پوچھا۔

''کبھی میں نے سوچا ہی نہیں۔'' اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

''جب آپ میڈیا پر آئیں تو سلم تھیں، پھر وزن بڑھ گیا اب دوبارہ سلم ہو رہی ہیں کیا ڈائٹنگ شروع کر دی۔'' معین اختر نے پھر شرارت کی۔

''جب میں میڈیا پر آئی تو میں سولہ سال کی تھی، وہ تو عمر ہی سلم ہونے کی ہوتی ہے اب تو ہی دبے پتلے ہوتے ہیں۔'' اس نے بال واپس معین اختر کے کورٹ میں ڈال دی۔

''سب نہیں ہوتے، ذرا سامنے دیکھئے۔'' معین اختر نے سنجیدگی سے گیم شمیم رفیع خاور نھنا کی طرف اشارہ کیا۔ ہال میں قہقہے پھوٹ پڑے۔

''یہ کیا سولہ سال کے ہیں۔'' اس نے برجستہ سوال کیا۔

''یہ سولہ سال کے بھی ایسے ہی تھے۔'' معین اختر کے بے ساختہ جواب پر ہال میں تالیاں اور قہقہے رکتے ہی نہ تھے۔

''اب تو آپ بہت مشہور ہو گئی ہیں، تو کیا ریاض جاری ہے۔'' معین اختر نے پوچھا۔

''اب تو میں نے اور زیادہ محنت شروع کر دی ہے، تاکہ اپنے لوگوں تک اچھی موسیقی پہنچاؤں۔'' گلوکارہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ریڈیو نے مجھے سُر سکھایا مگر پاکستان ٹیلی ویژن نے مجھ پر اتنی محنت کی کہ میں اس کی ہو گئی اور وہ میرا ہو گیا۔'' اس نے پی ٹی وی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

ستر کی دہائی میں ملتان سے تعلق رکھنے والی ایک گلوکارہ نے ریڈیو پاکستان ملتان سے گلوکاری شروع کی جہاں اس نے پروگرام ''راگ ملہار'' میں خالد اصغر کے ساتھ دوگانا گایا۔ وہ موسیقار ایم اشرف کی دریافت تھیں۔ اس کی آواز میں جادو تھا، شخصیت میں وقار تھا، لہجے میں ٹھہراؤ تھا، وہ آئی، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا کے جملے اس پر صادق آتے تھے، اس کا نام ناہید اختر تھا، ناہید اختر کی تین بہنیں اور چار بھائی تھے، اس کے سفر کا آغاز ہوا اور پھر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا، رونا لیلیٰ کا خلا پورا ہو چکا تھا، سُر کی شہزادی میدان میں آ چکی تھی۔ سادگی جس کا شعار تھا اور یہی اس کا حسن تھا۔ ایک کروشیے کے سویٹر میں ملبوس اپنے کام میں ناہید ایک شاہکار نظر آتی تھی۔ ناہید اختر اور اس کی بہن وحیدہ اختر میلے ٹھیلوں میں گانے گاتی تھیں۔ جن استاد نے ان کی تربیت کی وہ اُجمن کی بہن



گوری کی بھی تربیت کی، لیکن ناہید کی آواز ابھی بھی اور گوری ناچ میں، تو گوری اداکاری کی طرف چلی گئی اور ناہید اختر گلوکاری کی طرف روانہ ہوئی۔

اس کے بعد ناہید اختر ٹی وی کی نظر میں آ گئی۔ اسلام آباد ٹیلی ویژن سے ایک ثقافتی پروگرام ''لوک میلہ'' پیش کیا جاتا تھا جس میں اپنی بڑی بہن حمیدہ اختر کے ساتھ ناہید نے مختلف نغمات گا کر حاضرین اور ناظرین کو بے حد متاثر کیا۔ بڑی بہن حمیدہ اختر کو پروگرام کے میزبان عکسی مفتی نے اپنی شریک حیات بنا لیا جب کہ ناہید اختر ٹیلی ویژن کے مختلف موسیقی کے پروگرامز میں حصہ لیتی رہیں۔ ناہید اختر نے کیریئر کا آغاز ریڈیو سے کیا جہاں سے الفاظ کی ادائیگی اور گائیکی کا انداز سیکھا اس کے بعد جب ٹی وی پر گانا شروع کیا تو وہ ان کیلئے ایک نیا تجربہ تھا اس لئے جب انہوں نے خود پہلی بار ٹی وی پر دیکھا تو انہیں حیرت ہوئی اور خوشی بھی بہت محسوس کی۔ 1974ء میں ہدایتکار خورشید کی فلم ''ننھا فرشتہ'' میں ایک نغمہ ''دل دیوانہ دل'' بڑا مقبول ہوا جسے نئی گلوکارہ ناہید اختر نے گایا تھا اسی فلمی گانے سے انہوں نے فلمی سفر شروع کیا۔ جس کی موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی۔ اسی سال نذر شباب کی فلم ''شمع'' میں ناہید اختر کا گیت ''کسی مہرباں نے آ کر میری زندگی سجا دی'' بہت مقبول ہوا۔ عام لوگوں کا تاثر تھا کہ یہ بہت جلد فلموں میں مرکزی کرداروں میں بھی نظر آنے لگے گی مگر ناہید نے خود کو گلوکاری تک ہی محدود رکھا۔ جب پروڈیوسر نے ان کی آواز سنی تو فلم کے سات نغمات ہی ان سے ریکارڈ کرا لئے۔ اس کے دو ہفتے بعد موسیقار ناشاد ان کے پاس آئے اور ہدایتکار حسن طارق کی فلم کا ڈیوٹ نغمہ ریکارڈ کرانے کی پیشکش کی جو کہ مہدی حسن کے ساتھ ریکارڈ کیا جانا تھا تاہم وہ مہدی حسن کا نام سن کر تھوڑا گھبرا سا گئیں مگر ریکارڈنگ کے دوران مہدی حسن نے ان کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی کی جس سے ان انہیں ایک انرجی مل گئی اور وہ مہدی حسن جیسے لیجنڈ سنگر کے ساتھ دوگانا ریکارڈ کرانے میں کامیاب ہو گئیں۔ انکا کہنا تھا کہ انہوں نے ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ بھی کئی دوگانے ریکارڈ کرائے۔ مرحومہ ان سے بہت محبت اور وہ بھی نور جہاں کا احترام کرتی تھیں۔ انکا کہنا تھا کہ وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہیں کہ خدا نے انہیں عزت، شہرت اور مقام دیا۔ انہیں پاکستان اور بیرون ملک بڑے بڑے ٹائٹل دیے گئے اور ایوارڈز سے نوازا گیا۔ خدا نے انہیں وہ بھی عطا کیا جو انہوں نے مانگا بھی نہ تھا۔

ناہید اختر کی فلم ''فیصلہ'' میں اخلاق احمد کے ساتھ



دوگانا ''آنکھوں میں پیار تمہارا''، فلم ''دلہن ایک رات کی'' میں احمد رشدی کے ساتھ دوگانا ''ہنستی ہے رات بھیگی بھیگی''، فلم ''آواز'' میں ''سجناں رے دکھا دے ہنس کے'' اور ''شبانہ'' میں ''او جیٹھ جی آج میں'' مقبول عام گیت ہوئے۔ فلم ''زندگی'' میں اے نیئر کے ساتھ دوگانا ''جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے سب نے یہ شور مچایا ہے، سالگرہ کا دن آیا ہے''، فلم ''ناراض'' میں محمد علی شہکی کے ساتھ دوگانا ''اپنوں بیگانوں سے ناراض ہوں''، فلم ''ان داتا'' میں ''پیار کریں ہم آ جا آ جا'' ہدایتکار حسن طارق کی فلموں ''ثریا بھوپالی'' اور ''بیگم جان'' میں بالترتیب ''تھا یقین آئیں گی یہ راتاں کبھی''، ''بیگم جان بھلا کیا جانے'' قابل ذکر ہیں۔

ناہید اختر نے پنجابی فلموں میں بھی اپنی آواز کا جادو جگاتے ہوئے حیدر چوہدری کی فلم ''امر اکبر انتھونی'' کے یہ دوگیت ''نتھ چھنکے تے جھمکیاں دا دل دھڑکے'' اور ''لاہور دیاں سڑکاں تے'' کے علاوہ متعدد پنجابی گیت گائے اور مقبول ہوئے۔ گانوں کے علاوہ ملی نغمے ''عظیم ملت عظیم پرچم ہمارا پرچم'' بھی گائے۔ ناہید اختر نے 1987ء سے گانے گانا بند کر دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ناہید شادی کرنا چاہتی تھیں اور وہ بھی عمران خان سے مگر ناہید کا باپ سونے کی اس چڑیا سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تو وہ رکاوٹ ڈالتا رہا۔ آخر کار ناہید نے بغاوت کی اور گانا چھوڑ دیا۔ نوے کی دہائی کے شروع میں ناہید ملتان کے ایک معروف سیاستدان کے ساتھ بھی منسلک رہیں اور لوگوں نے انہیں اس سیاست دان کی گاڑی میں اسلام آباد کی سڑکوں پر رات دیر گئے لمبی ڈرائیو پر دیکھا۔ ناہید کی شدید خواہش کے باوجود سیاستدان شادی سے انکار کرتا رہا آخر کر تھک ہار کر اور مایوس ہو کر ناہید نے میڈیا کی مشہور شخصیت آصف علی پوتا سے شادی کر لی۔ ناہید اختر نے آصف علی پوتا سے شادی کے بعد شوبز سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنے گھر اور بچوں پر توجہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ آصف علی پوتا نے ان سے لو میرج کی مگر اس راز سے پردہ نہ اٹھ سکا کہ اس نے اس عظیم گلوکارہ کا مستقبل تاریک کیا تو یہ کیسی محبت تھی۔

''میں ایک جیسی زندگی سے اکتا گئی تھی، کچھ اپنے بارے میں سوچنا چاہتی تھی، کچھ آرام کرنا چاہتی تھی، اس لئے میں نے بامِ عروج پر گلوکاری چھوڑ دی''

یہ کہتے ہوئے ناہید اختر کے چہرے کے تاثرات الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''پھر میرا شادی کا پلان بنا کہ شادی ہونی چاہیے کیونکہ عورت کی زندگی اسی طرح سے مکمل ہوتی ہے۔ شوبز اگر رکھنا ہو تو رکھ لیں اگر نہیں رکھنا تب بھی کوئی بات نہیں۔'' ناہید اختر نے بات آگے بڑھائی۔

☆......☆

یہ پری چہرہ گلوکارہ 1956ء کو ملتان میں پیدا ہوئیں۔ نوجوانی ہی میں اپنے شوق کے پیش نظر ریڈیو پاکستان ملتان سے گلوکاری کا آغاز کیا۔ 1970ء میں پی ٹی وی کے پروگرام ''لوک تماشا'' میں حصہ لیا۔ وہاں پر ان کا گایا ہوا گیت ''مینوں سوڑا اوڑ لے دے دے روز بالما کہندی'' بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ پی ٹی وی کے لیے مزید گلوکاری بھی کرتی رہیں۔

1974ء میں فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے فلم ''ننھا فرشتہ'' میں ایم اشرف کی موسیقی میں ''دل دیوانہ دل نہ جانے کیوں دھڑکتا ہے'' گایا۔ یہ نغمہ تو اتنا مقبول نہ ہوا لیکن اسی سال شباب پکچرز کی فلم ''شمع'' میں ایک یادگار نغمہ گا کر ناہید اختر نے فلم انڈسٹری میں اپنے قدم جما لیے۔

''کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی
میرے دل کی دھڑکنوں میں نئی آرزو جگا دی''

انہی دنوں پاکستان کی مقبول اور سریلی آواز والی گلوکارہ رونا لیلیٰ پاکستان چھوڑ کر بنگلہ دیش جا چکی تھیں اور اس خلا کو ناہید اختر نے نہایت خوبصورتی سے پر کیا اور پرکشش گلوکارہ ناہید اختر پر فلمی دنیا کے دروازے بہت تیزی سے کھلتے چلے گئے۔ ناہید اختر نے اپنے دور کی مقبول ترین ہیروئین کے لیے بے شمار گانے گائے لیکن ان کی آواز بابرہ شریف پر بہت سوٹ کرتی تھی۔ 1975ء میں بننے والی فلم ''میرا نام ہے محبت'' نے ناہید کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

''تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے''
''یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم کہانی محبت کی زندہ رہے گی''

1975ء ہی میں بننے والی فلم "پہچان" میں ناہید اختر کے گائے ہوئے ٹائٹل سونگ نے بہت شہرت حاصل کی۔

"اللہ ہی اللہ کیا کرو، دکھ نہ کسی کو دیا کرو
جو دنیا کا مالک ہے نام اسی کا لیا کرو"

1974ء سے لے کر 1991ء تک کے اپنے فنی سفر میں ناہید اختر نے نہ صرف اردو، پنجابی نغموں میں اپنے فن کا بام عروج پر پہنچایا بلکہ ان کے گائے ہوئے لوک گیت اور غزلیں بھی بے حد مقبول ہوئیں۔ ناہید اختر کے مقبول ترین نغموں، غزلوں اور ملی نغموں کی ایک طویل فہرست ہے۔

☆ دیکھا جو میرا جلوہ تو دل تھام لو گے (تلاش)

☆ میں ہوگئی دلدار کی ہونے لگی چبھن پیار کی (تیرے میرے سپنے)

☆ پیار کبھی کرنا نہ کم مر جائے گی تیری عاشی (دیکھا جائے گا)

☆ تت تورو تورو تارا تارا بولے یہ دل کا اک تارا (محبت زندگی ہے)

☆ ساون کے دن آئے بالم جھولا کون جھلائے (ناگ اور ناگن)

☆ تھا یقیں کہ آئیں گی یہ راتیں کبھی (ثریا بھوپالی)

☆ چلو چلیں پاپا ہم اپنے پاکستان میں (کامیابی)

☆ شب غم مجھ سے مل کر ایسے روئی (کالے بادل)

☆ جی کرواے میں اگ پانی بھڑک کر کے (جبرو)

☆ اکھ لڑے تے لڑائی جا چپ کر کے (خان زادہ)

☆ بانٹ رہا تھا جب خدا سارے جہاں کی نعمتیں (ہمراہ مہدی حسن، فلم: نذرانہ)

☆ جس طرف آنکھ اٹھاؤں تیری تصویراں ہے (ہمراہ مہدی حسن، فلم: ثریا بھوپالی)

☆ نینوں کا ہے کام سارا دو نینوں کا کام (ہمراہ مہدی حسن، فلم: دہلیز)

☆ ساتھی مجھے مل گیا مل گیا مل گیا (ہمراہ اے نیر، فلم: جاسوس)



☆ کالی میری گت تے پراندا میرا لال (ہمراہ اے نیر، فلم: مس سنگاپور)

☆ میری یہ چال توبہ اف یہ جمال توبہ (ہمراہ اخلاق احمد، فلم: دیوانگی)

☆ سہیلیے نی پیار، پیار میں نوں ہویا (ہمراہ نور جہاں، فلم: مہندی)

فلموں میں کامیابی کے باوجود ناہید اختر نے پی ٹی وی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ انہوں نے فلموں کے ساتھ ساتھ پی ٹی وی پر مختلف پروگراموں پر لوک گیت، غزلیں اور ملی نغمے گائے۔

☆ ہمارا پرچم یہ پیارا پرچم
☆ ہم مائیں ہم بہنیں وطن کی عزت ہم سے ہے
☆ جگ جگ جیوے میرا پیارا وطن
☆ گجرے مہکے بالوں میں آیا کون خیالوں میں
☆ چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے
☆ یہ رنگینی نوبہار اللہ اللہ
☆ تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
☆ ونگاں والا آگیا
☆ نہے دی چادر اتے سیتی رنگ ہیا

ناہید اختر نے 1974ء میں فلم "شمع" پر، 1975ء میں پہچان پر، 1985ء میں [illegible] نگار

ایوارڈ حاصل کیے۔ 2006ء میں ریڈیو پاکستان ایکسی لینسی ایوارڈ، 2007ء میں لکس لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، 2010ء میں پی ٹی وی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ یافتہ برطانوی فلم East Is East کے سیکوئل میں پاکستان کی مقبول گلوکارہ ناہید اختر کا گیت شامل کیا جا رہا ہے۔ West is West نامی یہ فلم ایک ایسے مخلوط خاندان کے گرد گھومتی ہے جو پاکستانی نژاد شوہر اور برطانوی عورت کے بچوں پر مشتمل ہے۔ اس فلم میں ماضی کی مقبول گلوکارہ ناہید اختر کا گیت (میں ہو گئی دلدار کی) سمیت کوک اسٹوڈیو کے دوسرے سیزن کے دو گیت بھی شامل کیے گئے ہیں جس میں بھارتی اداکار اوم پوری پاکستانی شخص کا کردار نبھا رہے ہیں۔

☆......☆

یہ رنگینیِ نو بہار، اللہ اللہ
یہ جامِ مے خوشگوار، اللہ اللہ
اُدھر ہیں نظر میں نظارے چمن کے
اِدھر روبروئے یار، اللہ اللہ
اُدھر جلوۂ مضطرب، توبہ توبہ
اِدھر یہ دلِ بے قرار، اللہ اللہ
وہ لب ہیں کہ ہے وجد میں موجِ کوثر
وہ زلفیں ہیں یا خلد زار، اللہ اللہ
میں اِس حالتِ ہوش میں مست و بے خود
وہ مستی میں بھی ہوشیار، اللہ اللہ

امیر خسرو کی فارسی غزل اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا منظوم ترجمہ مدھر آواز میں الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں گونج رہا تھا اور ایک سناٹا تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا، ماضی کی گمشدہ آواز مجسم ہو کر پلٹ آئی تھی، پچھلی نسل گئے دنوں کو یاد کر رہی تھی اور نئی نسل ساکن و ساکت بیٹھی ایک جادو کے اثر تھی۔۔۔ کیا پاکستان کا ماضی ایسا بھی تھا؟ اس سوال میں ایک فخر پوشیدہ تھا جو نوجوانوں کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھا، ایسا فخر جو انہیں نہ کسی نے دکھایا اور نہ بتایا۔ یہ ناہید اختر کی واپسی تھی، وہ جو چلی گئی تھی، وہ جو عروج پر پہنچی اور بھرا میلہ چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ آج لوٹ آئی تھی۔ اچھی شکل و صورت، تیکھے نقوش، سریلی اور کانوں میں رس گھولنے والی مدھر آواز کو یکجا کر دیا جائے تو ایک من موہنی گلوکارہ کا سراپا آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس نے اپنی الگ شناخت پیدا کی اور آواز کی کھنک کی بدولت مشہور ہوئیں، جس کا نام ناہید اختر تھا۔

22 سال کے طویل عرصہ کے بعد 2013ء میں پہلے الحمرا آرٹ کونسل نے اور پھر پی ٹی وی نے ناہید اختر کے فن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے پروگراموں کا انعقاد کیا۔ ان پروگراموں میں ناہید اختر نے اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ شرکت کی اور اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ آج بھی ان کی آواز بغیر کسی لغزش کے بہت سریلے اور بھرپور انداز میں گونج رہی تھی۔ ناہید اختر ایک بار پھر اپنے فن کا لوہا منوانے کے لیے گلوکاری کے میدان میں اتر چکی تھی۔

ناہید اختر کی 22 برس بعد واپسی، جیسے موسیقی کے گلشن میں بہار آگئی ہو۔ طویل عرصہ گائیکی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے باوجود آج بھی ان کی آواز کی کھنک اور کشش میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ انہوں نے الحمرا میں اپنی خوبصورت پرفارمنس سے ثابت کر دیا کہ وہ ایک عظیم فنکارہ ہیں۔ ناہید اختر نے ماضی میں اپنی مسحور کن آواز کی بدولت کروڑوں دلوں کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ان کے گائیکی چھوڑنے سے لیکر واپسی تک ایک نسل تبدیل ہو چکی ہے تاہم ان کی پہچان اور نام آج بھی قائم و دائم ہے۔ 70 کی دھائی میں فلم انڈسٹری کی شاخ پر کھلنے والی ایک نوخیز کلی کی خوشبو کچھ اس طرح پھیلی کہ اس نے فلمی موسیقی کے ماحول کو معطر کر دیا اور ملکہ ترنم کے عروج کے عہد میں اپنی پہچان خوبصورت انداز میں بنائی وہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئیں۔ ان کی سریلی آواز لوگوں کے کانوں میں رس گھولنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ناہید اختر کی آواز ریڈیو، ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے ملک کے کونے کونے میں گونجنے لگی۔ ناہید اختر نے ریڈیو، ٹی وی اور فلم انڈسٹری پر کئی برس تک حکمرانی کی۔ انہوں نے 22 برس کے وقفے کے بعد گائیکی کو دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کر کے اپنے مداحوں کو ایک بڑی خوشخبری دی۔ جس کا کریڈٹ لاہور آرٹس کو جاتا ہے۔ لاہور آرٹس کونسل نے ناہید اختر کی فنی خدمات کے اعتراف میں انہیں کمال فن



ایوارڈ سے نوازنے کا اہتمام کیا۔ پروقار تقریب کا اہتمام الحمرا ہال نمبر 1 میں کیا گیا۔ ناہید اختر کے اعزاز میں تقریب اناؤنس ہونے پر لوگوں نے لاہور آرٹس کونسل سے دعوت نامے حاصل کرنے کیلئے سفارشیں کرانا شروع کردیں کیونکہ ناہید اختر کے مداح انہیں لائیو سننے کے خواہش مند تھے تاہم گلوکارہ کے مداحوں کی کثیر تعداد دعوت نامے نہ ملنے باوجود الحمرا میں پہنچ گئی تھی اور ہال پیک ہونے کے بعد سینکڑوں افراد اپنی پسندیدہ گلوکارہ کی ایک جھلک دیکھے بغیر مایوس لوٹنا پڑا۔ تقریب کے مہمان خصوصی لاہور آرٹس کونسل بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین عطاالحق قاسمی تھے اور پروگرام کوڈپٹی ڈائریکٹر پروگرامز ذوالفقار علی زلفی نے آرگنائز کیا اور نگران ایگزیکٹو ڈائریکٹر محمد علی بلوچ تھے۔ تقریب میں نامور گلوکاروں بھی مدعو کیا گیا تھا جنہوں نے ناہید اختر کے گولڈن گیت اور کلاسیک غزلیں سنا کر محفل کو چار چاند لگادیے۔ جس سے ناہید اختر کے جوش جذبہ کو تقویت ملی۔ وہ شائقین سے بھرا کھچا کھچ ہال دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئی تھیں۔ تقریب کے آغاز میں گلوکارہ صائمہ جہاں نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ ان کے بعد ابھرتے ہوئے گلوکار سلمان پیرزادہ نے پرفارم کیا۔ گلوکارہ شبنم مجید نے غزل ''زندہ رہیں تو کیا ہے مرجائیں ہم تو کیا'' گانا شروع کی تو ناہید اختر پرانی یادوں میں محو ہوگئیں اور شبنم مجید جب اپنی انٹری ختم کرکے واپس جانے لگیں تو انہیں ''کسی مہربان نے آکے میری زندگی سجادی'' سنانے کی فرمائش کی۔ شبنم مجید کے بعد پٹیالہ گھرانے کے نامور غزل گائیک استاد حامد علی خان نے ناہید اختر کی مشہور غزل ''جہاں تیرے نقش قدم دیکھتے ہیں'' گاکر محفل کو گرمادیا۔ آخر میں ناہید اختر نے اپنے خوبصورت نغمات گاکر محفل میں جان ڈال دی۔ انہوں نے پاکستان کی چار زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی میں گانے سنا کر شائقین کو ناچنے پر مجبور کردیا۔ گلوکارہ نے شائقین کی فرمائش پر بھی گیت سنائے۔ تقریب کے دوران مہمان خصوصی عطاالحق قاسمی نے انہیں ''کمال فن ایوارڈ'' اور پانچ لاکھ روپے کا چیک پیش کیا۔ محفل کا نجز اور یونیورسٹیوں کے طلباء کے علاوہ گلوکارہ کے مداحوں نے انہیں پھولوں کے گلدستے پیش کیے۔ محفل میں ان کے شوہر آصف علی پوتا اور بیٹا بھی موجود تھے۔

آصف علی پوتا سے جب پوچھا گیا کہ گھر پر ناہید اختر آپ کے لیے کون سا گیت گاتی ہیں، شاید وہ ''تجھے پیار کرتے کرتے مری عمر بیت جائے'' گاتی ہوں گی تو آصف کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔

''نہیں وہ یہ گیت نہیں بلکہ دوسرا گیت ہے''

ایک لمحہ ٹھہر کر انہوں نے بات آگے بڑھائی۔

''ہنس کے سب لوں گی اگر تم میں برائی ہوگی۔ گر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی''

ہر طرف مسکراہٹیں بکھر گئیں۔

''اس کے علاوہ...... مرے ہوتے ہوئے ترے ہونٹوں پہ کسی اور کا نام بھی کیوں آئے۔ اکثر گنگناتی ہیں''

آصف علی پوتا خوشگوار موڈ میں تھے۔

ایک عہد تھا جو دوبارہ شان و شوکت سے ابھر آیا تھا۔ مگر جس دور میں ناہید اختر نے عروج پایا وہ باصلاحیت لوگوں کا دور تھا، اچھا لکھنے والے بھی تھے اور سمجھنے والے بھی، ناہید اختر اس دور میں واپس آئی ہیں جب حقیقی ٹیلنٹ کی قدر نہیں اور نہ پاکستان میں اس لیول کا کام ہو رہا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہیرا خاک میں رلتا ہے یا پھر تاج میں سجتا ہے!!

[illegible]

[illegible]

قسمت کی دیوی

سیدہ تبسم زہرہ رضوی

ادھر حکیم جی پاگل خانے پہنچے ادھر اس پر قسمت کی دیوی مہربان ہوگئی۔ ایک حکیم جی کی دیوانگی کا قصہ عجب۔

سعدیہ فاطمہ کا تعلق انتہائی سمجھدار اور صابر معاملہ فہم لڑکیوں میں ہوتا تھا لیکن افسوس کہ نصیب سو گئے تھے پہلے وہ لوگ کرائے کے مکان میں رہتے تھے لیکن جب سے ابا کا قرعہ اندازی میں پلاٹ نکل آیا تھا اسے اس کو بنانے کی دھن سوار ہوگئی تھی۔ وہ قرض کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے، نگاہِ انتخاب اک ایسے شخص پر پڑی جو بڑی دیکھ کر بکرا وصول کرنے والے تھے۔ یہ تھے شام جی۔ یہ سب پنجاب کے چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ شام جی وہاں کے حکیم تھے۔ ہاتھ میں شفاء تھی سو مطلب چلتا تھا۔ اچھا خاصا پیسہ بنا لیا گیا۔

سعدیہ کے ابا نے قرض مانگا تو کہا کہ سوچوں گا پھر کہا جگہ دکھاؤ۔''

جب وہ ان کا گھر دیکھنے آئے تو ان کی نظر سعدیہ پر پڑ گئی۔ شام جی واپس تو چلے آئے لیکن اپنی میلی نظریں وہیں چھوڑ آئے۔ سعدیہ کے آٹھ بہن بھائی تھے۔ چھ بہنیں اور دو بھائی، سعدیہ سے چھوٹی نادیہ تو بہت ہی خوب صورت تھی، عمر 20 سال کے قریب، سعدیہ سب سے بڑی تقریباً پچیس سال کی شکل وصورت درمیانی تھی۔ جو رشتہ آتا نادیہ کے چناخ پٹاخ حسن کی نذر ہو جاتا۔ آج کل بھی ایک انجینئر کا رشتہ آیا ہوا تھا اس لحاظ سے ملل پر ابا پیسے پیسے کو محتاج۔ ادھر ستر سالہ شام جی نے اس شرط پر قرض دینے کی ہامی بھری کہ سعدیہ کا نکاح ان سے کر دیا جائے۔ پہلے تو ابا کا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن اماں نے کہا کہ اگر اتنا پیسہ مل جائے کہ مکان بھی بن جائے اور نادیہ کی شادی بھی ہو جائے تو سینے پر پتھر کی سل رکھ لیں گے۔ اس طرح مکان تو بن گیا، نادیہ بھی دھوم دھام سے بیاہ گئی لیکن سعدیہ بھینٹ چڑھ گئی۔

☆......☆

جوں جوں شام ہوتی جاتی رات اترنے لگتی، سعدیہ کے چہرے پر غم ورنج کے سائے گردش کرنے لگتے۔ اُدھر حکیم جی کھلتے جاتے، اس بوالہوس بڈھے کی تسکین کا وقت آتا۔

سب جانتے ہیں کہ جوانی و بڑھاپے کا میل نہیں ہوتا لہٰذا رفتہ رفتہ اس کے دل میں شام جی کی نفرت جڑ پکڑنے لگی۔ وہ تنہائی میں ٹھنڈے دل سے اپنے حالات پر غور کرتی اور اس کے حل کے بارے میں سوچا کرتی مگر افسوس کہ اس گھر میں سوچنے کا موقع بھی کہاں تھا۔ حکیم جی کے پانچ بیٹے، بہوئیں، پوتے، پوتیاں، بیٹیاں، نواسے، نواسیاں۔ بے شک کہ گھر بہت بڑا تھا لیکن اتنے لوگوں کی چیں چیں پوں پوں نے دماغ بھونکا کے رکھ دیا تھا۔ پھر بھی جب سناٹا ہوتا سوچوں کے در کھل جاتے۔

بہت سوچ بچار کے بعد ایک حل نکلا تو لیکن دیر طلب تھا۔ (سعدیہ کا بیڈ لک چل رہا تھا کہ اس کا منگیتر بھی اس کا ساتھی نہیں تھا۔ بچپن میں اس کی منگنی خالہ کے گھر ہوئی تھی۔ ان کی غربت دیکھ کر انہوں نے توڑ دی تھی لیکن اس نے ظہیر عالم کو اپنی شادی پر افسردہ پایا تھا۔ اس کی کچھ امیدیں اس سے تھیں لیکن...... اس کی زندگی اور جیل کی زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ بہرحال دل محبت مانگتا تھا۔ حکیم صاحب کی الماری میں حکمت سے متعلق بہت نادر کتابیں تھیں۔ اس نے مطالعہ شروع کیا۔

پوری کوشش یہ تھی کہ حکیم صاحب کو نہ پتا چلے۔ رات سعدیہ کے لیے قیامت لاتی تھی۔ جوں جوں حکیم جی دودھ کے ساتھ کشتے کھاتے ان کا خون کھولتا......

وہ جانے کیوں نہیں مان لیتا تھا کہ تو منحوس ستر سال سے زیادہ کا ہو چکا ہے۔ بدبخت پتا نہیں کتنے اندرونی امراض میں مبتلا تھا ملعون۔ لیکن سعدیہ کی سمجھ داری کا تقاضا یہ تھا کہ یہ وہ تمام باتیں کبھی چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ دل میں بہت برا برا کوستی اور کہتی کہ بڈھے میں تیرا وہ انتظام کرنے جا رہی ہوں جو کبھی تو نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا کہ دودھ میں نیند کی گولی ملا دوں لیکن ایک تو حکیم جی بڑے ہوشیار تھے فوراً سمجھ جاتے اور اس کا اعتبار چلا جاتا پھر بڑی پریشانی ہو جاتی۔ نہیں ایسا نہیں کرنا تھا پھر کیا کروں اسے بڈھے کے وجود سے گھن آتی تھی۔ اس عمر میں جہاں طرح طرح کے امراض انسان کو گھیر لیتے ہیں، وہیں شک کا ناگ بھی پوری طرح سے پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ شک کرتے تھے اپنے بیٹوں پر جو خود پچاس پچپن سال کے تھے۔ دامادوں پر جو کم و بیش اسی سن کے تھے۔

سعدیہ اسی پریشانی میں تھی کہ خوش قسمتی کے دیوتا نے اپنا چھینکا پھینک دیا۔ اسے حکیم جی کی کتابوں میں ذہنی خلفشار کو ترتی دینے کا نسخہ مل گیا۔ پھر ان کی معجون میں ملانا ایک مرحلے سے کم نہیں تھا۔ حکیم جی انتہائی شکی تھے ہر چیز خود دیکھ بھال کر کھاتے۔ اس کے ذائقے کو محسوس کرتے لیکن جس طرح اسمگلر چھوٹی کھیپ پکڑواتے ہیں۔ پولیس کی توجہ اس طرف ہوتی ہے اور دوسری طرف سے بڑی کھیپ نکل جاتی ہے اس طرح حکیم جی اپنی ساری حسیات دودھ کے گلاس پر خرچ کرتے رہے اور معجون کام کر گئی۔



اب سعدیہ نے منصوبے کے دوسرے حصے پر کام شروع کیا۔ حکیم جی کو اپنے گھر کے مردوں پر شک تو پہلے ہی تھا اور کچھ غلط بھی نہیں تھا گھر میں جوان خوب صورت عورت کو دیکھ کر اپنا دل قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نے حکیم جی سے شکایت کی کہ ان کی خاص کر ان کے داماد کی نظریں اچھی نہیں ہیں۔''

''ہوں۔'' حکیم جی نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ بڑھاپے میں انسان کا مشاہدہ تیز ہو جاتا ہے۔ عمر کا تجربہ ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ نکالا کہ انہیں تیسری منزل پر شفٹ کرا کر ان کا راستہ الگ کر دیا۔ اس طرح اس کا کمرہ جو زنداں در زنداں کی طرح کا تھا، وہ علاقہ آزاد ہو گیا۔ وہ کسی حد تک نظروں کے حصار سے نکل آئی۔ دو دن کے بعد اس نے حکیم جی سے کہا کہ بہت دنوں سے امی یاد آ رہی ہیں۔

''شام کو لے چلوں گا۔'' انہوں نے حاتم طائی کو للکارا۔ ''مجھے ویسے بھی اس طرف جانا ہے۔'' وہ اسے بہت کم ہی ساتھ لے جاتے اور ساتھ ہی واپس لے آتے۔

بہت دنوں کے بعد ماں کے گھر آئی، اب خالہ نے اپنا گھر ان کے پڑوس میں بنا لیا تھا۔ حکیم جی اسے ماں کے حوالے کر کے خود مریض دیکھنے چلے گئے وہاں ظہیر عالم آ گیا۔ وہ اس کا سابقہ منگیتر تھا۔ دل نے خوب صورت انداز میں انگڑائی لی۔ تھوڑی تنہائی ملی اور دونوں نے نظروں کی زبانی پیغام دے دیا۔

☆......☆

اب حکیم صاحب بھولنے لگے تھے۔ ایک دن الماری میں چابی لگی رہ گئی۔ اس نے الماری کا تالا کھول کر خوب تلاشی لی۔ حکیم جی نے یہ مکان اور بہت سا بینک بیلنس اس کے نام کیا ہوا تھا۔ ڈائری بھی تھی ایک صفحے پہ لکھا تھا۔ سعدیہ جان میں تم سے شرمندہ رہتا ہوں اس لیے یہ سب کچھ میرے مرنے کے بعد تمہیں ملے گا لیکن میں تمہیں زندگی میں بتا دوں گا۔ نہیں مجھے تم سے ہوشیار رہنا چاہیے؟'' بس اتنا ہی پڑھ سکی تھی کہ آہٹ پر سب کچھ بند کر دیا۔

شام جی تھے۔ سعدیہ کو چہرے کے تاثرات چھپا لینے میں ملکہ حاصل تھا۔ مارے خوشی کے سعدیہ کا دل گیت گا رہا تھا۔ حکیم جی نے اس کو گلے لگانا چاہا۔ وہ کھانا لانے کے بہانے نکل لی۔ حکیم جی بہت چالاک تھے لیکن بھول کا مرض بھی جڑ پکڑ رہا تھا۔ ورنہ چابی لگے دیکھ کر بھی جانے القصہ کھانا کھا کر سو گئے۔

☆......☆

سعدیہ کا پوری دنیا میں صرف ایک ہمدرد تھا ظہیر عالم۔ اس زمانے میں موبائل نئے نئے آئے تھے۔ ظہیر نے سعدیہ کو گفٹ کر دیا اس کا استعمال بھی سکھا دیا۔ اب اسے آف کر کے قالین کے نیچے چھپا دینا، اس کی ذمہ داری تھی۔ حکیم جی کے لیے تو سعدیہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔ ان کے پلپلے وجود کو برداشت کرنا اور پھر وہ ہیٹنگ کو برداشت کرنا دل گردے کا کام تھا۔ اب حکیم جی بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ اول فول بکنے لگتے مطلب جھٹھنے لگا تھا۔

پھر وہ دن آیا کہ صرف گھر کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے بچوں کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ شادیاں ہو کر خود بچوں والے ہو چکے تھے۔ ان کی اولاد پوتا پوتی نواسہ نواسی میں مگن تھی ایک دن بڑے بیٹے کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ قیامت مچ گئی۔ سب رو رہے تھے لیکن حکیم جی نے ایسے ٹھٹھے لگائے، سب کے سامنے سعدیہ کو گلے لگا کر ایسے ایسے رومانوی کلمات کہے کہ اہل محلہ کوشش کے باوجود ہنسی نہ روک سکے۔ سب نے انہیں پاگل تسلیم کر لیا۔ پھر انہوں نے سعدیہ کو پکڑ کر اتنا مارا کہ بے ہوش ہو گئی۔ سب خاندان بچا رہا تھا مگر حکیم جی نے اپنی بیوی کو مارا۔ بیٹے نے معاملہ رفع دفع کرا کر انہیں دوسرے کمرے میں بھیج دیا سب نے سعدیہ کو تسلی دی ان کی بہو جو سعدیہ کی ماں سے بھی بڑی تھیں نے کھانا لگوایا اور سب ساتھ بیٹھ کر کھانے لگے۔ حکیم جی کا ان کے کمرے میں بھیج دیا لیکن ان پر پھر دورہ پڑا۔ اپنی لاٹھی لے کر آ گئے اور جو نظر آیا اس پر برسانے لگے۔ پوتے کی بیوی کے گود میں بچہ تھا بچاتے بچاتے ایک اس کو پڑی۔ بچے کا سر بری طرح زخمی ہو گیا۔ باقی لوگ بھی زخمی ہو گئے تھے۔ محلہ جمع تھا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی اور محلے والوں کے مشورے سے سب نے مل کر قبلہ محترم کو پاگل خانے داخل کروا دیا۔

اب سعدیہ بیگم شہر کی امیر ترین خاتون ہیں اور ظہیر عالم کی بیوی! اور راز کی بات تو میں آپ کو بتا دوں، ظہیر عالم کی بیوی بنتے وقت 32 سالہ سعدیہ کنواری ہی تھیں۔

☆☆☆

قوس قزح



راوی: چوہدری وسیم

تحریر: رانا حبیب الرحمٰن

جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے فیوڈل سسٹم کے شکار اُس نوجوان کی سرگزشت

جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

دوسرا حصہ

بابا کو درویش کی ایسی باتوں کی کوئی پروا نہ تھی لیکن ایسی باتیں سن کر وہ ڈر گیا تھا۔ وسیم کی تلاش ختم کی اور واپس گاؤں آ گیا۔ بابا زخمی بھی کافی ہوا تھا لہٰذا چند دن اسے ٹھیک ہونے میں لگے۔ پھر وہی جاگیردارانہ باتیں۔ ایک دن ایک سانپ نے اسے کاٹ لیا۔ گاؤں کے حکیم نے اس کی ٹانگ کاٹنے کا مشورہ دیا تاکہ زہر زیادہ نہ پھیلے۔ ٹانگ کاٹ دی گئی۔''

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ ہماری نظر کالج کے مین گیٹ پر گئیں جہاں سے ایک درویش ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ میں اس درویش کو جانتا تھا مجھے پہلے بھی مل چکا تھا، ویسے بھی یہ عاتکہ کا رشتے میں ماموں لگتا تھا۔ عاتکہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا وہ پریشان سی دکھائی دی تو میں نے کہا۔

''اپنے ماموں کو دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میرا ماموں ..... کیوں؟ یہ وہی درویش ہے جو ہمارے گاؤں کے آس پاس دیکھا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا ماموں ہی ہے لیکن اس بات کو کئی لوگ نہیں جانتے۔ تمہارے والد بھی نہیں جانتے کیوں کہ تمہارے والد کی محبت کی شادی ہے شادی کے بعد دونوں خاندانوں نے قطع تعلق کر لیا تھا اس لیے تمہارے بابا اس سے ناواقف ہیں۔''

وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں درویش جو کہ محبوب علی شاہ تھے ہمارے قریب آ چکے تھے اور بولے۔

''بیٹا بادی جھوٹ بولنا گناہ ہے اس لڑکی کو یعنی میری بیٹی کو سب کچھ سچ بتا دو جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے اور تمام برائیوں کی جڑ بھی، اس لیے اس سے کوئی بات نہ چھپاؤ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ نیکی کے کام کرو اور برائیوں سے بچو، برائیاں دوزخ میں لے جاتی ہیں۔'' پھر عاتکہ کی طرف مڑتے ہوئے اور بولے۔

''بیٹا تمہارے ملنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ کچھ وقت ضرور لگے گا تمہیں ایک ہونے میں۔ گھبراؤ نہیں تمہاری جوڑی آسمانوں پر بن چکی ہے۔ جلد ہی تمہیں خوشیاں مل جائیں گی۔ بس اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو۔'' پھر بولے۔

''بیٹا بادی ہماری بیٹی کا خیال رکھنا۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ ہمارے متعلق اسے بتا دیا کہ ہم اس کے ماموں لگتے ہیں اور ہاں تم سے جو میں نے کام کہا تھا وہ ضرور کرنا۔''



اس کے بعد وہ یعنی درویش محبوب علی شاہ واپس چلے گئے۔ اسی وقت عائشہ اور کرن ہمارے پاس آگئیں اور عاتکہ سے پوچھا کہ کیوں رو رہی ہو۔ کہیں ہمارے بھائی حماد نے کچھ کہہ تو نہیں دیا۔'' میں نے کہا۔

''دیر ہو رہی ہے اب چلتے ہیں گھر جا کر پوچھ لینا۔''

ابھی ہم گیٹ سے باہر ہی آئے تھے کہ روڈ پر ایک طرف رش لگا ہوا دیکھا۔ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے میں نے لڑکیوں کو ایک گاڑی پر چڑھایا اور خود اس طرف بڑھ گیا وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک درویش گاڑی کی ٹکر لگنے سے جاں بحق ہو گئے ہیں۔ میں نے قریب سے دیکھا تو وہ محبوب علی شاہ ہی تھے۔ گاڑی والا بھاگ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پولیس کی گاڑی کے ساتھ ایک ایمبولینس وہاں آ پہنچی اور اپنی کارروائی مکمل کر کے درویش کی لاش اسپتال لے گئے۔ میں وہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کیوں کہ چند ماہ پہلے درویش محبوب علی شاہ نے مجھے کہا تھا۔

''بیٹا جب میں مروں تو میری تمہیں وصیت ہے کہ مجھے کسی قبرستان کے بجائے جنگل میں دفنایا جائے اور میری قبر کچی ہی رکھی جائے۔'' اگر اس وقت حویلی والوں کو پتا چل بھی جاتا ہے کہ خاص طور پر چوہدری کو کہ میں اس کا کچھ لگتا ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن میری بھانجی عاتکہ کو پہلے بتا دینا تاکہ وہ مجھے دیکھ لے۔''

اب درویش اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو چکا تھا۔ میں سوچ چکا تھا کہ درویش کی وصیت ضرور پوری کروں گا۔ میں وہاں سے سیدھا اسپتال جا پہنچا۔ چانڈیو صاحب کا نمبر میرے پاس تھا۔ اس وقت لائن فون کی سہولت عام ہو چکی تھی میں ایک پی سی او پر گیا مگر وہ بند تھا میں دوبارہ اسپتال کے اندر آیا اور ایک ڈاکٹر کے کمرے میں گیا ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''جناب مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دیجیے۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر فون سیٹ

میری طرف سرکا دیا میں نے نمبر ملانے سے پہلے ایک سپاہی کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ جب میں چانڈیو صاحب کو فون کروں تو اس سپاہی کی بات بھی کروا دوں۔ میں نے چانڈیو صاحب سے بات کی اور انہیں ساری صورت حال بتائی۔ انہوں نے خود آنے کا فیصلہ کر لیا، یہ بات میں نے ساتھ کھڑے سپاہی کو بھی بتا دی کہ تمہارے آفیسر چانڈیو صاحب اسپتال آ رہے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کو بھی اطلاع کر دو۔'' اس سپاہی نے دوسرے سپاہیوں کو بھی بتا دیا۔ سب الرٹ ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد چانڈیو صاحب آ گئے۔ انہوں نے ایمبولینس سمیت درویش کی لاش میرے حوالے کی۔ ایمبولینس ڈرائیور کو میں نے چاند پور گاؤں چلنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم چاند پور پہنچے تو دن ڈھلنے لگا تھا۔ میں نے ایمبولینس اپنے گھر رکوائی تو گاؤں کے لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے سب لوگوں کو بتا دیا گیا کہ درویش محبوب علی شاہ جاں بحق ہو گئے ہیں اور انہی کے کہنے پر یعنی ان کی وصیت پر ہی ان کی لاش کو یہاں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد انہیں جنگل میں لے جا کر دفنا دیا جائے گا۔ یہ بات منٹوں میں پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ ایمبولینس واپس بھیج کر میں نے گاؤں کے چند لوگوں کو لاش کے پاس چھوڑا اور سیدھا حویلی پہنچا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ حویلی کے گیٹ پر پہنچ کر اندر ایک عورت کے ہاتھوں پیغام پہنچایا عورت کو میں نے بتا دیا تھا کہ درویش اصل میں ثریا بیگم کے چچازاد بھائی تھے۔ ثریا بیگم جانتی تھیں وہ روتی ہوئی میرے ساتھ گھر آ گئیں۔

سارا گاؤں اکٹھا ہو چکا تھا۔ صرف چوہدری کرم دین ہی نہ آ سکا تھا۔ سب گاؤں والوں نے مل کر درویش محبوب علی شاہ کو جنگل جا کر ایک گھنے درخت کے نیچے قبر کھود کر دفنا دیا۔ محبوب علی شاہ کے جنازے پر ان کے بہت کم رشتہ دار ہی پہنچ سکے تھے۔ جو بعد میں آئے تھے وہ چوہدری کرم دین کی حویلی میں ثریا بیگم کے ہاں ہی رکے تھے۔ ثریا بیگم غمزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھیں کہ ان کے رشتے دار ان سے مل

رہے ہیں۔ شام کو عاتکہ بھی حویلی میں آ چکی تھی کیونکہ صبح اتوار کی چھٹی تھی اور عاتکہ چھٹی اپنے والدین کے ہمراہ ہی گزارتی تھی۔ اسی رات کی بات تھی کہ ثریا بیگم نے پہلی بار مجھ پر غور کیا تھا۔ کچھ دیر میری طرف غور سے دیکھنے کے بعد فوراً مجھے گلے لگا لیا اور بولیں۔

''میرے بیٹے کہاں گم تھے۔ تم نے تو بعد میں حال تک نہ پوچھا۔ بیٹے میری آنکھیں تھک گئی تھیں۔ تم مجھ سے دور کیوں رہے، تم نے یہ نہ سوچا کہ میری ماں کا کیا حال ہوگا۔''

میں نے کہا۔''ماں مجھے معاف کر دیں اگر اب بھی چوہدری صاحب کو پتا چل گیا کہ میں وسیم ہوں تو میری موت یقینی ہے۔'' چوہدری کو تو پتا نہ چل سکا لیکن اسی وقت عاتکہ کمرے میں داخل ہوئی اور چند باتیں اس نے سن لی تھیں اور وہ ہکا بکا سی میری طرف دیکھ رہی تھی پھر چپ چاپ آ کر وہ بھی میرے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔ ثریا بیگم اور حیران ہو گئی تھیں کہ ماجرا کیا ہے کیوں کہ عاتکہ رونے کے ساتھ ساتھ مجھے برا بھلا بھی کہہ رہی تھی۔ دھوکے باز فریبی اور ساتھ ہی وہ میرے احسانات کا شکریہ بھی ادا کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ چکا ہے لہٰذا فوراً ہی اس کو جھنجوڑا اور ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ بولی۔

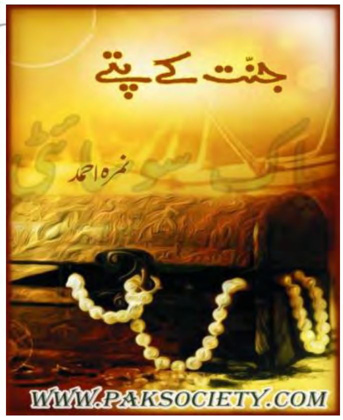
''کیا میں نے نہ کہا تھا کہ جو تم ہو وہ نظر نہیں آتے اور تم ہر بات پر بہانہ بنا لیتے تھے۔''

پھر باہر قدموں کی چاپ ابھری تو دونوں ماں بیٹیاں مجھ سے الگ ہو کر بیٹھ گئیں۔ آنے والی ایک ملازمہ تھی جو ہمارے لیے دودھ گرم کر کے لائی تھی۔ دودھ رکھ کر وہ چلی گئی تو میں نے ثریا بیگم سے کہا۔

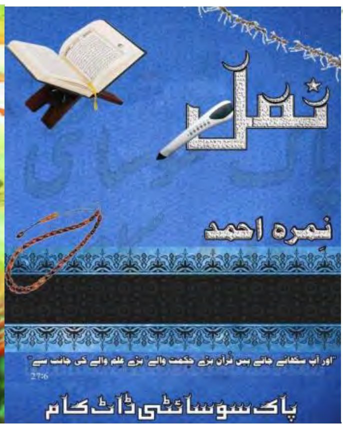
''ماں جی یہ عاتکہ میرے پاس ہی رہتی ہے اور ہم دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے ہیں۔''

پھر عاتکہ نے ان کی مجھ سے ملنے اور ابھی تک ظاہر نہ ہونے کی کہانی بیان کرنا شروع کر دی اور میں دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چل دیا اور کمرے میں آتے ہی بیڈ پر گرتے ہی سو گیا۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ مجھے جاگنا بہت بھاری محسوس ہوا

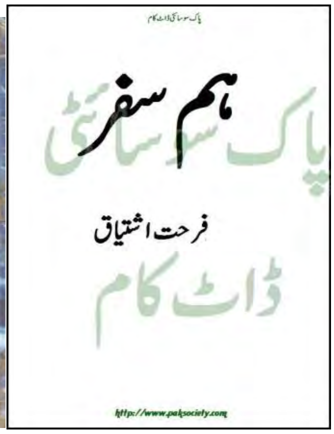
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

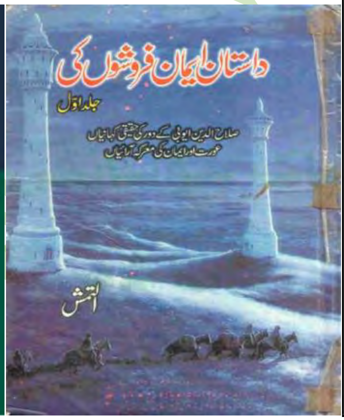




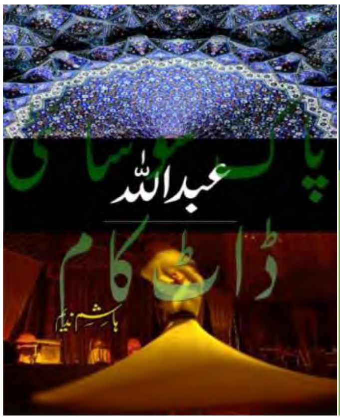


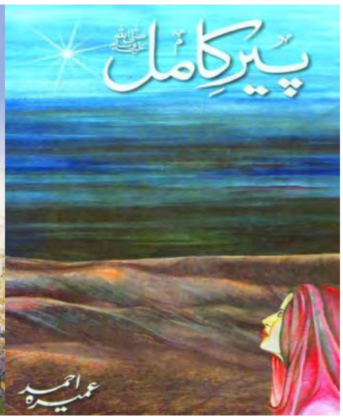


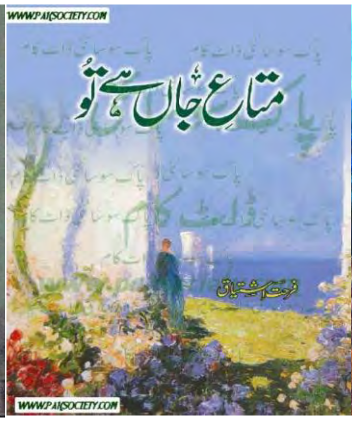


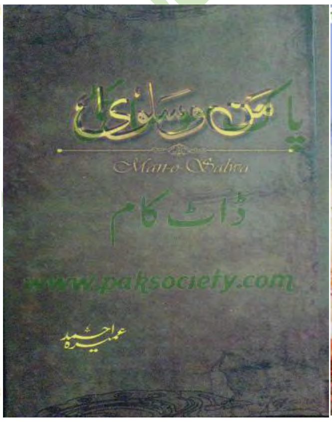




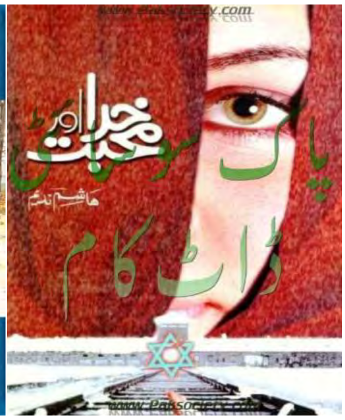


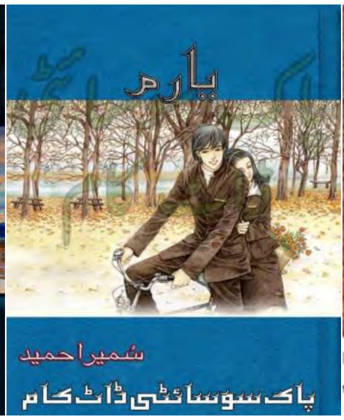




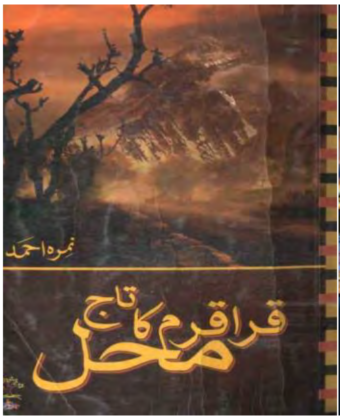












تھا اس لیے صبح 9 بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ میں نہا دھو کر تازہ دم ہوا اور اسی وقت خادمہ نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی۔ ناشتے پر چوہدری کرم دین اور کچھ دوسرے مہمان بھی تھے۔

نام سے مجھے مخاطب کیا تھا لیکن چوہدری کرم دین کی آنکھوں میں اپنے لیے میں نے ناپسندیدگی دیکھی تھی لیکن چوہدری کرم دین نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

ناشتا کر کے میں جنگل میں درویش کی قبر پر چلا گیا۔ فاتحہ پڑھ کر ابھی پلٹا ہی تھا کہ میری گردن پر سرد نال آ لگی اور ایک آواز سنائی دی۔

"مسٹر ہادی صاحب زندگی پیاری ہے تو ہمارے ساتھ چلیے۔ اگر کوئی آواز نکالی یا ایڈونچر کا شوق دل میں کھد بد کرے تو اس پر عمل کرنے پر تم اوپر بغیر ٹکٹ کے پہنچو گے، جیسے ملک میں مہنگائی اوپر اور اوپر جا رہی ہے۔"

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے ساتھ لے جانے والے تین ہٹے کٹے بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی تھے جو شکل سے ہی بدمعاش لگتے تھے۔ میں نے خوف زدہ سی آواز میں ان سے پوچھا۔

"تم کون ہو اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور کیوں؟"

میری بات پر ان میں سے ایک نے قہقہہ لگا کر میری کمر پر بندوق کا دستہ مارتے ہوئے کہا۔ "شہری بابو فالتو سوال نہیں پوچھو گے کیوں کہ ہمیں حکم ہوا ہے کہ تمہیں اپنے ساتھ لے آئیں اور حکم ہمارے سردار جابر خان نے دیا ہے۔ باقی کا ہمیں کوئی پتا نہیں۔"

وہ مجھے جنگل میں کافی دور جانے کے بعد ایک پرانا ریسٹ ہاؤس میں لے آئے اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ راستے میں ان کی باتوں سے محسوس ہوا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے ایک بڑے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے کچھ ساتھی پولیس کی تحویل میں بھی تھے۔ جس کو رہا کروانے کے چکر میں سردار شہر یعنی ملتان گیا ہوا تھا اور یہاں ڈیرے پر صرف کچھ ڈاکوؤں کے سمیت نائب سردار موجود تھا جس کا نام ملنگی معلوم ہوا تھا۔

مجھے اغواء کر کے لانے والوں کے طرز عمل پر مجھے محسوس ہوا تھا کہ ان کو مجھ پر زیادہ سختی نہ کرنے کی ہدایت جاری کی گئی ہیں۔

☆......☆

ریسٹ ہاؤس پرانے طرز کا بنا ہوا تھا اور اس کے صحن میں ایک شیشم کا درخت تھا جس کے نیچے دو ڈاکو ایک چارپائی پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے لانے والوں سے انہوں نے پوچھا۔

"یہ کسے لے آئے ہو؟ لگتا ہے بہت ہی موٹی آسامی ہے۔"

انہوں نے جواب میں نہ جانے کیا کہا تو وہ ڈاکو ہنس پڑے پھر ایک نے ان سے پوچھا۔ "سردار ملنگی کہاں ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ابھی آ جاتے ہیں۔ تم اسے سامنے والے کمرے میں بند کر دو۔"

دونوں آدمیوں نے مجھے سامنے والے کمرے میں بند کر دیا اور خود پہلے والوں کے پاس صحن میں شیشم کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔

میں نے کمرے نظر دوڑائی تو وہاں سیلن زدہ فرش پر ایک میلی سی پھٹی پرانی چٹائی بچھی تھی، ایک بلب کمرے کی روشنی کو تیز کر رہا تھا۔ میں یہاں بیابان جنگل میں بجلی کا نظام دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں پورے ریسٹ ہاؤس کے لیے ایک جنریٹر کا انتظام کیا گیا ہے اور یہ ڈاکوؤں کا مستقل ٹھکانہ ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی کہ اگر یہ ڈاکوؤں کا مستقل ٹھکانہ تھا تو انہوں نے مجھے روایتی ڈاکوؤں کی طرح کیوں نہ اغواء کیا تھا۔ میں کئی کہانیوں، خبروں میں پڑھ اور سن چکا تھا کہ ڈاکو جب اغواء کرتے ہیں تو اپنے ٹھکانے پر لے جانے کے لیے آنکھوں پر پٹی باندھتے ہیں اور ٹھکانے پر ہی لے جا کر کھولتے ہیں لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ کمرے میں ایک ٹوٹی پھوٹی الماری تھی اور اس کے

ساتھ ہی ایک کچا گھڑا کچے پیالے کے ساتھ موجود تھا۔ ایک طرف ایک دروازے کے دائیں طرف ایک روشن دان تھا اس میں بھی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ میں گھڑے کی طرف بڑھا تو دیکھا گھڑا خالی تھا۔ اتنے میں باہر سے ایک آدمی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں ایک طرف چٹائی پر بیٹھ گیا اور آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ دروازہ کھلا اور اندر آنے والا بڑی بڑی مونچھوں والا شخص تھا۔ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ بہت زیادہ شراب پیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے کاندھوں پر بندوق ڈالے میرے قریب آ گیا۔ پھر ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔

''او کاکا کی حال اے تیرا۔ ایتھے تینوں کوئی تنگی شنگی تے نئی ہووی۔''

میں جلا بھنا بیٹھا تھا فوراً بولا۔ ''تسی مینوں اے گل دسو کے مینوں ایتھے کیڑے مقصد واسطے لیاندا اے۔ تے میں تواڈا شکر گزار ہوواں گا۔'' میں نے کھلے دل سے یہ بات اس لیے پوچھی تھی کہ اب تک جو سلوک مجھ پر کیا گیا تھا اس پر یہی معلوم ہوتا تھا کہ ان کا کوئی خاص مقصد ہے اور مجھے ان سے جان کا خطرہ بالکل نہیں لگا تھا اور نہ کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ تھا ان کا۔ اس لیے میرا ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے بولنے کا انداز اکھڑا اکھڑا سا تھا اس پر وہ بولا۔

''او شہزادے دل خوش کیتا ای۔ پر حوصلہ رکھ تینوں سب کچھ دس دیواں گے۔ ذرا اپنے وڈے سردار نوں تو آنے دے۔'' اس کا بولنے کا انداز مکمل طور پر دیہاتی تھا اور ہو سکتا تھا کہ زبان بھی پنجابی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہو۔ اس لیے مجھے بھی اس کے ساتھ پنجابی بولنا پڑ رہی تھی۔ جو مجھے بالکل مشکل نہ تھی کیوں کہ میں اسی جنگل کے قریبی گاؤں چاند پور کا رہنے والا تھا۔ گاؤں دیہاتوں میں پنجابی ہی زیادہ بولی جاتی ہے۔ چاہے وہ ہزار زبانیں کیوں نہ جانتا ہو خیر میں نے اس سے پوچھا۔ ''چلو ایہہ دسد یو کہ تی کون او تے تاڈا ناں کیہ اے۔''

وہ بولا۔ ''جی او شہزادے اساں ناں تینوں شہری بابو سمجھے ساں۔ لیکن توں تے لگدا اوے کسے پنڈ دے گھر دا ایں۔''

میں نے اس کے جواب میں کہا۔ ''ہاں چاچا! میں واقعی ای پنڈ دا رہن والا ایں۔'' میں اس کے آگے بھی کچھ بتانے والا تھا لیکن وہ فوراً ہی بولا۔

''اچھا تے ہن مینوں اے دس کہ چوہدری کرم دین دے نال تیرا کی واسطہ اے۔'' فوراً ہی میرے ذہن میں بجلی کا ایک کوندا لپکا کہ ہو نہ ہو تمام ڈاکو چوہدری کرم دین کے کہنے پر ہی مجھے اٹھا لائے ہوں میں فوراً ہی بولا۔''

میرا اینا نا انا واسطہ اے کہ سنائیں درویش چوہدری دا رشتے دار ہی۔ جدوا مریا تے مینوں مرن توں پہلوں او تے دسیا۔'' میں نے کہا۔

''سردار منگی میرا مطلب. چاچا منگی اگر تم اردو سمجھ اور بول بھی لیتے ہو تو میرے ساتھ آپ نے ابھی تک جتنی گفتگو کی ہے سب پنجابی زبان میں تھی۔''

اس پر سردار منگی دوبارہ بولا۔ ''او جیو شہزادے! اگر تمہیں اس پر اعتراض ہے تو اب ہم تم سے اردو میں ہی بات کر لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''چاچا منگی تم مجھے پڑھے لکھے بھی لگتے ہو اور پھر ان تمام ڈاکوؤں سے الگ بھی ہو یہ کیا ماجرا ہے؟''

وہ کہنے لگا۔ ''اصل میں، میں نے گاؤں میں دس کلاس پڑھی تھیں۔ پھر زیادہ تر جنگلوں میں ہی میری زندگی گزری ہے اس لیے میں پنجابی نہیں بھول سکا لیکن تمہارے لیے ایک پیشکش ہے اگر تم مان گئے تو بہت اچھے رہو گے۔''

میں نے پوچھا تو کہنے لگا۔ ''زندگی گزارنے کے دوران ہزاروں کام ایسے ہوتے ہیں جن پر ہم صرف بے بس ہی نہیں بے زبان بھی ہو جاتے ہیں پھر ہم دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور جو ہمارا حاکم ہوتا ہے وہ ہمیں کٹھ پتلی بنا کر اپنے اشاروں پر نچاتا ہے اور ہم بے بسی سے ناچتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے پھر اگر کسی کو لے لیں جسے ہم قانون سے انصاف مانگیں تو

اور بھی ہمیں نقصان ہوتا ہے اور قانون ہمیں انصاف دینے کی بجائے ہمیں جرم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جیسے کہ اب تم ہمارے قبضے میں ہو۔ اگر ہم تجھے نہ بھی چھوڑیں تو قانون ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ پھر چوہدری کرم جیسے آدمی کی پشت پناہی بھی قانون کرتا ہے جیسے ہم نے اسی کے کہنے پر تجھے اٹھوایا ہے اور ہم کافی عرصے سے چوہدری کرم دین جیسے ہزاروں چوہدریوں کے کئی کام ہم معاوضے پر کر جاتے ہیں لیکن کسی پر اندھا اعتماد کبھی نہیں کرتے۔ اس لیے میرا مشورہ مانو تو چھوڑو سب کچھ اور ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ تو تم قسم سے مزے سے رہو گے۔ پھر اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو بھی بے حساب دولت دو گے چند سالوں میں تم ان چوہدریوں سے بھی زیادہ دولت مند ہو جاؤ گے پھر ان جیسے کئی چوہدری یا پولیس والے یعنی قانون کے رکھوالے تمہیں دور سے سلام کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔''

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ویکن کچھ نہیں یہ الفاظ جیسے لیکن، کیوں، اگر، مگر جیسے الفاظوں سے مجھے سخت نفرت ہے یہ ہی لفظ ہماری زندگی پر راج کرتے ہیں۔ ان ہی الفاظ سے ہم انسانوں کو قتل کرتے ہیں انہیں الفاظوں سے ہم بکھرتے ہیں۔''

میں نے سردار ملنگی کو بہت زیادہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بہت باتونی قسم کا انسان ہے لیکن یہ سمجھ نہ آئی تھی کہ یہ اس کام میں شامل کیوں اور کیسے ہوا۔ یہ ہی سوچتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے چاچا ملنگی کہ تمہارے لوگوں نے مجھ پر بہت زیادتی کی مجھے بلاوجہ ہی یہاں لے آئے ہیں اور یہ آپ بھی کر رہے ہیں کہ مجھے واپس بھیجنے کی بجائے الٹا مجھے اپنے ساتھ شامل کرنے کو کہہ رہے ہیں۔''

وہ کہنے لگا۔ ''یہاں دنیا میں کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہوتا ہم چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔''

میں نے پوچھا۔ ''چاچا ملنگی کبھی تم نے محبت کی ہے اگر کی ہے تو یہ بتایئے کہ اس گروہ میں کیوں اور کیسے شامل ہوئے اور کیسے چھوٹے سردار بنے ہو۔ میں ضرور جاننا چاہتا ہوں۔''

اس پر ملنگی ہنستے ہوئے بولا۔ ''کہیں تم سی آئی ڈی والے یا پولیس والے تو نہیں جو اتنی باتوں کے بعد بھی اب ہماری ذاتی باتیں پوچھنے پر آ گئے ہو لیکن تم کالج کے اسٹوڈنٹ ہو تمہیں ان ذلیلوں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ خیر تمہیں بتا دیتا ہوں کیونکہ اب ہماری رات ایسے ہی گزرے گی کیونکہ سردار اب صبح کو ہی آئے گا اور ہم نے کون سا کہیں ڈاکا ڈالنا ہے یا کسی کو اغواء کرنا ہے اسی لیے یہاں سردار کے کہنے پر ہم صرف پانچ آدمی ہی آئے تھے۔ کیونکہ شہر میں بہت ضروری کام تھا اور کچھ اپنے آدمی تھانے میں بند تھے ان کو بھی رہا کروانا تھا۔ بڑا سردار اب اسی سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔''

میں جلد از جلد اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا اور وہ کچھ بتانے کی بجائے پٹڑی سے ایک بار پھر اتر گیا تھا۔ ویسے آدمی اچھا تھا۔ نہ جانے وہ کیوں اس رستے پر آ گیا تھا۔ چار گھنٹوں میں میرا دوست بن چکا تھا لیکن مجھ سے بڑا تھا اس لیے بھی میں اسے چاچا ملنگی کہنے لگا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''چاچا تم اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں بتاتا ہوں۔'' پھر باہر سے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی وہ آیا تو بولا۔ ''ہاں شیدے کھانا تیار ہوا یا نہیں۔''

وہ بولا۔ ''جی سردار ہو چکا ہے بس آپ کے حکم کا انتظار تھا۔''

اس پر ملنگی نے اس سے کہا۔ ''تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ہمارے شہزادے کو بھوک لگی ہوئی ہے پانی کے ساتھ تو گزارہ نہیں ہوتا نا۔''

اس سے پہلے بھی یہی ڈاکو مجھے دو دفعہ پانی لا کر پلا چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی کھانا آ گیا اور میں ملنگی کے ساتھ مل کر کھانا کھانے لگا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ میں نے اس سے اچھی طرح انصاف کیا تھا۔ بعد میں ایک بار پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے ایک بار پھر سردار ملنگی کو یاد دلایا تو وہ اس وقت خاموش

ہو گیا۔ میں ڈر گیا کہ نہ جانے کیا کہہ ڈالے لیکن وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''بیٹا زندگی کیا ہے اس کا جواب بہت سے فلاسفر اور مصنف و شاعر وغیرہ اپنے الفاظ میں بتا چکے ہیں زندگی میں انسان کے ساتھ نشیب و فراز بھی آتے ہیں۔ یہ زندگی آہ یہ زندگی بھی عجیب شے ہے کبھی ہنسانی ہے تو کبھی رلاتی ہے۔ کبھی بہاروں کا نشیمن تو سسکیوں آہوں کی ذنگ ماری سیاہ کالی راتوں جیسی ہے۔ کہیں شہنائیاں گونجتی ہیں تو کہیں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔ کسی بھی لمحے اپنا رخ بدل لے کوئی نہیں جانتا۔

زیست ہے کیا آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا۔ کسی نے اسے اسٹیج کا نام دیا۔ اس میں ہر آنے والا اپنا اپنا کردار ادا کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ زندگی کو نہ کوئی سمجھ پایا ہے نہ کوئی سمجھ پائے گا۔ کہیں اپنوں کے ستم کہیں اپنوں کے درد کہیں اپنے دشمن بن جاتے ہیں تو کہیں اپنوں کو تڑپاتی ہے۔ بیٹا ہادی یہ زندگی جس کے بارے میں تم مجھ سے پوچھ رہے ہو غموں، دکھوں، آہوں، تنہائیوں، اداسیوں کا وہ گہرا سمندر ہے۔ جو پل بھر میں منہ زور ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ ان گنت طوفان برپا کر دیتی ہے۔ ہم اپنی زندگی کو سنوارتے بالآخر اپنے وجود کو مٹی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم سے روح پرواز کر جاتی ہے اور جسم فنا کی کشتی میں سوار ہو جاتا ہے۔ ہم محبتیں چاہتے ہیں۔ محبت دیتے نہیں اور ہم خوشیوں کے طلب گار ہیں۔ خود کو ہی دیکھتے ہیں لیکن کبھی ہم نے یہ نہیں سوچا کہ کوئی ہماری وجہ سے زندگی کی بازی نہ ہار جائے۔ ہماری وجہ سے کسی کی زندگی غموں کی سسکیوں کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔ کسی کی زندگی ہماری وجہ سے ریگستان کی ریت کی طرح بکھرتی جا رہی ہے۔ لوگوں کی زندگیاں تباہ و برباد کر کے ہمیں سکون ملتا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ ہمارے دیئے دکھ برداشت کر پائے گا یا نہیں ہمیں تو اپنے آپ سے غرض ہے کسی کی زندگی عذاب بن جائے یا کوئی جیے یا مرے ہمیں اس سے کیا۔'' یہاں تک کہنے کے بعد وہ رکا اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''بیٹے اب تم خود سوچ لو کہ یہ چوہدری کرم دین ہے اس نے ڈاکوؤں کو یعنی ہمیں رقم کے عوض ایک انسانی زندگی فنا کرنے کو کہہ دیا اور ہم تجھے اٹھا لائے اور پھر ہمارے متعلق سوچیے ہم نے کون سا نیک کام کیا۔ ہم بھی دولت کے لالچ میں تمہاری زندگی لے لیتے یہ بھی نہ سوچتے کہ تم اصل آدمی ہو یا نقل ہو۔ وہ تو تمہاری باتوں سے محسوس ہوا تھا کہ تم وسیم نہیں ہو بلکہ حماد عرف ہادی ہو۔ بعد میں ہمارے مقدر میں بددعائیں ہوتیں۔ بیٹے زندگی اسی طرح کی ہوتی ہے۔ اب یہ ہی دیکھیے سب مجھے ملنگی کہتے ہیں، اب سے نہیں بچپن سے اسکول میں بھی میرا نام ملنگی ہی تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے ملنگی کیوں کہتے ہیں یا میرا اس نام جو بھی میرے والدین نے رکھا تھا کیا ہے یا کبھی رکھ ہی نہ پائے ہو کسی مجبوری کی وجہ سے خیر مجھے میرے والدین کا بھی معلوم نہیں کہ مر گئے ہیں یا زندہ ہیں بہر حال میں ابھی بچہ تھا صرف تین ماہ کا دودھ پیتا بچہ جس کو کسی بات کا ہوش نہیں نہیں ہوتا۔ نہ کسی انسان کا ڈر نہ ہی کسی جانور کا ڈر بس اسے صرف ماں کا لمس چاہیے اور ماں کا دودھ بھوک مٹانے کے لیے۔ گاؤں سے تھوڑی دور پانی پینے کے لیے کنواں ہوتا تھا اب تو کنوؤں کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ بس کہیں کہیں ہی پرانے زمانوں کی یاد تازہ ہوتی ہے یعنی اب بھی کہیں کہیں پانی والے کنویں دکھائی دیتے ہیں۔ میں اس کنویں کے پاس پڑا بھوک سے رو رہا تھا۔ گاؤں سے چند خواتین گھڑے سر پر اٹھائے پانی بھرنے کے لیے اسی کنویں کے پاس آ رہی تھیں جب وہ قریب آئیں تو انہیں میرے رونے کی آواز آئی وہ ڈر گئیں کہ شاید یہاں کوئی جن یا بھوت ہے جو رو کر انہیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے پھر میں انہیں منڈیر کے پاس ہی لیٹا نظر آ گیا اب بھی وہ خواتین زیادہ ڈر گئی تھیں۔ میرے قریب نہیں آ رہی تھیں کیوں کہ ان کے مطابق کسی انسان کے بچے کو اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی اس چھوٹی سی عمر میں، وہ بھی تنہا کیوں نزدیک، دور کہیں بھی میری ماں ان کو نظر نہیں آ رہی تھی لہٰذا ان میں ایک

عورت بہت دلیر تھی اس کا نام ماسی مصیبتے تھا۔ اس
کے بھی اصل نام کا کسی کو کم ہی پتا ہوگا۔ سب گاؤں
میں ماسی مصیبتے ہی کہا جاتا تھا لیکن یہ نام پتا نہیں کس
نے رکھا تھا اور کیوں لیکن وہ بڑی دلیر اور رحم دل،
خوب صورت ہوا کرتی تھی۔ وہ بیوہ تھی اس کی شادی
بھی سولہ سترہ سال کی عمر میں ہو چکی تھی لیکن ایک سال
میں اولاد تو نہ ہوئی لیکن اس کا شوہر دنیا سے چلا گیا پھر
نہ آنے کے لیے، ماسی مصیبتے اپنے شوہر سے بہت
محبت کرتی تھی اس نے دوبارہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ
کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے ساس سسر بھی فوت
ہوگئے، ماں باپ کے پاس وہ کبھی گئی نہ تھی۔ اب بھی
اس کی عمر بیس برس کے قریب تھی اور خوب صورتی اور
حسن سے بھرپور تھی۔ ہر شخص اس سے شادی کی
خواہش رکھتا تھا۔ کئی ہوس پرست لوگوں نے اس کے
قریب آنے کی کوشش کی لیکن ماسی مصیبتے نے کسی کو
گھاس تک نہ ڈالی الٹا جوتے کھا کر واپس جاتے تھے
پھر آہستہ آہستہ سب کو سمجھ آگئی لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی
موقع کی تلاش میں بھٹک رہا ہوتا تھا۔ سب عورتوں
نے اسے کہا ماسی تم تو بہت دلیر ہو پھر دیکھتی نہیں کہ بچہ
رو رہا ہے اس پر ماسی مصیبتے واقعی آگے دلیری سے
بڑھ گئی اور میرے قریب آگئی اور بولی آجاؤ نی یہ جن
بھوت نہیں یہ انسانی بچہ ہی ہے کوئی عورت اسے یہاں
چھوڑ کر بھاگ گئی ہے اس کی یہ بات سن کر تمام عورتیں
کنویں پر آگئیں اور مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔ بچہ
انسان کا ہو یا پھر جانور بہت پیارا ہوتا ہے۔ میں بھی
بہت خوب صورت اور پیارا تھا۔ نیلی نیلی آنکھوں والا
گول مٹول سا بچہ اپنے آپ سے بھی بے خبر سب
عورتیں طرح طرح کی باتیں کرنے لگیں۔ کوئی کہنے
لگی میں گناہ کی پیداوار ہوں تو کوئی کہنے لگی مجھے میری
ماں نے کسی مجبوری کے تحت یہاں رکھ دیا ہے کہ شاید
اسے کوئی پال لے، کوئی کہنے لگی ہو سکتا ہے ہمارے
آنے سے پہلے کوئی عورت اسے کنویں میں پھینکنے کے
لیے لائی ہو اور پھر ہمیں دیکھ کر چھپ گئی ہو لہذا کئی
باتیں ہونے لگیں تو ماسی مصیبتے بولی۔ نی نامرادو یہ کچھ
بھی ہے لیکن ہے تو بچہ نا اس کا سوچو کرنا کیا ہے۔ اسے
یہاں تنہا تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔ لہذا سب نے فیصلہ کیا
کہ اسے مصیبتے ہی گھر لے جائے اور اس کی پرورش
کرے۔ ماسی مصیبتے کے پاس شوہر کی چھوڑی ہوئی
کافی دولت تھی اور جائیداد بھی۔ جس سے حصہ آتا رہتا
تھا۔ اس لیے اسے ایک یا کئی بچے بھی پالنا کوئی مشکل
نہ تھا۔ لہذا ماسی مصیبتے نے مجھے اٹھایا اور اپنے گھڑے
میں کنویں سے پانی بھرا سب کے ساتھ چل پڑیں۔
گاؤں میں کوئی بھی کام ماحول سے جس کا تعلق علیحدہ
ہو یعنی ماحول سے نہ ملتا ہو اس کی خبر چند منٹوں میں
پورے گاؤں میں پھیل جاتی ہے۔ شہروں میں ایسا کچھ
نہیں ہوتا وہاں تو لوگ اپنے ہمسائیوں کو بھی نہیں
جانتے کہ کون کیا کر رہا ہے، کیا کون رہتا ہے یہاں
کون نہیں، ماسی مصیبتے کی میرے حوالے سے بھی خبر
پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ کئی عورتیں مصیبتے کے
پاس مجھے دیکھنے بھی آئیں تھیں۔ ماسی مصیبتے کے لیے
گوالا دودھ دے جاتا تھا لہذا اسی دودھ سے میرا بھی
پیٹ بھر جاتا۔ دو ڈھائی سال کا ہوا تو مجھے نرم غذائیں
کھانے کو دی جانے لگیں پھر تقریباً 6 ماہ بعد میں
باقاعدگی سے روٹی سالن کھانے لگا۔ جب پانچ سال
کا ہوا تو مجھے گاؤں کے ہائی اسکول میں داخل کروا دیا
گیا۔ زندگی گزر رہی تھی وقت گزر رہا تھا گاؤں کی ہی
ایک لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگی کیونکہ وہ بچپن سے ہی
میرے ساتھ اسکول جاتی تھی اور ہم اکٹھے ہی کھیلا
کرتے پھر جب میری عمر 16 برس ہوئی تو وہ 14
برس کی ہو چکی تھی، وہ خوب صورتی میں بے مثال تھی۔
14 برس کی عمر میں ہی وہ 18 برس کی لگتی تھی۔ میں بھی
اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ ہماری محبت پاکیزہ
محبت کو آخر کار پر لگ گئے۔ ہر طرف گاؤں میں چہ
میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ انہی دنوں کی رقیب کو یہ
بات بالکل پسند نہ آئی کہ لبنیٰ کا نام میرے ساتھ لیا
جائے۔ ہم نے میٹرک پاس کرلیا تھا اس خوشی میں
دونوں گھرانے شامل تھے۔ پھر اسی دن ہماری منگنی
کردی گئی۔ ہم ان دنوں بہت خوش تھے۔ لبنیٰ تو
پھولے نہ سما رہی تھی اسی دن لبنیٰ کو اور مجھ کو دو علیحدہ
علیحدہ خط رقیب کی طرف سے موصول ہوئے جس میں

ہم دونوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ ہم منگنی توڑ دیں اس کے علاوہ ایک دوسرے سے ملنا بھی چھوڑ دیں ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔ خیر پیار کرنے والے ڈرتے نہیں ہم بھی نہ ڈرے اپنی اپنی زندگی سے خوش تھے پھر شہر میں جاکر ایک دوست کے ساتھ مل کر میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ انہی دنوں کچھ کلاس فیلوز نے کاغان ناران جانے کا فیصلہ کیا ان کے ساتھ ان کی فیملیاں بھی ہوتیں۔ کچھ کلاس فیلوز نے مجھے بھی تیار کرلیا۔ لہٰذا میں اپنے ساتھ لبنیٰ کو بھی لے لیا اور اپنی پالنے والی ماں یعنی ماسی مصیبتے کو ساتھ لے کر اپنے دوستوں سمیت کاغان ناران کی طرف چل پڑے۔ ہم تینوں پہلی بار ان علاقوں کی طرف آئے تھے۔ ہمارے گروپ کی کئی خواتین اور مرد کئی بار ان اور ان جیسے کئی دوسرے علاقوں کی سیریں کر چکے تھے۔ اس لیے وہ ان تمام راستوں اور ان کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ ہمارے تو وہی گائیڈ تھے وہ ہمیں ہر جگہ ہر راستے پر پہاڑ پر خوب صورت جگہ کے بارے میں بریفنگ دیتے رہے۔ اس طرح ہم سب لطف اندوز ہوتے کاغان جا پہنچے۔ ان دنوں موسم بہت پیارا تھا۔ لہٰذا جی بھر کے انجوائے کیا پھر ناران چلے گئے۔ ناران کی پرلطف سیر کرنے کے بعد مری آگئے۔ مری آکر بھی نتھیا گلی اور کئی جھیلوں اور آبشاروں کے جھرنوں سے مزے کے دن گزارے۔ لبنیٰ نے کئی بار مجھے اور ماں مصیبتے کو کہا کہ ہمیں یہاں ہی رہ جانا چاہیے۔ وہ ایک یادگار سیر تھی۔ لہٰذا آٹھ دن بعد ہماری واپسی ہوئی تھی۔ واپسی کے دوسرے دن ہی لبنیٰ کو اغوا کرلیا گیا۔ اغوا کار کو میں جانتا تھا اس کا نام ساجد تھا اور وہ گاؤں کے ایک چوہدری کا صاحبزادہ تھا۔ لہٰذا ہم چند لوگ اس چوہدری کے پاس گئے تو اس نے الٹا ہمیں دھمکیاں دیں اس کے علاوہ بھی کئی ایسی باتیں کیں جس پر مجھے پتا چلا کہ یہ بھی کسی زمانے میں ماسی مصیبتے کا درپردہ عاشق نامراد رہ چکا ہے اور اس اغوا میں بیٹے ساجد کا حصے دار بھی ہے۔ لہٰذا اس کے بعد چند لوگوں نے میرا ساتھ پاکر شہر کے ایک پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر لکھوانے کی کوشش کی تو وہاں سے بھی ہمیں نامراد ہی واپس آنا پڑا۔ لہٰذا چند دن بعد ہی لبنیٰ کی لاش ہمیں وصول ہوئی۔ لبنیٰ نے مرنے سے پہلے کسی وقت میں ایک خط لکھ دیا تھا پھر اپنے لباس میں ہی چھپا لیا تھا۔ جب لاش ہمیں ملی تو جنازے کے نہلانے کے وقت وہ کاغذ اس کے لباس سے مل گیا۔ کاغذ پر اغوا ہونے سے لے کر مرنے تک کا سب احوال موجود تھا۔ ویسے لبنیٰ نے عزت بچا کر خودکشی کرلی تھی کیوں کہ ماجد اوباش لڑکا تھا۔ جب لبنیٰ نے اس کی دھمکی پر عمل نہ کیا تو اس نے اسے اغواء کرلیا اور عزت لوٹنے کی کوشش کی جس پر لبنیٰ نے پھل کاٹنے والی چھری اپنے پیٹ میں گھونپ لی تھی۔ ہم چوہدری کے خلاف کچھ بھی کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ الٹا ہمیں چوہدری کی طرف سے دھمکیوں کی بھی آفر کردی گئی تھی۔ لہٰذا رو دھو کر خاموش ہو گئے۔ میرا بہت برا حال ہوا تھا نہ ہی ٹھیک سے کچھ کھاتا نہ ہی سوتا، کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ کالج میں نے چھوڑ دیا زیادہ تر کمرے میں ہی بند رہتا۔ ماسی مصیبتے نے مجھے ہی اپنا وارث قرار دے کر تمام جائیداد میرے نام کروادی تھی۔ سیاہ و سفید کا میں ہی مالک تھا۔ تمام لوگ مجھے جینے کی راہ دکھلاتے۔ کئی لڑکیاں بن ٹھن کر تنہا میرے پاس آتیں کہ شاید میں کسی کی جانب راغب ہو جاؤں لیکن میں اپنی جگہ قائم و دائم رہا۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا کچھ عرصے بعد میں دوبارہ زندگی کی طرف آنا شروع ہو گیا۔ ایک رات میں اور میری ماں مجھے پالنے والی ماں جس سے میں بہت محبت بھی کرتا تھا۔ جسے سارا گاؤں ماسی مصیبتے کے نام سے واقف تھا۔ سوئے ہوئے تھے کہ اچانک باہر کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا جس کی آواز پر ہم دونوں یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازے سے کم از کم آٹھ رائفل بردار اور منہ پر ڈھاٹے باندھے ہمارے گھر داخل ہوئے۔ پورے گھر کی تلاشی لینے لگے۔ ماسی مصیبتے کی جیولری یعنی شادی کے وقت کا سارا زیور اور کچھ نقدی ان کے ہاتھ لگی میں چپ چاپ دیکھتا رہا۔ دو گن بردار ہم پر گنیں تانے کھڑے تھے۔ آخر میں ایک ڈھاٹا پوش نے ماسی مصیبتے سے دست درازی کرنا

شروع کر دی۔ میں یہ کبھی برداشت نہ کر سکا تھا کہ کوئی میری ماں پر ہاتھ اٹھائے یا بدتمیزی کرے۔ میں نے یکدم ہی دست درازی کرنے والے پر ایک ٹانگ چلا دی جو اس کے گن والے بازو سے ہوتی ہوئی اس کی ناک پر لگی۔ دوسرے نے فوراً ہی گن اتار کر مجھ پر تاننے کی کوشش کی لیکن میں پہلے ہی چوکنا تھا۔ لہٰذا اس سے بھی ٹکرا گیا۔ اتنی دیر میں پہلا بھی اٹھ کھڑا ہوا لیکن میری ماں ماسی مصیبے دلیر عورت تھی۔ موقع ملتے ہی وہ پہلے پر جھپٹ پڑی اور بندوق چھیننے کی کوشش شروع کر دی۔ دونوں ڈاکوؤں پر ہم دونوں ہی تھے باقی اندر مصروف تھے لہٰذا اسی چھینا جھپٹی میں ایک ڈاکو سے بندوق چل گئی اور گولی سیدھی میرے پالنے والی ماں کے پیٹ میں جا لگی۔ وہ وہیں گر گئی۔ اتنے میں پہلا والا جو مجھ سے زور آزمائی کر رہا تھا اس اچانک آفت پر گھبرا گیا تھا اس سے مجھے موقع مل گیا اور میں نے اس کی بندوق چھین کر فوراً اسی پر فائر کر دیا۔ وہ گرا تو مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں نے دوسروں کو بھی مارنا شروع کر دیا۔ وہ اندر سے آرہے تھے اور میں ان پر اپنی بندوق سے فائرنگ کر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے چار ڈاکو مار گرائے۔ میری تو دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اپنی جان کی پرواہ مجھے نہیں تھی۔ چار ڈاکو مارنے کے بعد بندوق سے گولیاں ختم ہو گئی تھی لیکن میں نے چھوڑنے کی بجائے اب اس کو ڈنڈے کے طور پر استعمال کرنے لگا اور دو ڈاکوؤں کو شدید زخمی کر دیا۔ آخر میں تنہا تھا کب تک ان سے لڑتا ان کا گھیرا تنگ ہوا تو کچھ دیر بعد میں ان کے قابو آ گیا۔ ویسے بھی وہ تعداد میں زیادہ تھے مجھ پر قابو پا کر انہوں نے میری ٹانگیں اور بازو باندھ کر گھوڑے پر لادا اور مجھے ایک جنگل میں لے گئے۔ جب ہم گھر کے دروازے کے باہر آرہے تھے تو گاؤں کے سوئے ہوئے لوگ جاگنا شروع ہو گئے تھے۔ جب تک انہیں معاملے کی سمجھ آئی ڈاکو مجھے لے کر کافی دور چلے آئے تھے۔ وہاں سے بھاگتے وقت وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں بھی وہیں چھوڑ آئے تھے بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ ان کا سردار بھی ساتھ تھا اس نے مجھے زندہ پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس حکم کے بعد بھی وہ کافی زخمی ہوا تھا۔ لہٰذا مجھے وہیں ختم کرنے کی بجائے وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے آئے جنگل آنے کے بعد بھی انہوں نے مجھے کھولنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ پانچویں دن سردار میرے پاس آیا کہنے لگا اگر تم چاہو تو ہم تمہارے ہاتھ پاؤں کھول دیتے ہیں لیکن اگر بھاگنے کی کوشش کی یا کوئی مار اماری کی تو مجبوراً ہمیں تمہارے ہاتھ پاؤں ہمیں توڑنا پڑیں گے میں تو موقع کی تلاش میں تھا لہٰذا رضامندی ظاہر کر دی کہ چلو کبھی تو موقع ملے گا اس پر کچھ شرائط کے ساتھ سردار نے مجھے کھلوا دیا اور میرے سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ میری ماں کا مجھ سے افسوس کرنے لگا۔ کہنے لگا مجھے پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھی اتنے بے غیرت ہو چکے ہیں اگر وہ بچ بھی جاتے تو میں انہیں خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا کیونکہ آج تک ہم نے کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور نہ ہی عورت کی عزت خراب کرتے ہیں۔ تمہاری ماں کے مرنے کا مجھے بے حد افسوس ہے لیکن جس کی جتنی عمر ہو وہ اتنی عمر ہی جیتا ہے۔ لہٰذا میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں صبر دے ہم سے مت ڈرنا اور نہ ہی کوئی ہمارے خلاف سوچنا، فائدے میں رہو گے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب مصالحت اختیار کر لینا چاہیے پھر جیسے ہی موقع ملا میں ضرور بدلہ لوں گا۔ دوسرے دن سردار نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولا تمہارا نام کیا ہے میں نے کہا پتا نہیں تو وہ بولا کیا مطلب تمہارے بھی نام کا تجھے پتا نہیں یا بغیر نام کے ہی ہو۔ میں نے کہا میرا نام ملنگی ہے کہنے لگا ملنگی مجھے میرے ساتھی مرنے پر بہت دکھ ہوا تھا لیکن ایک تو وہ اصول توڑ چکے تھے کہ عورت سے دور رہنے کا دوسرا تم نے اتنی دلیری دکھائی کہ فوراً سے پہلے ہی چار آدمی لڑھکا دیے اور بعد میں بھی جی داری سے لڑتے رہے اور ہم میں کئی زخمی کر دیے ہیں۔ میں تمہاری یہی دلیری دیکھ کر ہی ساتھیوں کو تمہیں زندہ پکڑنے کا حکم دیا تھا تم ہمارے کام کے آدمی ہو اس لیے میں مرنے والوں کو بھول گیا ہوں اب تم ہمارے ساتھ ہی کام کرو گے اور ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔ اس پر میں ان کے ساتھ رہنے لگا۔

ایک دن ہم چوہدری کے گھر ڈاکہ مارنے گئے تو وہاں ماجد سے مڈبھیڑ ہوگئی میں نے اصول کو توڑتے ہوئے ماجد پر فائرنگ کردی۔ آخر یہی تو میری محبت کا قاتل تھا۔ اس پر سردار مجھ پر برس پڑا۔ آخر میں نے اسے مارنے کی وجہ بتادی تو کچھ نارمل ہوا۔ آخر کار آہستہ آہستہ وہ مجھ پر اعتماد کرتا گیا میں ان کے رنگ میں ہی رنگتا گیا۔ پھر ایک دن ڈاکوؤں کا سردار ایک پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ اتفاق سے چند دن پہلے ہی وہ مجھے سردار بنا چکا تھا۔ ویسے بھی گروہ میں، میں ہی سردار کا چہیتا تھا میری بات بھی سب مانتے تھے۔ سردار کے مرنے کے بعد بھی میں ہی سردار رہا پھر میں نے اسی گروہ کے پرانے آدمی کو بڑا سردار بنا دیا اور خود چھوٹا سردار بن گیا۔ میں نے کئی آدمی ڈاکوؤں کے مار دیے ہیں اور کئی نئے بھرتی بھی کیے ہیں۔ لہٰذا تمام ڈاکوؤں پر میرا رعب زیادہ ہے۔ پھر بھی سب فیصلے دوسرے سردار پر چھوڑ دیے جاتے ہیں لیکن تمہارا فیصلہ جس نے کردیا ہے کہ اگر تم اپنی دنیا میں واپس جانا چاہو تو جا سکتے ہو اگر ہمارے ساتھ رہو گے تو بھی گھاٹے میں نہیں رہو گے۔ ویسے تو تمہارا جانا ہی بہتر ہے۔''

باہر اب سپیدہ نمودار ہو رہا تھا۔ رات میں ایک ریسٹ ہاؤس میں کھٹ پھٹ سی سنائی دی تھی۔ سردار ملنگی اب چپ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ قدرت انسان کو کیا عجیب تماشے دکھاتی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے سردار ملنگی جیسے انسان یعنی شریف انسان کو محبت کرنے کی بجائے قاتل بننے پر مجبور کردیتی ہے۔

سردار ملنگی کے کہنے پر میں آزاد تھا اور اب جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ سردار ملنگی باہر گیا اور جلد ہی واپس آیا اور کہنے لگا۔ ''بادی بیٹے رات کو بڑا سردار آگیا تھا لیکن اندھے قانون والوں نے ہمارے آدمی رہا نہیں کیے لیکن سردار کے ساتھ جانے والے آدمیوں نے چانڈیو صاحب کی لڑکی کو اٹھا لائے ہیں اور یہ چانڈیو صاحب یعنی ناظم علی چانڈیو ایک علاقے کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔''

میں ملنگی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اسے میں جانتا ہوں۔''

ملنگی بولا۔ ''وہ ایک اچھا اور ایماندار آدمی ہے اس لیے وہ رشوت بھی نہیں لیتا۔ جس کی وجہ سے ہمارے ساتھی اندر ہیں۔ بڑا سردار ساتھ تھا لہٰذا اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی لڑکی تھی۔ اب ہو سکتا ہے وہ مان جائیں لیکن پورے بیس سال بعد اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا میں نے اس لیے کیا ہے تاکہ تم مجھ پر اعتماد کرو اور ہمارے متعلق کسی کو نہ بتانا ویسے بھی تمہارے لیے ایک بات انکشاف کی ہے کہ ہم یہاں نہیں رہتے۔ ہمارا ٹھکانا ایک اور جگہ ہے یہ ریسٹ ہاؤس اور اس کے مکین تمام لوگ چوہدری کرم دین کے ہیں وہ یہاں پوست اور افیوم کی کاشت کرتا ہے۔ یہاں اس نے بہت جدید قسم کا سیکورٹی سسٹم لگایا ہے جب خطرہ ہوتا ہے تو خودکار گنوں سے خطرہ ختم کردیا جاتا ہے۔ اسی لیے کاشت کی جگہ کوئی انسان کیا جانور تک نہیں جاسکتا یہ سب چوہدری کروا رہا ہے۔ پولیس یا قانون کے ٹھیکیدار ادھر آ بھی جائیں تو گولیوں سے بھون دیے جاتے ہیں۔ اس کی پشت پناہی پر کوئی بڑی تنظیم کام کر رہی ہے جس کا تعلق کسی بڑی مافیا سے ہے اور ہمارے ملک کی جڑیں کاٹ رہی ہے۔''

سردار ملنگی کی بات سن کر میرے ذہن میں کسی شاعر کا یہ فقرہ بھی گونج رہا تھا کہ اپنے ہی گراتے ہیں نشیمن پر بجلیاں اور ہم لوگ انہی جیسے لوگوں کو ووٹ دے کر کامیاب کرتے ہیں اور یہی لوگ جھوٹے وعدوں پر دبتے ہیں، آئے دن ایک نیا وعدہ کرتے ہیں تاکہ پچھلا وعدہ بھول جائے۔ خیر ڈاکوؤں کے سردار ملنگی نے مجھے سوچوں میں گرا دیکھ کر اچانک کہا۔ ''کیا تم میرا ایک کام کرو گے؟''

میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اتنے میں ایک ڈاکو ہمارے لیے ناشتا لے کر آگیا اور چٹائی پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ ہم ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتہ کرنے کے دوران سردار ملنگی دوبارہ بولا۔ ''تم پر میں نے کئی اپنے ذاتی راز بھی کھول دیے ہیں کہ میں ایک مجبوری کے تحت اس ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہوا تھا پھر میں اس دلدل میں پھنس گیا ہوں

اب میں واپس شریفانہ زندگی میں جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتا۔ ایک تو ملتان کے تمام گردونواح میں میرا ایک نام ہے کہ جہاں بھی سنو گے ڈاکو یا سردار ملنگی کا نام نمایاں ہوگا۔ دوسرا میں جب بھی جہاں بھی رہوں مجھے قانون کے رکھوالوں نے بے گناہ ہی پکڑ کر ہزاروں قتل واغوا میرے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں لہٰذا تم سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا نام لیے بغیر تم ایسا کرو کہ اس جنگل میں ناجائز بردہ فروشی کا دھندہ ختم کروا دو۔''

میں نے حیرت سے سردار ملنگی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔''میں ختم کروا دوں مگر کیسے؟ کیا میرے کہنے پر چوہدری کرم دین جو میری جان کے بھی دشمن ہے وہ یہ کاشت بند کر دے گا؟''

سردار ملنگی بولا۔'' نالائق تم خاصے سمجھدار ہو کر بھی ایک بات سمجھ نہیں سکے۔ بیٹا تم کسی ایماندار آفیسر کے پاس جا کر اسے بتانا کہ میں نے جنگل میں کیا دیکھا ہے بلکہ ایک پلان اور ہے کہ تم جب یہاں سے جاؤ تو ہمارے تمام آدمیوں سے چھپ کر جنگل میں ہی کچھ دیر رک جاؤ۔ پھر موقع دیکھ کر دوبارہ ریسٹ ہاؤس میں آؤ پہرے داروں کی نظروں سے بچ کر اور میں تمہیں بتا دیتا ہوں اس کمرے میں ناظم علی چانڈیو کی بیٹی سونیا بند ہے۔ اسے آزاد کروا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ کچھ دور تمہیں میرا ایک آدمی جو تمہیں کھانا وغیرہ دے کر گیا تھا یہ میرا اپنا آدمی ہے۔ یعنی میرے دکھ سکھ کا میرے کئی رازوں کا امین ہے۔ اس پر میں اندھا اعتماد کرتا ہوں ویسے بھی یہ میرے اسکول کا ساتھی ہے۔ یہ تمہیں وہاں سے لے کر جنگل سے باہر چاند پور جانے والے راستے پر چھوڑ آئے گا پھر تم اسے یعنی سونیا کو لے کر شہر چلے جانا اور ناظم علی چانڈیو سے مل کر سردار ملنگی نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور پھر جنگل میں چوہدری کرم دین کی کارروائی کے متعلق بھی بتا دینا اور کہنا کہ جس مشن میں اسے ناکامی دیکھنا پڑی تھی اب اسی مشن کو کامیاب کر لے اور مجھے یاد رکھے اور جب بھی میری ضرورت پڑے تو تنہا یہ انگوٹھی لے کر جہاں بھی ہم ہوں آ جانا۔ راستے میں کوئی بھی روکے تو اسے بتانا کہ مجھے سردار ملنگی نے بلوایا ہے اور نشانی کے طور پر انگوٹھی دی ہے اگر وہ اپنے ساتھ اپنی فورس لائے گا تو وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ نہ ہی میں اس کا کوئی ذمہ لے سکتا ہوں اور شاید کہ میں یہ گروہ بھی چھوڑ دوں۔ یا ختم کر دوں۔''

میں اس کی یہ باتیں سمجھ گیا تھا کہ سردار ملنگی اپنی داستان سنا کر جذباتی ہو گیا ہے اور اب اس کا ضمیر اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ یہ بھی جان گیا تھا کہ فطرتاً وہ ایک اچھا آدمی ہے اور بتا دینا کہ یہ ڈاکوؤں کے سردار ملنگی نے بنا کسی مطلب یا لالچ کے یہ کام کیا ہے۔ یعنی اس کی بیٹی سونیا کو چھوڑ دیا ہے اور دوسرے تمام ڈاکوؤں کو اس بات کا علم نہیں ہونے دیا۔ دوسروں کے سامنے میں بھی ان کے ساتھ ہوں ویسے بھی مجھ پر شک نہیں کریں گے کیونکہ سردار پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اندازہ ہی لگایا جائے گا کہ سونیا خود ہی اس کے چنگل سے نکل بھاگی ہے۔ اسے جنگل میں ہی تلاش کیا جائے گا کیونکہ جنگل خطرناک ہے۔ اتنے میں تمہیں وقت مل جائے گا بھاگنے کا۔ مجھے یہ پلان اچھا لگا تھا۔

سورج اب سر پر آ گیا تھا۔ بڑا سردار سویا ہوا تھا اور اس کے ساتھی بھی سوئے ہوئے تھے۔ سردار ملنگی نے مجھے گلے لگایا اور میرے کان میں سرگوشی کی کہ آئندہ بھی ہم ملتے جلتے رہیں گے۔ پھر ایک ڈاکو کو آواز دی کہ اسے لے جاؤ اور ریسٹ ہاؤس سے باہر تک چھوڑ آؤ۔ وہ ڈاکو سویا ہوا تھا اور ابھی ابھی جاگا تھا وہ سونیا کو لانے کے وقت دوسروں کے ساتھ تھا اس لیے سردار ملنگی نے اسے گواہ بنایا تھا کہ میں ان کے پاس سے چلا گیا تھا تب بعد میں سونیا بھاگی ہے تاکہ بعد میں مجھ پر بھی شک نہ جا سکے۔

میں ریسٹ ہاؤس سے نکلا تو میرے ساتھ ڈاکوؤں کا ایک آدمی بھی تھا تھوڑی دور جانے کے بعد میں نے کہا۔''اب تم واپس چلے جاؤ آگے میں خود چلا جاؤں گا۔'' اسے نہ جانے کتنی زیادہ نیند آ رہی تھی وہ

میرا شکریہ ادا کرتا ہوا واپس چلا گیا میں وہیں ایک درخت کے قریب بیٹھ گیا۔ میرے پاس اس وقت صرف ایک ریوالور تھا جس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا جو مجھے چلتے وقت چپکے سے سردار ملنگی نے دیا تھا اگر میں سردار ملنگی کو بتا دیتا کہ چوہدری کرم دین کا میں ہی مطلوبہ آدمی ہوں اور میرا نام ہی پہلے وسیم عرف ہوا کرتا تھا جو بعد میں بدل کر حماد عرف ہادی رکھا گیا تھا تو نہ جانے اس کا ردعمل میرے ساتھ کیا ہوتا شاید میں ابھی تک زندہ نہ ہوتا میں تھوڑی دیر کے بعد ہی ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے راستوں کا اور سیکیورٹی کا میں اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ پہلے کبھی کسی مکان میں چوری چھپے داخل ہونے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے اب میں ڈر رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دو آدمیوں کی آواز سنی اور فوراً ہی قریبی جھاڑی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ آگے گزر چکے تھے میں دوبارہ اٹھا اور ریسٹ ہاؤس کی ایک دیوار پر چڑھا دیوار چھوٹی تھی اس لیے مجھے چڑھنا آسان رہا۔ دوسری جانب چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگانے کی آہٹ بہت تیز ہوئی تھی وہ تو غنیمت تھا کہ ادھر کوئی نہیں تھا۔ ویسے بھی چوہدری کرم دین کے آدمی اور ڈاکو اتنے مطمئن تھے کہ انہیں یقین تھا کہ ادھر جنگل میں پھر اس ریسٹ ہاؤس تک کوئی کم ہی پہنچ پانے گا۔ اس لیے وہ زیادہ تر لاپرواہی بنے ہوئے تھے۔ اس لیے مجھے ڈرنے کے باوجود آسان تھا مجھے ویسے بھی علم تھا کہ ڈاکوؤں کا سردار ملنگی اور اس کا راز دار ساتھی ہماری مدد ضرور کریں گے اور تمام خطرے سے نمٹ بھی لیں گے اس لیے آگے بڑھتا ہوا سامنے سے اس کمرے کے پاس جا پہنچا۔ صحن میں اس وقت کوئی نظر نہیں آرہا تھا پتا نہیں وہ سب کہاں چلے گئے تھے حالانکہ تھوڑی دیر پہلے تو سب یہیں تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور فوراً ہی اندر چلا گیا۔
اس کمرے میں بھی ایک بلب جل رہا تھا اور ایک کونے میں سونیا گٹھڑی سی بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ سردار ملنگی نے مجھے بتایا تھا کہ عورتوں پر ظلم یا تشدد کرنا ان کے اصولوں کے خلاف ہے جو بھی ایسا کرتا ہے اس کو کڑی سزا دی جاتی ہے۔ سونیا مجھے نہیں جانتی تھی۔ اس لیے مجھے دیکھ کر فوراً ہی گھبرا گئی۔ میں نے دیکھا تو وہ رسیوں سے جکڑی ہوئی تھی میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی تمام رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ رسیاں کھول کر اسے اٹھنے میں سہارا دیا اور کہا۔ ''گھبراؤ مت یہاں سے نکلنا ہے۔'' لیکن اس سے چلا نہیں جا رہا تھا یہاں رسیوں سے جکڑنے کی وجہ سے خون بھی رک گیا تھا۔ لہٰذا خون رواں کرنے کے لیے مجھے اس کو سہارا دے کر تھوڑا بہت کمرے کے اندر ہی واک کروانا شروع کر دی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا اسے زیادہ سے زیادہ خون کی گردش تیز کرواتا اس لیے فوراً ہی اسے لے کر باہر آیا اور جدھر سے ریسٹ ہاؤس کے اندر داخل ہوا تھا۔ ادھر چل پڑا ابھی میں باہر کی دیوار کے پاس ہی پہنچا تھا کہ ایک آدمی نے پیچھے سے آواز دی۔ ''اوئے تو کون ایں تے اینوں کتھے لے کے چلیاں ایں۔'' میں فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوا وہ خالی ہاتھ تھا ابھی میں نے ہاتھ سے ریوالور سیدھا اس کی جانب کیا ہی تھا وہ فوراً ہی زمین پر گر گیا میں نے اس پر فائر کر دیا جو اس کی گردن پر جا لگا تھا حالانکہ میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا تھا اسلحہ چلانے کے بارے میں میرا زیادہ تجربہ نہیں تھا نہ ہی میں نے سیکھنے کی کوشش کی تھی بس چچا حشمت اور عظمت کے ساتھ جب جنگلوں میں جاتا تھا اس وقت شکار بہت شوق سے کرتا بس وہی میرا نشانہ تھا لیکن اس وقت مقابلہ جانوروں سے نہیں بلکہ زندہ انسانی درندوں سے تھا۔ میرا نشانہ چوک جانا فطرتی تھا۔
اس وقت مجھے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ ''نکلو جلدی۔'' یہ آواز سردار ملنگی کی تھی جو نہ جانے کس وقت کہاں سے آ گیا تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ میں مرنے والے آدمی کی آواز جو اس نے تمہیں دی تھی سن کر آیا ہوں یہ چوہدری کا آدمی تھا۔ میں فوراً ہی سونیا کو دیوار پار کروائی پھر خود دیوار کی دوسری جانب جنگل میں کود گیا۔

☆......☆

ریسٹ ہاؤس کے اندر یہ میرا پہلا قتل تھا۔ زندگی

میں کسی انسان کو پہلی بار قتل کیا تھا۔ جنگلوں کے اندر کے راستوں کا میں بخوبی آگاہ تھا اس لیے سونیا کو لے کر جنگل کے اندر ہی اندر دوڑ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک گن کے برسٹ کی آواز آئی جو ہمارے اردگرد کے درختوں پر لگے تھے۔ اب یہ دیکھنے کا وقت نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے ڈاکو ہیں یا چوہدری کرم دین کے آدمی۔ بھاگتے ہوئے سونیا تھک کر ایک جگہ گر گئی تھی اور یہ بھی ایک طرح اچھا ہی ہوا تھا کہ ایک سنگل رائفل کا فائر بالکل اس کے سر پر کیا گیا تھا جس کی وجہ سے میں نے محسوس کرلیا تھا کہ ضرور چوہدری کرم دین کے ہی آدمی ہوں گے کیونکہ ڈاکو صرف ہمیں زندہ پکڑتے۔ وہ کسی عورت پر گولی نہیں چلاتے تھے۔ جب سونیا گری تھی تو میں نے بھی ایک درخت کی طرف بڑھنا شروع کردیا اور ہم دونوں ہی اسی درخت کے اوپر چڑھ گئے تھے۔ ہمارے پاس صرف ایک ریوالور تھا جس سے میں نے صرف ایک فائر ہی کیا تھا جو آدمی کے گردن پر لگنے سے اسے ہلاک کر گیا تھا۔ قسمت کی ستم ظریفی تھی یا یہ اتفاق تھا آج سے تقریباً آٹھ سال قبل یہی جنگل تھا اور میں وسیم تھا جو اس میں چھپنے کی کوشش کررہا تھا جب میرے پیچھے چوہدری کرم دین کے کتے اور آدمی تھے اور اب آٹھ سال بعد بھی وہی جنگل تھا اور میں وسیم سے حماد بن کر بھی اسی جنگل میں چوہدری کرم دین کے آدمیوں سے ڈر کر چھپنے کی کوشش کررہا تھا اور اس کی ہی طرح درخت پر چڑھا ہوا تھا اور اب بھی فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت میں تنہا تھا اور اب میرے ساتھ ایک لڑکی تھی جو پہلے کبھی کسی درخت پر پر چڑھی نہیں تھی اور ڈر رہی تھی۔ سردار ملنگی کا آدمی پتا نہیں کہاں رہ گیا تھا اور ہم کہاں نکل آئے تھے۔ مجھ سے کہیں غلطی ہوچکی تھی جس کی وجہ سے دشمن میرے پیچھے پڑ چکے تھے۔ اس جنگل میں ان سے چھپنا ناممکن لگ رہا تھا۔ تمام آدمی جو ہمارے پیچھے آئے تھے اب بکھر کر ہمیں تلاش کررہے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی میرے قریب آیا تو میں نے درخت کے اوپر سے ہی اس پر ریوالور سے فائر کردیا اس کی ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی تھی اور وہ وہیں گر کر تڑپنے لگا تھا۔ دوسروں کو بالکل پتا نہیں چلا تھا کہ ان کا دوسرا آدمی بھی کم ہوگیا ہے۔ اس آدمی کی چیخ کے ساتھ میرے پاس سے بھی ایک چیخ برآمد ہوئی تھی۔ یہ چیخ دراصل سونیا کی تھی جس نے اپنے قریب ہی ایک عدد بڑی چھپکلی دیکھ لی تھی۔ اب میرے سر خون چڑھا ہوا تھا اور بالکل ایک بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ میں اس وقت یہ محسوس کررہا تھا کہ میں خود نہیں بلکہ مجھ سے کوئی اور ہی چیز کروا رہی ہے اور اس چیز کے زیر اثر یہ زندگی کا دوسرا قتل کرچکا تھا۔ میں نے سونیا کی طرف غصے سے دیکھا تو وہ فوراً ہی سہم گئی تھی میں نے آہستہ سے کہا۔ ''تم آدمی مرنے پر چیخی نہیں ہو اور ایک چھپکلی دیکھ کر چیخ رہی ہو عجیب لڑکی ہو۔'' وہ چپ رہی۔ ویسے بھی وہ اب تک خاموش ہی رہی تھی۔ نزدیک دور اب کوئی نظر نہیں آرہا تھا وہ کسی اور طرف نکل چکے تھے میں نے سوچا کہ نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور خود بھی نیچے اتر آیا تھا۔ سونیا لڑکی ہونے کی وجہ سے درخت کے نیچے آئی عجیب سی لگ رہی تھی لیکن اس سے پہلے بھی میں نے کبھی کسی جوان لڑکی کو درخت پر چڑھتے یا اترتے نہیں دیکھا تھا لیکن اپنی زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے جب جان پر بنی ہوئی ہو تو جان بچانے کے لیے انسان کئی عجیب و غریب کام کرجاتا ہے جو عام زندگی میں بھی خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتے۔ سونیا نیچے آئی تو میں اسے لیے پھر ایک جانب بھاگنا شروع کردیا تھوڑی دیر بعد ہی جنگل ختم ہوگیا تھا اور اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ جس پگڈنڈی پر ہم جارہے تھے وہاں اردگرد کے دونوں جانب خربوزے اُگے ہوئے تھے اور ابھی کچھ کچھ یعنی چند ایک خربوزے ہی پکے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ عام طور پر فصل پکنے کے قریب ہو تو اس کے رکھوالے قریب ہی ہوتے ہیں لیکن اس خربوزوں کی فصل کے قریب ہمیں کوئی رکھوالا دکھائی نہ دیا تھا۔ میں نے ناشتا تو صبح سردار ملنگی کے ساتھ کرلیا تھا لیکن سونیا نے رات سے کھانا تو کیا پانی بھی نہیں پیا تھا۔ اب خطرہ کم تھا اس لیے سونیا منہ سے پہلی بار بولی۔ ''سنو مجھے پیاس لگ رہی ہے اور ساتھ بھوک بھی کیا ہم کچھ کھا سکتے ہیں۔''

(جاری ہے)

استانی جی کا عشق



ممتاز احمد

لاری اڈے سے شروع ہونے والی ایک کنڈیکٹر اور استانی کے عشق کی لازوال داستان

کہتے ہیں عشق اندھا ہوتا ہے۔ عشق نہ پوچھے ذات، عشق رنگ و رنگ، نسل، مذہب، امارت، غربت اور ذات پات کی فصیلوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ عشق ایک بہتا دریا ہے اور جب دریا میں طغیانی آتی ہے تو اس کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ مجھے بھی عشق ہوا اور بے انتہا ہوا اور میں نے اپنی ہستی کو مٹا دیا۔ میرا نام تماشا ہے مگر مجھے میرے نک نیم نشو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن شرارتیں کرتے، ہنستے کھیلتے گزرا ساتھ ساتھ سکول جانا بھی رہا۔ ہمارے سکول کی ایک ٹیچر میڈم نازش شروع دن سے ہی مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ بچوں سے بہت پیار کرتیں، شفقت سے پیش آتیں ان کا پڑھانے کا انداز بہت اچھا تھا۔ تو یہی وجہ تھی کہ وہ میرا آئیڈیل تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوا کہ میں بھی استانی بنوں تو اکثر محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ استاد شاگرد کا کھیل کھیلتی۔ اب سچ مچ کی استانی بننے کے لیے پہلے خود پڑھنا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا تو اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے دن رات محنت کرتی۔ خوب پڑھتی اور تعلیمی مراحل کامیابی سے طے کرتی گئی اور بالآخر بی۔ اے، بی ایڈ کی ڈگری حاصل کر لی۔ ٹیچر بننا میرا ایک خواب تھا تو میں نے اپنے خواب کی تعبیر پانے کے لیے محکمہ ایجوکیشن میں جاب کے لیے اپلائی کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ دعائیں بھی مانگتی تو خدا نے میری دعائیں سن لیں اور ایک سال بعد جب مجھے ٹیچر کا اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تو خوشی سے میرے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کیونکہ آج مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔

جیسے ہی مجھے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا فوراً اس کے اگلے دن میں نے جوائن کر لیا اور خوش قسمتی سے گھر کے قریب ہی ایک گرلز مڈل سکول میں میری تعیناتی ہو گئی میں نے شوق، محنت اور لگن سے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ میں ہر ماہ پوری تنخواہ امی کے ہاتھ پر رکھ دیتی جس سے وہ بہت خوش ہوتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا اب میری جاب بھی مستقل ہو گئی تھی اور معقول تنخواہ بھی مل رہی تھی۔ میں نہ تو بہت حسین و جمیل خوبصورت لڑکی تھی اور نہ ہی بدصورت، گندمی رنگ، پرکشش نین نقش، گھنے سیاہ لمبے بال اور درمیانے قد کے ساتھ قبول صورت لڑکی تھی۔ ہاں میری آنکھیں بڑی تھیں اور یہی میری سب سے بڑی خوبصورتی تھی۔

میرا چچازاد کزن ہمایوں اکثر ہمارے گھر آتا جاتا رہتا تھا وہ یونیورسٹی میں ماسٹرز کررہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت گورا چٹا لڑکا تھا اوپر سے خاصا امیر اور دولتمند بھی تھا۔ نت نئے فیشن کا مہنگا لباس پہننا اس کا شوق تھا۔ وہ اپنی کار میں یونیورسٹی جاتا مجھ سے اکثر ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا اور اکثر ذومعنی جملے بھی بول دیتا۔ وہ مجھے نتاشا کی بجائے فلمسٹار نشو کہتا اور چھچھوری حرکتیں کرتا۔ میں اس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ وہ ہر دفعہ مجھے آئی لو یو بھی بولتا مگر میں خاموش رہتی۔ اسے اپنے خوبصورت اور امیر ہونے پر بہت گھمنڈ تھا۔ اس کی یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔

مجھے باوثوق ذرائع سے علم ہوا کہ اس کی بے شمار لڑکیوں سے دوستیاں اور افیئر چل رہے ہیں۔ وہ مجھ سے پارٹ ٹائم عشق لڑانے کے چکر میں تھا۔ بلکہ عشق کیا وہ میرے ساتھ بہت گہرے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا میں اس کے سامنے نہیں جاتی تھی اسے نظر انداز کرتی تھی۔ میری بے حسی اور سرد رویے کو دیکھ کر وہ خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔

☆......☆

میں مڈل کلاس کی بچیوں کو بہت محنت، شوق اور لگن سے پڑھاتی تھی جس کی وجہ سے ہر سال مڈل کا رزلٹ سو فیصد اور شاندار آتا جس پر محکمے نے مجھے بہت سراہا۔ پھر میرا گریڈ بڑھا کر کچھ انتظامی امور کی بنا پر مجھے ایک ہائی سکول میں ٹرانسفر کردیا گیا، جس کا رزلٹ ہر سال بہت خراب آتا تھا۔ اس سکول کی کارکردگی بڑھانے اور اچھے رزلٹ کے لیے مجھے وہاں ٹرانسفر کیا گیا تھا۔ یہ بات تو میرے آرڈر میں تھی مگر وہ ہائی سکول ہمارے شہر سے پچیس کلومیٹر دور ایک بہت بڑے قصبے میں تھا۔ اب میرے لیے پریشانی بن گئی تھی کہ روزانہ وہاں آتا جانا تھا مگر چونکہ مجھے حسب منشا ٹیچر کی جاب ملی تھی دوسرا مجھے ترقی دے کر سکول کے رزلٹ کو اچھا بنانے کے لیے ٹرانسفر کیا گیا تھا تو میں نے خوشی خوشی اللہ کا نام لے کر نئے ہائی سکول میں جوائن کرلیا۔

وہ چونکہ ایک مضافاتی علاقہ تھا تو اس لیے وہاں زیادہ ٹرانسپورٹ نہیں جاتی تھی کچھ مخصوص ٹائم میں چند بسیں وہاں جاتی آتی تھیں۔ سفر تو زیادہ سے زیادہ تیس چالیس منٹ کا تھا مگر چونکہ لوکل روٹ تھا ہر سٹاپ کی سواریاں اس میں سوار



ہوتی تھیں تو گھنٹہ لگ جاتا تھا گو کہ بس اسٹاپ ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا اور بس یہیں سے ہو کر گزرتی تھی مگر بس لاری اڈے سے ہی فل ہو کر نکلتی تھی تو سیٹ نہیں ملتی تھی۔ لاری اڈہ کافی فاصلے پر تھا۔ بس صبح سات بجے لاری اڈے سے چلتی تھی تو مجبوراً مجھے کسی تانگے یا رکشے پر بیٹھ کر پہلے لاری اڈے پہنچنا پڑتا تا کہ سیٹ مل سکے جس کی وجہ سے میرے بہت سارے پیسے خرچ ہو جاتے تھے، خیر میں نے روزانہ آنا جانا شروع کر دیا۔ جس بس کے ذریعے میں جاتی تھی وہ ایک اچھی حالت کے ساتھ صاف ستھری بس تھی۔

بس میں بہت رش ہوتا تھا۔ ساری سیٹیں فل ہوتیں اور اکثر سواریاں کھڑے ہو کر سفر کرتیں۔ اس بس کا کنڈیکٹر جس کا اصل نام تو بلال تھا مگر اسے بلو کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ ستائیس یا اٹھائیس سال کی عمر کا واجبی سی شکل و صورت اور سانولے رنگ کا لڑکا تھا۔ صرف پانچ جماعتیں پاس تھا اور گزشتہ دس سال سے کنڈیکٹری کر رہا تھا دوسرے کنڈیکٹروں کی طرح وہ بھی تھوڑا اکھڑ مزاج، زبان کا تیز اور ہوشیار بندہ تھا مگر اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ لیڈیز سواریوں کے ساتھ تمیز سے بات کرتا تھا مگر خاص طور پر میرے ساتھ بہت ہی شائستگی، اخلاق اور سلجھے انداز سے بات کرتا۔ مجھے اس روٹ پر جاتے دو ماہ ہو گئے تھے بلو کا نام تو مجھے شروع دن سے معلوم ہو گیا تھا مگر ان دو ماہ میں ہماری تھوڑی بہت شناسائی ہو گئی تھی کیونکہ میں روزانہ جانے والی پکی سواری تھی۔

میری واپسی دوپہر دو بجے ہوتی تھی اور میں بہت خجل خوار ہوتی۔ ہمارا سکول مین روڈ پر واقع تھا اور اس قصبے کا لاری اڈہ سب سے آخر میں بہت دور تھا تو میں اپنے اسکول کے مین گیٹ کے آگے کھڑی ہو جاتی اور جب بس آتی تو سوار ہو جاتی۔ اکثر مجھے سیٹ نہ ملتی تھی تو اکثر کھڑے ہو کر یا ٹول بکس پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑتا۔ بلو کو میرے بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ میں ٹیچر ہوں تو اس ناتے سے وہ میری بہت عزت کرتا تھا۔

ایک دن بلو نے مجھ سے کہا کہ میڈم نشو آپ اپنے اسٹاپ پر کھڑی ہو جایا کریں اور لاری اڈے نہ آیا کریں میں آپ کے لیے سیٹ رکھ کر لے آیا کروں گا۔''

چنانچہ اس طرح سہولت کے ساتھ خاصی بچت ہونے لگ گئی۔ اب وہ بس میں چلتے پھرتے کوئی ایک آدھ بات بھی مجھ سے کر لیتا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا میڈم میری چھوٹی بہن 9th کلاس میں ایڈمشن لینا چاہتی ہے۔ تو وہ کورس اور سبجیکٹ کے سلسلہ میں آپ سے کچھ راہنمائی اور مشورہ کرنا چاہتی ہے تو اگر آپ برا نہ منائیں تو اپنا موبائل نمبر دے دیں۔ وہ شام کو آپ سے کال پر بات کرے گی۔''

میں بلو کی ممنون تھی کہ وہ روزانہ میرے لیے سنگل سیٹ لے کر آتا دوسرا وہ کرائے میں بھی رعایت کرتا تھا تو میں نے تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد اسے اپنا نمبر دے دیا۔

اسی دن شام کو اس کی بہن کی کال آ گئی اس نے میٹرک میں داخلے وغیرہ کے لیے مشورہ لیا اور ضروری باتیں کیں۔ اس کے بعد بلو نے میرا شکریہ ادا کیا یہ اس کا اپنا ذاتی نمبر تھا جو میں نے Save کر لیا۔

☆......☆

کچھ دن گزرے تو مجھے سخت بخار اور فلو نے آن گھیرا۔ میں نے سکول کی پرنسپل سے تین دن کی چھٹی فون پر لے لی تو مجھے خیال آیا کہ بلو میرے لیے سیٹ رکھ کر لاتا ہے تو اسے بھی بتا دوں کہ تین دن کی چھٹی لی ہے تا کہ وہ پریشان نہ ہو چنانچہ میں نے اسے کال کر کے اپنی بیماری کا بتا دیا۔ اگلے تین دن وہ فون پر میری خیریت کا پوچھتا رہا۔ جب میں صحت یاب ہوئی تو پھر سے آنا جانا شروع کر دیا۔

اب مجھے بلو کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی نظر آتی اب شام کو یا دوپہر میں مختلف حیلوں بہانوں سے مجھے کال کرتا حال چال پوچھتا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا آہستہ آہستہ بلو مجھے بھی اچھا لگنے لگا۔ دوران سفر بس میں وہ مجھ سے کوئی بات نہ کرتا انجان بنا رہتا تا کہ کوئی شک نہ کرے مگر جب کال کرتا تو خوب باتیں کرتا۔ اب مجھے بھی اس کی کال کا انتظار رہتا جس دن اس کی کال نہ آتی میں بے چین ہو جاتی۔ اب بلو مجھ سے کرایہ بھی نہیں لیتا تھا۔ بلو نے میری سہولت کے لیے واپس گھر آنے کے لیے یہ بندوبست کیا کہ دو بجے لاری اڈے سے جو بس نکلتی تھی اس کے کنڈیکٹر کو کہہ دیا تھا کہ وہ میرے لیے سیٹ خالی رکھ کر لے آیا کرے تو اس طرح مجھے بہت آسانی ہو گئی۔ گو کہ بلو پڑھا لکھا نہیں تھا مگر ایک تو اس کا کردار صاف ستھرا تھا۔ میرے

ساتھ سلیقے سے اور عزت سے بات کرتا تو اس نے اپنے اچھے اطوار سے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ میں اکثر اپنے کزن ہمایوں کے ساتھ بلو کا موازنہ کرتی تو دونوں کے درمیان مجھے زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا۔

ہمایوں دولتمند اور پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بدتمیز اور گھمنڈی بداخلاق تھا۔ وہ چھچھوری حرکتیں کرتا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا جبکہ اس کے برعکس بلو ان پڑھ اور غریب کنڈیکٹر تھا مگر میرے ساتھ تمیز اور عزت سے بات کرتا۔ کبھی کوئی غلط حرکت اور بات نہیں کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ میں اسے پسند کرنے لگ گئی۔

ایک دن کال پر اس نے بھی ڈرتے ڈرتے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ ہماری یہ پسندیدگی بہت جلد پیار میں بدل گئی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ پیار چاہت میں اور چاہت عشق میں بدل گئی۔ بلو میرا پیار پا کر بہت خوش ہوا وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ٹیچر اس سے پیار کرتی ہے۔ اس نے کبھی مجھے چھوا تک نہیں تھا اسے ہر حال میں میری عزت پیاری تھی۔ اسکول میں ہم سب ٹیچرز نے کمیٹی ڈالی ہوئی تھی جس کی مالیت ساٹھ ہزار روپے تھے۔ تنخواہ ملنے پر میں کمیٹی اکٹھی کرتی۔ ہم نے پہلے دن سے ہی پرچیاں ڈال کر ترتیب بنائی تھی کہ کون سی کمیٹی کس کو ملے گی۔ اس ماہ جس ٹیچر کو کمیٹی ملنی تھی اس کی ایک ہفتے بعد شادی تھی تو اسے ہر حال میں اسکی شادی سے پہلے پہلے کمیٹی ادا کرنی تھی۔ جب ساری کمیٹیاں اکٹھی ہو گئیں اور اگلے دن اس ٹیچر کو پے منٹ کرنی تھی تو ہوا یوں کہ ہمارے گھر چوری ہو گئی کمیٹی کے پیسے بھی چور لے اڑے۔ میں بہت پریشان ہوئی کہ اب کیا بنے گا۔ کسی کو یقین نہیں آئے گا سب باتیں کریں گی کہ میڈم نشو نے ساٹھ ہزار روپے خرد برد کر لیے ہیں۔ اب پیسے چوری ہونے کا ڈرامہ کر رہی ہے۔ اس طرح میری نیک نامی کے ساتھ میری ساکھ بھی خراب ہو جاتی امی ابو بھی بہت پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا۔ کس طرح رقم کا بندوبست ہوگا۔ اسی دوران بلو کی کالز آتی رہیں مگر میں پریشانی کی وجہ سے اس کی کال اٹینڈ نہ کر سکی۔

ابو نے کال کر کے ہمایوں سے ساٹھ ہزار روپے بطور قرض مانگے تو اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ اسی پریشانی کے عالم میں رات ہو گئی ادھر بلو پریشان تھا کہ میں اس کی کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہی۔

رات دس بجے اس کی کال آئی تو میں نے اٹینڈ کر لی اس کے پوچھنے پر ساری بات بتا دی۔ اس نے مجھے حوصلہ اور تسلی دی کہ وہ کل رات تک ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست ہر صورت میں کر دے گا میں پریشان نہ ہوں اور سکون سے سو جاؤں۔''

اگلے دن میں نے سکول میں اس ٹیچر سے جھوٹ بولا کہ تین چار گھروں سے کمیٹیاں نہیں آئیں آج شام تک اکٹھی ہو جائیں گی تو صبح پوری کمیٹی کی رقم لے آؤں گی۔ اسی دن رات کو بلو نے کال پر بتایا کہ اس نے ساٹھ ہزار کا بندوبست کر لیا ہے وہ صبح مجھے بس میں پیسے دے دے گا۔ چنانچہ اگلے روز اس نے حسب وعدہ مجھے ساٹھ ہزار روپے چپکے سے پکڑا دیے۔ اس طرح میری عزت رہ گئی۔ اب بلو میرا محسن تھا میں دل و جان سے اس پر فدا ہو گئی۔ ہمارا عشق دن بدن پروان چڑھنے لگا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں بلا ناغہ سکول جاتی اور صرف بلو کی خاطر جاتی کیونکہ وہ اب میرا محبوب تھا۔ اتوار کو چھٹی ہوتی اور یہ دن مجھ پر بہت بھاری گزرتا کچھ عرصہ کے بعد جب میں نے تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے لوٹانے چاہے تو بلو نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت غریب ہے پتا نہیں اس نے کس طرح ایک دن میں اتنی رقم کا انتظام کیا تھا۔ میں نے بہت اصرار کیا اس کی منتیں بھی کیں کہ اپنے پیسے واپس لے لو مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ نشو یہ رقم تمہاری جوتیوں پر قربان۔ تم میرا عشق ہو میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ میں پوری زندگی تم سے پیسے نہیں لوں گا۔''

پھر اس نے مجھے اپنے پیار کی قسم دی کہ پیسے واپس کرنے تو دور کی بات اب پوری زندگی ان کا ذکر بھی نہیں کرنا۔ مجبوراً مجھے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے۔

بلو کا گھر اسی قصبے میں تھا جہاں میں روزانہ پڑھانے جاتی تھی۔ بلو کا باپ فوت ہو چکا تھا اس کی ایک چھوٹی بہن نصرت جو کہ میٹرک میں پڑھ رہی تھی جس نے فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ نصرت سے چھوٹا جمال تھا جو ساتویں میں پڑھ رہا تھا۔ گھر کا واحد کفیل بلو تھا ان کا چھوٹا سا گھر

تھا۔ میں ایک بار ان کے گھر جا چکی تھی بلو کی بہن نصرت نے بڑے چاؤ اور اصرار سے مجھے بلایا تھا۔ جب میں گئی تو انہوں نے میری بہت عزت اور آؤ بھگت کی۔ اب بلو کا اصرار تھا کہ جلد شادی کر لیں میرا بھی یہی دل تھا چنانچہ میں نے بلو سے کہا کہ اپنی امی کو رشتہ مانگنے ہمارے گھر بھیجو تو اتوار کو اس کی امی اور اس کی بہن میرا رشتہ مانگنے آ گئیں۔

امی ابو کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا کیونکہ میرا اور بلو کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سرکاری ٹیچر اور بلو ایک غریب ان پڑھ بس کنڈیکٹر۔ امی ابو نے انکار تو نہیں کیا مگر سوچنے کے لیے ٹائم لے لیا وہ اس رشتے پر راضی نہیں تھے ان کا موقف اپنی جگہ پر سو فیصد درست تھا مگر میں اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میں نے بھی ضد لگا لی کہ اگر شادی کروں گی تو صرف بلو سے ورنہ کسی سے نہیں کروں گی۔ پورا ایک مہینہ گھر میں یہ کشمکش چلتی رہی آخر کار میری ضد کے آگے امی ابو مجبور ہو گئے اور انہوں نے بادل نخواستہ یہ رشتہ منظور کر لیا۔

انہیں یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ میں چوری چھپے اس سے شادی نہ کر لوں اس طرح بہت بدنامی ہوگی۔ بلو کے عشق کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ہاں اگر امی ابو نہ مانتے تو میں نے واقعی بلو کے ساتھ کورٹ میرج کر لینی تھی۔

میں نے اسی وقت کال کر کے بلو کو خوشخبری سنا دی جسے سن کر وہ بھی خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ الغرض ہماری شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ امی ابو اس رشتے سے ناخوش تھے اور بے دلی سے شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جس نے بھی اس رشتے کے بارے میں سنا حیرت سے منہ میں انگلیاں دبا لیں۔ ہر کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ نشو کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ نشو نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا۔ ہمایوں کو جب اس رشتے کا پتا چلا تو میرا سب سے زیادہ تمسخر اس نے اڑایا اور مجھے لیڈی کنڈیکٹر کا خطاب دیا اور ساتھ یہ بھی کہتا استانی جی تمہیں پیار کرنے کے لیے ایک ان پڑھ گنوار کنڈیکٹر ہی ملا؟''

الغرض اس طرح کی باتیں مجھے سنائی دیتی رہیں اور میں نے کسی کی پروا نہیں کی اور پھر وہ بن آن پہنچا جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔ میں مس نتاشا سے نتاشا بلال بن کر اپنے محبوب اپنے پیا کے دیس سدھار گئی۔ میں دلہن بنی بہت پیاری اور خوبصورت لگ رہی تھی کیونکہ مجھ پر بہت روپ چڑھا تھا سب بلال کی قسمت پر رشک کر رہے تھے جسے انتہائی خوبصورت پڑھی لکھی سرکاری ٹیچر مل گئی تھی۔

آج ہماری شادی کی پہلی رات تھی ہم دونوں خوشی سے نہال تھے کہ ہم نے ایک دوسرے کو پالیا تھا۔ بلال نے مجھے چھوٹا سا سونے کا لاکٹ پہلی رات تحفے میں دیا جبکہ میں نے اسے قیمتی راڈو گھڑی اور چاندی کی انگوٹھی جس پر چھوٹا سا NB (نتاشا بلال) کندہ کروایا تھا۔ تحفے میں دیں۔

☆......☆

مجھے بلال کے گھر اور خاندان میں بہت عزت اور پذیرائی ملی۔ بلال کی بہن نصرت اور چھوٹا بھائی جمال مجھے بھابی کی بجائے باجی کہتے۔ بلال کی امی یعنی میری ساس میرا بہت خیال رکھتیں بیٹی بیٹی کہتے ان کی زبان نہ تھکتی۔ شادی کے بعد ہم نے لاہور اسلام آباد کی سیر کی۔ میری چھٹیاں ختم ہو گئیں تو میں نے ڈیوٹی کے لیے سکول جانا شروع کر دیا۔ میرا روزانہ کا بس سفر ختم ہو چکا تھا۔ بلال نے مجھے رکشہ لگوا دیا تھا جو صبح مجھے سکول چھوڑ دیتا اور دوپہر کو واپس گھر پہنچا دیتا۔

بھلے بلال ایک سادہ غریب اور ان پڑھ بس کنڈیکٹر تھا مگر حقیقت میں وہ بہت اچھا اور پیار کرنے والا انسان تھا۔ وہ میری ہر بات اچھے بچوں کی طرح مانتا مجھے نہیں یاد اس نے کبھی میری کوئی بات رد کی ہو۔ بلال میں ایک خرابی تھی وہ یہ کہ وہ نسوار کھاتا اور سگریٹ پیتا تھا۔ اس کی یہ عادتیں مجھے بہت ناگوار گزرتی تھیں میں بیڈ پر بیٹھی ہوتی تو اکثر بلال میری گود میں اپنا سر رکھ کر میری طرف دیکھتا رہتا اور میں اس کی طرف دیکھتی رہتی۔

آج بھی ہم ایک دوسرے کو اسی طرح پیار سے دیکھ رہے تھے تو میں نے بلال کو مخاطب کیا تو وہ بڑے مودبانہ انداز سے بولا۔

''جی ملکہ عالیہ حکم! غلام حاضر ہے۔'' تو میں نے بڑے پیار سے کہا۔

''بلو جانی نسوار کھانا اور سگریٹ پینا چھوڑ دو۔''

''میری جند جان میری رانی میری ملکہ عالیہ! میری کیا مجال جو حکم سے سرتابی کر لو آج سے دونوں کا کھانا پینا بند۔'' اور پھر واقعی اس نے دونوں چھوڑ دیں۔

"بلو مجھ سے ایک پائی نہیں لیتا تھا میں اپنی پوری تنخواہ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھتی مگر وہ کہتا نشو جانی یہ تمہاری کمائی ہے اس پر صرف تمہارا حق ہے۔" تو میں کہتی۔

"بلو جی میں تمہاری ہوں اور میرا سب کچھ تمہارا ہے۔" "تو یہ تنخواہ بھی تمہاری ہے مگر وہ نہ لیتا اسی طرح ہر ماہ ہماری تکرار ہوتی تو مجھے ہار ماننا پڑتی۔

بلو کی امی نے مجھے سگی ماں کی طرح پیار کیا۔ نصرت اور جمال مجھے اپنی بھابی کی بجائے سگی بڑی بہن سمجھتے۔ سچ پوچھیے تو گھر جنت کا نمونہ تھا۔ ہر طرف پیار، محبت، عزت اور احترام تھا۔ گھر بہت پرانا خستہ حال تھا تو میں میں نے اپنی تنخواہ سے پیسے جوڑ کر گھر کو از سر نو تعمیر کروایا۔ رنگ روغن کروایا تو اس موقع پر میں نے بلو کی ایک نہ سنی اور اسکے منع کرنے کے باوجود گھر کا کام کروایا۔

☆......☆

آنے والے بارہ سالوں میں اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازا تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہوئے۔ بلو نے میرے کہنے پر پانچ وقت کی نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ رمضان المبارک کے پورے روزے رکھتا قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ اس کے مزاج سے اکھڑ پن بھی ختم ہو گیا اور یہ سب عشق کی طاقت سے ہوا۔ عشق واقعی بہت بڑی طاقت ہے۔

ہماری زندگی میں پیار کے ساتھ ساتھ بہت سکون تھا زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی مگر بلو میں ایک بہت بڑا احساس محرومی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ یہ کہ وہ چاہتا تھا اس کی اپنی ایک بس ہو اور وہ خود بس چلایا کرے۔ اب ظاہر ہے اپنی بس خریدنے کے لیے لاکھوں روپے چاہیے تھے جو کہ سر دست ہمارے پاس نہیں تھے۔ بلو اسی سوچ میں اکثر اداس رہنے لگا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ ایسا کرتے ہیں کمیٹیاں ڈال کر کچھ رقم جمع کر لیتے ہیں تو اس سے تم ایک سیکنڈ ہینڈ ویگن خرید لو اور خود چلانی شروع کر دو۔

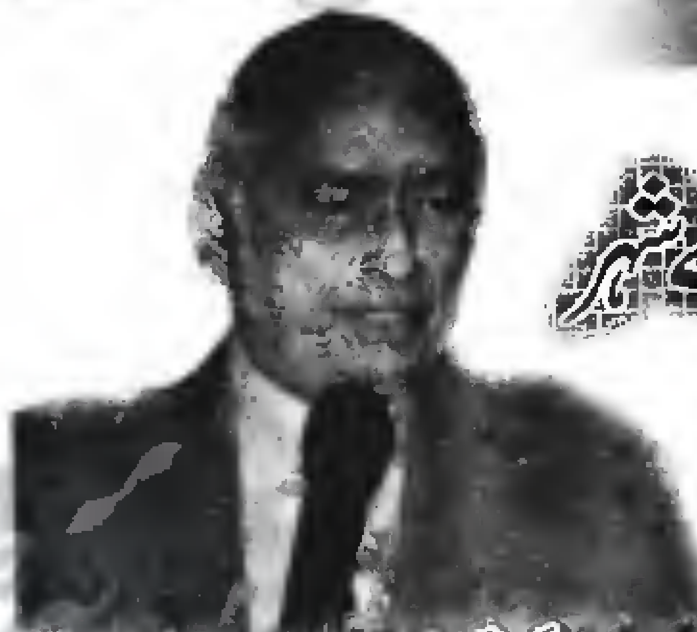
پہلے تو وہ نہیں مانا جب میں نے اپنی قسم دی تو مان گیا۔ میں نے اپنی پوری تنخواہ کی کمیٹی ڈال لی تو اس طرح پانچ لاکھ روپے جمع ہو گئے۔ ایک بہت اچھی حالت کی ویگن آٹھ لاکھ روپے میں مل گئی۔ باقی کی رقم کی ماہوار قسطیں مقرر ہو گئیں تو بلو نے اللہ کا نام لیکر خود ویگن چلانی شروع کر دی جس کی وجہ سے آمدنی بہت بڑھ گئی۔ بلو قسط کی رقم ادا کر کے باقی سارے پیسے میرے ہاتھ پر رکھ دیتا جنہیں میں کفایت شعاری سے خرچ کرتی اگلے دو سالوں میں ویگن کی ساری قسطیں ادا ہو گئیں۔ اب پروگرام یہ بنا کہ پھر کمیٹیاں ڈالی جائیں اور مزید رقم جمع کی جائے اور ویگن بیچ کر بلو بس خرید لے چنانچہ اس مقصد کے لیے مشترکہ کمیٹیاں ڈال دی گئیں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا ایک دن بلو نے لاری اڈے میں سروس کروانے کے لیے ویگن سروس اسٹیشن پر کھڑی کی اور ویگن کے کچھ پارٹس خریدنے اسپیئر پارٹس کی دکان کی طرف جا رہا تھا تو سڑک کراس کرتے ہوئے ایک تیز رفتار بس کے نیچے آ گیا اور موقع پر ہی دم توڑ دیا۔

جب بلو کی لاش گھر آئی تو مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ مجھے اپنا کچھ ہوش نہ رہا میں صدمے سے پاگل ہو گئی۔ میرے عزیز از جان، میرے عشق میرے مجازی خدا کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ مجھے سنبھلنے میں پورا ایک سال لگ گیا۔ میں جب بیوہ ہوئی اس وقت میری عمر اڑتیس سال تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنے پانچ بچوں کی خاطر جو میرے اور بلو کے پیار کی نشانیاں ہیں۔ بلو کی امی کا انتقال ہو چکا ہے۔ نصرت کی شادی کر دی۔ جمال کو جب یہاں روزگار نہ ملا تو بیرون ملک کمانے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ویگن کے لیے ڈرائیور رکھ لیا جو بڑی تندھی اور ایمانداری سے ویگن چلاتا ہے اور ایک معقول رقم ہر ماہ مجھے دیتا ہے۔ میں دل و جان سے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں۔ انہیں ماں اور باپ کا پیار دیتی ہوں اور کسی چیز کی کمی نہیں آنے دیتی۔ ہاں مگر میری زندگی میں بہت بڑا خلا اور کمی ہے تو وہ صرف بلو کی ہے۔

میری راتیں سونی ہو گئی ہیں راتوں کی تنہائی ڈستی ہے مگر مجھے اپنے ارد گرد بلو کے موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے وہ میرے پاس ہے۔ میں خیالوں میں اس سے ڈھیروں باتیں کرتی ہوں۔ مجھے ایسے باتیں کرتے دیکھ کر بچے زیر لب بڑبڑاتے رہتے ہیں مگر انہیں کیا معلوم میں تو اپنے بلو سے باتیں کرتی ہوں۔ یہ بلو کا عشق ہی تو ہے جس نے مجھے اب تک زندہ رکھا ہوا ہے۔

☆☆☆

سفرنامہ



برف کے شہر

قمر علی عباسی

پاکستان کی برف پوش وادیوں کا سفر۔ ایک منفرد سفرنامہ۔ قمر علی عباسی کے قلم کا جادو

دوسرا حصہ

جہاں گلاب اُگتے تھے

ہم مانیں نہ مانیں زمین کے ماہرین کہتے ہیں ایک زمانے میں یہ پوری کی پوری برف تھی۔ اسے ''آئس ایج'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ برف پگھلنے لگی اور اب صرف دس فیصد زمین پر برف موجود ہے جو گلیشیر کہلاتی ہے۔ دراصل یہ برف کے پہاڑ کا نام ہے اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک بالکل خشک ہے۔ یہ پگھلتا نہیں ٹوٹ جاتا ہے، دوسری قسم کا گلیشیر پگھلتا ہے اور دوبارہ جم جاتا ہے، تیسرا گلیشیر وہ ہے جو نیچے سے سرکتا ہے اور آگے بڑھ جاتا ہے، چوتھی قسم کا پگھلتا رہتا ہے۔ گلیشیر زیادہ تر انٹارکٹیکا اور گرین لینڈ میں پائے جاتے ہیں۔

بلتستان میں اسکردو کے اوپر سب سے بڑا گلیشیر سیاچن ہے یہ قراقرم پہاڑوں کے درمیان ہے اور ستر کلومیٹر لمبا ہے۔ یہ 18,875 فٹ بلند ہے کیوں کہ یہ پگھلتا بھی ہے اس سے ہمیں بہت فائدہ ہے۔ دریائے سندھ جب مانسرور جھیل سے نکلتا ہے تو ایک پتلی سی لکیر ہوتا ہے جسے سیاچن گلیشیر پانی دیتا ہے اور اسی میں دریائے شیوخ آکر ملتا ہے۔

ہم گلگت سے ہنزہ کی طرف جارہے تھے تو ایک گاؤں دیکھا جس میں اوپر سے نیچے تک برف آیا ہوا تھا ہم نے ایک مقامی شخص سے پوچھا۔

''یہ تو بہت خطرناک ہے، برف کبھی بھی سرک کر گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''صاحب یہ گلیشیر ہے۔ ہم نے کہا برف والا وہ بولا جی برف تو ہے لیکن یہ ''مرد'' ہے اور پگھلتا نہیں۔ جب ہمیں پانی کی ضرورت ہوتی تو اس کے ایک حصے پر برف ڈال دیتے ہیں تو یہ پگھل جاتا ہے۔''

ہم نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا برف مونث ہے؟''

کہنے لگا۔ ''جی۔''

مرد بظاہر ایک سے نظر آتے ہیں لیکن مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ اول وہ جو

حسن و نزاکت زیبائی اور دلکشی کے سامنے ایک لمحے کو نہیں ٹھہر سکتے، پگھل جاتے ہیں۔ یہ دنیا بھر میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر کا مزاج شاعرانہ ہوتا ہے۔ ادھر کوئی پری رو، ماہ رخ، چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں دیکھیں اور سب کچھ ہار دیا بعض تو زلف پریشاں گہری جھیل جیسی آنکھوں اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر جان دینے لگتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو وقت کے ساتھ اپنا معیار حسن بدلتے رہتے ہیں، کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ دل قربان کرتے ہیں، تیسرے وہ ہیں جو حسن کی تمازت سے پگھلتے ہیں اور پھر دوبارہ آپے میں آجاتے ہیں۔

مردوں کی ایک ایک اور قسم وہ ہے جو نہ پگھلتی ہے نہ متاثر ہوتی ہے نہ اپنی توجہ لمحہ بھر کو اس طرف کرتی ہے۔ یہ لوگ خشک اور ٹوٹنے والے ہوتے ہیں۔

تاریخ میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو مزاج اور حرکات و سکنات میں ہلاکو خان، چنگیز خان اور تولائی خان سے مماثلت رکھتے ہیں۔ گو کہ وہ کم ہیں۔

گلیشیئر بھی پہاڑی علاقوں میں مرد کہلائے جاتے ہیں ان کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔

سیاچن گلیشیئر غالباً اس طرح کا ہے جو جمے بھی رہتے ہیں اور پگھلتے بھی رہتے ہیں۔ اسکردو سے 150 کلو میٹر دور ایک گاؤں خپلو ہے دریائے شیوخ یہاں بہتا ہے۔ اسے عبور کریں تو گاؤں کے بعد سیاچن شروع ہو جاتا ہے ایک حد کے بعد یہ ڈیفنس کے زیر نگرانی علاقہ ہے۔

سیاچن بلتی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے گلاب کے پھولوں کی سرزمین۔ 1907ء میں برطانوی ڈاکٹر ٹام جارج لانگ اسٹف نے اسے سر کیا۔ وہ جس وادی سے اوپر گیا وہاں ہر طرف گلاب کے پھول کھلے تھے لہٰذا اس نے اس کو ''گلابوں کی زمین'' کہا اور اس کا یہی نام پڑ گیا۔

آج کل یہ انسانی خون کے دھبوں کی زمین ہے جو بظاہر ایک بڑا گلیشیئر ہے جہاں ہر موسم سرما میں پینتیس سے پچاس انچ برف گرتی ہے۔ 1984 میں اچانک ہندوستان نے اس پر اپنے فوجی اتار دیے اور قبضہ کر لیا، پاکستان کو بھی اپنی فوجیں انہیں روکنے کے لیے بھیجنی پڑیں اور ان دونوں کے درمیان ایک لائن آف کنٹرول بن گئی۔ یہاں انتہائی شدید سردی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان اور پاکستان کے بے شمار فوجی مر چکے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں کو یہاں اپنی فوجیں رکھنے کے لیے بہت زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں ان دونوں ملکوں کے درمیان اکثر فائرنگ کا تبادلہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے سیاچن کے تودے کمزور ہو کر گرتے ہیں۔ ہندوستان نے جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے فوجیوں کے لیے سڑک بنائی ہے جس کی وجہ سے کیمیکل بلاسٹ کیے جن کی وجہ سے سیاچن کو نقصان پہنچا ہے۔ ایک مٹی کے تیل کی لائن 250 اسکوائر فٹ میں بچھائی گئی یوں بھی دونوں ملکوں کے فوجی جو کچھ ضائع کرتے ہیں وہ برف میں دبا دیا جاتا ہے جس سے گلیشیئر کو نقصان ہو رہا ہے اس کی فضا آلودہ ہوتی جاتی ہے۔ سیاچن سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اسکردو کے لوگ اسے روز دیکھتے ہیں۔ یہ دنیا کا بلند ترین میدان جنگ ہے ہمیں یہ بالکل پسند نہیں آیا۔ جہاں انسانی جانیں ضائع ہوتی ہوں، جہاں نفرت کی لکیر بنی ہو جہاں دشمن آمنے سامنے ہوں وہ جگہ کون پسند کرے گا اس لیے ہم نے اس راستے کی طرف دیکھا ضرور لیکن جانے کا تصور نہیں کیا کیوں کہ ہم وہ زمین دیکھنا چاہتے تھے جہاں گلاب اگتے تھے۔

اسکردو کا جن

ہم نے اسکردو میں ایک جن دیکھا جس کے لیے نہ چراغ رگڑنے کی ضرورت تھی نہ انگوٹھی کو گھسنا ہوتا تھا۔ یہ جن ریڈیو پاکستان میں تھا اور پہلے ہی دن اس سے ملاقات ہوئی۔ اس جن کا نام تھا غلام عباس۔ جو کہو جس بات کی فرمائش کرو چٹکی بجانے سے کم دیر میں پوری ہوتی تھی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

جب تک محکموں میں اس قسم کے ''جن'' موجود ہوں گے وہاں کام ہوتا رہے گا۔ جب اسکردو میں ریڈیو پاکستان قائم ہوا تو غلام عباس کو پروڈیوسر کی حیثیت سے بھیج گیا۔ یہ پہلے پروڈیوسر تھے اور ان کی آواز سے اسکردو کی نشریات کا آغاز ہوا۔ خوشی کی بات ہے کہ پہلا اعلان اردو میں کیا گیا۔ اس زمانے میں یہ اناؤنسمنٹ کرتے، خبریں پڑھتے، پروگرام پیش کرتے غرض یہ اس وقت سے ''جن'' تھے۔

غلام عباس اسکردو سے 150 میل دور ایک گاؤں ''پھوار'' میں پیدا ہوئے اسی لیے ان پر طاقت، ہمت، چستی کی پھوار برستی رہتی ہے۔ ''پھوار'' سے پانچ کلومیٹر دور ایک گاؤں ہے سکھ بنا، غلام عباس یہاں ہر روز صبح پیدل جاتے، پرائمری کی تعلیم حاصل کرتے اور پانچ کلومیٹر پیدل چل کر واپس گھر آجاتے۔

پرائمری کے بعد یہ مڈل اسکول کی تعلیم کے لیے چھنو وقصبہ چلے گئے۔ اس کے بعد ہائی اسکول پڑھنے اسکردو آئے اور اس کے بعد گورڈن کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا وہاں سے 1971ء میں بی اے کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں پروڈیوسر ہو گئے۔

غلام عباس نے ترقی کا زینہ چڑھنا شروع کیا، تعلیم وتربیت کے سلسلے میں لندن بھی گئے اور ریڈیو اکیڈمی سے کئی تربیتی کورس مکمل کیے اور پھر ریڈیو پاکستان کے ایک بڑے عہدے ''کنٹرولر'' سے سبکدوش ہوئے۔

غلام عباس پھوار ہیں، سکھ ہیں، چھلو ہیں۔ اسکردو میں انہیں پہاڑوں، وادیوں اور موسم بہار میں رنگوں سے بھرے پھولوں سے محبت ہے۔ وہ برف کے شہر میں رہتے ہیں لیکن ان میں محبت کی زندگی اور خلوص کی آگ روشن ہے۔ ہم نے انہیں شہر کے لوگوں میں بے حد مقبول پایا، وہ جہاں جاتے جس طرف سے گزرتے لوگ محبت سے سلام کرتے کیوں کہ انہوں نے بلتستان کی ثقافت، روایت اور زبان کی خدمت کی ہے۔

بلتی زبان کو ہر وادی کے درخت اور پہاڑ کی چوٹی تک پہنچایا ہے۔ ان کی آواز نے سردیوں کی شاموں میں انگیٹھی کے پاس بیٹھے قہوہ پیتے لوگوں کو توانائی دی ہے اور موسم بہار میں پھوار سے چھلو تک جانے والے طالب علموں کو نئی ہمت دی ہے۔

غلام عباس کو اس بات کا افسوس تھا کہ ہم اسکردو اس وقت آئے ہیں جب وہ ایک گلیشیر بنا ہوا ہے ان کی خواہش تھی وہ وہاں کی ہر جگہ دکھا دیں۔ ہر شخص سے ملوا دیں، ہر سوغات دے دیں اور بس چلے تو اسکردو میں روک لیں۔

ہم ریڈیو پاکستان خضدار میں تھے جس کی عمارت گورنمنٹ کے علاقے میں واقع تھی۔ اکثر شہر جانا ہوتا تھا جو زیادہ دور نہیں تھا وہاں ایک چوراہا تھا۔ درمیان میں چوک بنا تھا۔ ہمیں بتایا گیا اسے ''پاگل چوک'' کہتے ہیں ہم نے خیال کیا شاید کسی زمانے میں یہاں پاگل جمع ہوتے ہوں یا پھر یہاں پاگل خانہ ہوگا لیکن احباب نے بتایا اسے پاگل چوک اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں آکر کچھ نہیں ملتا سوائے اس کے کہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر گھومتے رہو۔

غلام عباس جس علاقے میں رہتے ہیں اس کے آگے ''پریشان چوک'' ہے۔ ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یہ کس کی پریشانی سے چوک بنا؟''

غلام عباس ہنسنے لگے اور بتایا۔ ''یہاں بجلی کا دفتر ہے جہاں لوگ بجلی نہ آنے کی شکایتیں، بل زیادہ ہونے کی درخواستیں اور نئے گھروں میں بجلی کے کنکشن کے لیے آتے ہیں اور صرف پریشان ہوتے ہیں اس لیے چوک کا نام ہی پریشان رکھ دیا تاکہ لوگوں کو پہلے ہی اس بات کا اندازہ ہو کہ وہ اس علاقے میں صرف پریشان ہونے آرہے ہیں جو چوک سے شروع ہو جائے گا۔''

''پریشان چوک'' نام کی نسبت غلام عباس نے بغیر کسی پریشانی کے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دی۔ ایسے لوگ جب تک کسی برف کے شہر میں پائے جائیں گے لوگ ٹھٹھرتے جمتے اور برف بنتے ماحول میں بھی گرم جوش اور زندگی کی لطافتوں سے بھرپور رہیں گے۔

ماضی میں انسان کی سب سے بڑی دریافت گھوڑا تھی اور اگر گھوڑا ہنہنانے کے علاوہ بول سکتا تو وہ بھی یہی کہتا میری سب سے زیادہ قدر و منزلت انسان نے کی۔ یہ دونوں جب ملے تو دنیا کی تاریخ لکھی گئی اور جغرافیہ بنایا گیا۔ اگر گھوڑے کی پیٹھ نہ ہوتی تو آج دنیا نہ جانے کتنی چیزوں سے محروم رہتی۔

مسلمان جب تک گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے رہے ان کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ ہی نہیں اقتدار بھی رہا اور جیسے ہی اس کی پشت سے اترے دوسری قوموں نے ان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

دروغ برگردن راوی ہلاکو خان کا ایک پوتا تموچن بارہ سال تک گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ اس زمانے میں یہ بات سب مانتے ہوں گے۔ ہر ایک کو اپنا سر کاندھوں پر عزیز ہے۔ آج کھلے عام کہہ سکتے ہیں بھلا بارہ سال تک گھوڑے کی پشت پر کیسے بیٹھا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ بات درست ہے۔ سکندر اعظم نے دنیا کا بڑا حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر فتح کر لیا تھا اور جب اس کا گھوڑا ''بیوسی بھیلا'' ہندوستان کے راجہ پورس کا مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا تو سکندر اعظم کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس نے دریائے جہلم کے کنارے اپنے گھوڑے کے نام پر ایک شہر بسایا جو صوبہ پنجاب میں شہر مونگ کے برابر ہے۔ ایک اور شہر بھی دریائے جہلم کے دوسری طرف ہے یہ سب تو ہوا یہ بھی سنا گیا ہے کہ سکندر اعظم کی موت کے جو اسباب ہیں اس میں گھوڑے کے مرنے کا غم بھی شامل ہے۔

لوگ کہتے ہیں ہندوستان امن پسند ملک ہے اس نے کبھی کسی دوسرے کی سرزمین پر حملہ نہیں کیا اس کی صرف ایک وجہ ہے کیونکہ ہندو راجوں مہاراجوں کے پاس گھوڑے نہیں ہاتھی ہوتے تھے وہ بھی ''پورس'' کے۔

افغانستان سے جب مسلمان ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ گھوڑے لائے اور وہ سب اپنے مالک کے وفادار تھے۔ یوں بھی دوسروں پر حملہ کرنے کے لیے بہت کچھ درکار ہوتا ہے جو ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے پاس نہیں تھا۔

گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر بے شمار جنگیں لڑی گئیں پھر پانچویں صدی قبل مسیح میں ایران میں امن کے دوران گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر ایک کھیل شروع کیا گیا جس میں دو مخالف ٹیمیں زمین پر پڑی بال سے گول کرتی تھیں۔ یہ ''چوگان'' کہلاتا تھا اسے اس زمانے میں ''بادشاہ کا کھیل'' کہا جاتا تھا کیوں کہ جب بادشاہ کسی کھیل میں حصہ لے گا تو دوسرے کھلاڑی ہمیشہ ہارنے کی کوشش کریں گے، وجہ؟ اپنی جان سے ہارنا نہیں تھا۔ جنگ ہوتی تو گھوڑے کی پیٹھ لوگوں کو مارنے کے کام آتی اور جب امن کا زمانہ ہوتا تو گھوڑے پر بیٹھ کر لکڑی سے بال مارنے کا کھیل ہوتا۔ مغل ہندوستان آئے تو گھوڑے پر بیٹھ کر آئے اور جب یہاں کھانے پینے، اوڑھنے پہننے اور سونے سلانے کا مناسب بندوبست ہو گیا تو گھوڑے کی پشت گھاس کے میدان میں چوگان کھیلنے کے کام آئی۔

قطب الدین ایبک باکمال بادشاہ تھا۔ اس نے قطب مینار بنایا ہے ایک زمانے میں ناکام لوگ اس پر سے کود کر جان دے دیتے تھے۔ قطب الدین ایبک چوگان کھیل رہا تھا۔ نا جانے کیا ہوا کہ گھوڑے نے اسے پشت سے گرا دیا اور وہ مر گیا۔ یہ بات جلال الدین اکبر تک پہنچی اور اس نے چوگان بازی کو اپنے وزراء امرا کے لیے ضروری قرار دیا لیکن تاریخ میں کسی کے گھوڑے سے گر کر فوت ہونے کی اطلاع نہیں ملی۔ بے چارے چوگان بازی کے خوف سے ہی بادشاہ کے خلاف کوئی سازباز نہ کرتے ہوں گے اسی لیے اکبر بادشاہ مہابلی کہلائے اور پچاس سال تک ہاتھ میں گلاب کا پھول لیے تخت پر بیٹھے مسکراتے رہے۔

دور کے اس دور میں بھی مشینوں کی طاقت کو ہارس پاور سے ناپا جاتا ہے سنا ہے چنے کو

ہارس پاور کہا جاتا ہے معلوم نہیں یہ فوجیوں کے کھانے میں کیوں شامل کیا جاتا ہے آگے بڑھنے کے لیے یا......!

ایران سے جب چوگان بازی ہندوستان آئی اور پھر عباسیوں کے دور میں مشرق وسطی پہنچی تو یہ پولو کہلائی۔

ہم جب اسکردو پہنچے تو محمد امین نے بتایا کہ پولو بلتی زبان کا لفظ ہے۔ تبت اور اس علاقے کی زبان میں گیند کو پولو کہتے ہیں اور اس علاقے والوں کا دعویٰ ہے کہ پولو ہمارا لفظ ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تبت میں بھی پولو نہیں کھیلا گیا۔ 1869ء میں انگریزوں نے پہلی بار اسکردو میں دیکھا اور ابھی تک دیکھ رہے ہیں لیکن اپنے ملک میں۔

ہمیں بتایا گیا کہ علی شیر خاں انچن نے سب سے پہلے باقاعدہ پولو گراؤنڈ بنوایا تھا حالانکہ یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ پولو کے لیے تین سو گز لمبا اور ایک سو ساٹھ گز چوڑا میدان درکار ہوتا ہے اور چھ یا آٹھ گھوڑے آٹھ لمبی لکڑیاں انگریزی کے حرف "T" کی شکل کی اور ایک بال اور گھوڑے پر بیٹھے آٹھ آدمی۔ بس پولو کھیلنے کے لیے تیار۔ حیرت یہ ہے کہ گھوڑے کے لیے تو بڑی شرائط ہیں اس کا وزن نو سو سے گیارہ سو پونڈ ہو، اس کی باقاعدہ ٹریننگ کی جائے اس کے قد کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ سوار کے لیے بس ''شوق'' کا ہونا کافی ہے۔

ہم نے یہ کھیل دیکھا اور اندازہ ہوا کہ یہ سارا منڈوا صرف گھوڑے کو بے حال کرنے کے لیے ہے۔ جتنا وہ غریب تین سو گز کے علاقے میں دوڑتا ہوا چکر لگاتا ہے اگر وہ سیدھا دوڑے تو جانے کہاں پہنچ جائے، گھڑ سوار سے زیادہ وہ ہلکان ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بال کے پیچھے اسے بھاگنا، اچانک رکنا، مڑنا، بھاگنا، پھر مڑنا بھاگنا بس یہی ہوتا رہتا ہے۔

اسکردو میں برف باری کی وجہ سے قدرتی طور سے گھاس اگ آتی ہے اس لیے جس کا جی چاہے ایک گھوڑا لے اور پولو کھیل لے۔

بلتستان اور پولو لازم اور ملزوم ہیں جس کا تذکرہ شعر و ادب میں بھی ملتا ہے۔ ابوالعباس شکری اسکردو کے ایک نامی گرامی شاعر تھے انہوں نے اپنی ایک نظم بے ثباتی دنیا میں پولو کے کھلاڑی عبدالکریم کا ذکر کیا ہے۔ انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ ایسے ماہر کھلاڑی کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔

پولو 77 ملکوں میں کھیلا جاتا ہے۔ اس میں خواتین بھی حصہ لیتی ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں کیوں کہ راجا مہاراجوں کے زمانے میں بھی شہزادیاں اور ملکائیں پولو کھیلتی تھیں یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں ان کی بہتات تھی۔ دو چار کو گھوڑا میدان میں گرا دے تو کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آج حفاظتی انتظامات زیادہ ہوتے ہیں۔

اسکردو میں ہر سال تہواروں پر پولو کے کھیل بھی ذوق و شوق سے ہوتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اب یہ کھیل زوال پذیر ہے حالانکہ اسکردو میں گھاس، گھوڑے اور لوگ اسی طرح موجود ہیں لیکن علی شیر انچن جیسے صاحب ذوق اور سرپرست نہیں ملتے۔

ہمارا سندھو

سنجیدگی سے سوچتے ہیں کتنا اچھا ہے ہم دریائے سندھ نہیں ورنہ کبھی تبت اور لداخ سے باہر نہ نکلتے بس وہیں پہاڑوں میں بستیوں میں وادیوں میں گول گول گھومتے رہتے کیوں کہ جو قدر و منزلت دریائے سندھ کی تبت اور لداخ میں ہے وہ بھلا کہاں جب وہ اسکردو میں داخل ہوتا ہے۔

دریائے سندھ چینی تبت کے علاقے جھیل مانسرور سے نکلتا ہے۔ مانسرور جھیل سے نکلنے والا دریا کتنی منتوں مرادوں کا ہے۔ کس کس کو مکتی اور نروان دیتا ہے۔ وہاں اس کا نام شیر دریا ہے۔ یہ دریا اسکردو سے سیدھا بلتستان کے علاقے چیلاس جاتا ہے اور وہاں سے بہتا ہوا پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ 3200 کلو میٹر سفر کرتا ہوا بحیرۂ عرب میں شامل ہو جاتا ہے۔ چین میں یہ 2 فیصد، ہندوستان میں 5 فیصد اور پاکستان میں 93 فیصد بہتا ہے۔ اس دریا میں بہت سے دریاؤں کا پانی شامل ہوتا ہے پچ

ہے بڑوں کے ساتھ چھوٹے آ ملتے ہیں۔ طاقتور کے آگے کمزور ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

دریائے سندھ پاکستان کے لیے بہت اہم ہے کیوں کہ زیادہ تر آبپاشی اسی کے پانی سے کی جاتی ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے بزرگوں کو مغل شہزادے خرم نے زمین عطا کی، وہ کشمیر میں ایک نہر کے کنارے تھی۔ اس لیے یہ لوگ ''نہر والے'' کہلائے جو بعد میں ''نہرو'' ہو گیا اسی طرح ہندوستان میں رہنے والوں کے مذہب کو دریائے سندھ نے نام سندھو پھر ہندو دیا۔ ہم سوچتے ہیں اگر دریائے سندھ نہ ہوتا تو اس مذہب کا نام کیا ہوتا؟ یہ علم نہیں ہو سکا کہ دریا کا نام پہلے سندھ رکھا گیا یا علاقے کا نام سندھ پڑا۔ بہر حال دونوں حقیقت ہیں وہاں رہنے والے اپنے آپ کو سندھی کہلانا باعث فخر سمجھتے ہیں اگر دریائے سندھ تبت اور لداخ کے درمیان رہ جاتا تو اس کا اتنا نام نہ ہوتا اور کتنے دریا اس کی آغوش میں نہ سما پاتے۔

ہم جب اسکردو سے نکلے تو دریائے سندھ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک مقام پر ہم ذرا سا اونگھے تو یہ غائب ہو گیا مگر جب گلگت سے چیلاس پہنچے تو پھر آملا اور ساتھ ساتھ رہا بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دریا ہم ساتھ لائے تھے کیوں کہ دریا ہر روز نیا ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں نیا پانی بھرتا ہے اور ہمارے ساتھ کتنا پانی آیا تھا اس کا اندازہ نہیں لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ وہ شاہراہ قراقرم پر ایسے منظر پیش کرتا رہا کہ جو خوف کے باوجود اچھے لگتے رہے۔

اک رات برف کی

نشست کا انتظام فرش پر تھا، بڑا کمرہ درمیان میں آگ روشن تھی۔ اسکردو میں ان دنوں بجلی کی کمی تھی لیکن آج اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں دو تین جگہ مشعلیں روشن کی گئی تھیں۔ آگ کے چاروں طرف شہر کے بہت سے صاحب ذوق اور مہمان بیٹھے تھے۔ رندو وادی سے عبدالرحمٰن کو خاص طور سے ہمارے لیے بلایا گیا تھا۔ اس پورے علاقے میں عبدالرحمٰن کا بڑا نام ہے۔ لوگ اس سے ملنے، اسے دیکھنے ذوق و شوق سے آتے ہیں۔ یہ غلام عباس کے گھر کا ڈرائنگ روم تھا پہلے کھانے کا انتظام تھا۔ آج خاص طور سے بلتستان کے روایتی کھانے بنائے گئے تھے۔ مارخور کا گوشت بھی تھا جو کبھی کبھی خاص محفلوں میں پکایا جاتا ہے۔

غلام عباس نے سب مہمانوں کے سامنے دستر خوان بچھائے اور پھر کھانا چنا جانے لگا۔ ایک بڑی ڈش میں ''مرزن'' تھا۔ یہ آٹے اور خشک میووں سے بنائی ہوئی ڈش ہے۔ ایک اور بڑے تھال میں ''پراؤ'' تھا جسے ''ترمبا'' کے آٹے سے بناتے ہیں۔ یہ موسم بہار میں کھیتوں میں اگنے والا اناج ہے جسے پیس کر آٹا بناتے ہیں اور پھر اسے پکا کر تھال میں رکھتے ہیں۔ درمیان میں خوبانی اور اخروٹ کا تیل ڈالتے ہیں اور پھر کئی لوگ مل کر اسے کھاتے ہیں۔

مارخور کے گوشت کے تکے تھے، بھنا ہوا بھی تھا۔ ہم نے مرزن چکھا اس کی ایک مخصوص مہک تھی اور پہلے نوالے کا ذائقہ بے حد اجنبی تھا لیکن میزبان کے اصرار کے بعد چند لقموں نے شناسائی پیدا کی۔ ''پراؤ'' بھی ہمارے لیے نامانوس تھا اور دیر تک رہا۔ مارخور کا گوشت بھی تکلفاً ہی کھایا جا سکتا ہے لیکن یہ اسکردو کے علاقے میں ایک بڑی نعمت ہے۔ آج ہم نے ان سب نعمتوں سے لطف لیا۔

کھانے کے بعد دستر خوان ہٹا دیئے گئے اور قہوہ پیش کیا گیا پلیٹوں میں بھنی ہوئی مونگ پھلی اور اخروٹ تھے، قہوے کے ساتھ جن کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ باہر ایک سرد رات تھی، برف دبے پاؤں زمین پر جمع ہو رہا تھا اور اندر موسم گرما تھا۔ پھر سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک طرف ایک اونچے سے تخت پر سفید داڑھی والے ایک صحت مند بزرگ آ بیٹھے۔ یہ عبدالرحمٰن ہیں جو جادو جگاتے ہیں۔ کمرے میں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے یہاں کوئی نہ ہو عبدالرحمٰن نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''سب تعریفیں اس کے لیے جو ہم سب کو

پالنے والا ہے۔ نعمتیں دینے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، راحتیں پہنچانے والا ہے، وہی حاکم، اسی کا حکم، وہی شاہ اسی کی شہنشاہیت، وہی سردار اسی کی سرداری شکر ہے اس کا کہ وہ ہم سے راضی ہے۔''

جہاں ہم بیٹھے ہیں وہاں سے پچاس میل دور وادی رندد ہے جہاں مندی کے قریب بردا نامی گاؤں میں ایک بڑی چٹان کے نیچے ہلافو کیسر پیدا ہوا اس کی پرورش وادیوں، چشموں اور دریاؤں نے کی اسے ان دیکھے دیوتاؤں نے اپنی ساری طاقت دی سمجھنے کی، سوچنے کی، دشمن کو شکست دینے کی اور ظالموں کو روکنے کی یہ بہت بہادر شخص تھا۔ وہ رحمدل تھا کسی کو تکلیف میں نہ دیکھ سکتا پھولوں سے بھری وادیوں سے گزرتے وقت خوش رنگ پرندوں کو دیکھ کر مسرور ہوتا انہیں جہاں تک ممکن ہوتا کھانے کو دیتا وہ چشمے کے کنارے بیٹھ کر ان کے گیت سنا کرتا، برف پوش پہاڑوں پر چلا جاتا، اونچے اونچے پہاڑ ناقابل تسخیر گلیشیئر پار کر لیتا دور تک گھاس سے بھرے میدانوں میں سفید برف جیسی بھیڑوں کو گھومتے پھرتے دیکھ کر خوش ہوتا۔ گاؤں کی البز حسینا ئیں جب کسی بات پر قہقہے لگاتیں تو ہلافو کیسر کو یہ ''موسیقی'' وادیوں میں گونجتی اچھی لگتی۔ اسے بادلوں سے پیار تھا وہ بارش پسند کرتا تھا چاندنی راتوں میں جب گاؤں کے لوگوں کے کان میں سریلی بانسری کی آواز آتی تو وہ سمجھ جاتے یہ ہلافو کیسر کے دل سے نکلنے والی آواز ہے، وہ پہاڑوں میں، وادیوں میں، میدانوں میں حکمرانی کرتا۔

ہلافو کیسر کو وادی میں رہنے والی ایک دوشیزہ پسند آگئی جو پھولوں کی طرح نازک تھی جس کی آنکھوں میں نیلی جھیلیں تھیں اور ہونٹ کنول کے پھول تھے۔ وہ مسکراتی تو بہار آجاتی۔ وہ بولتی تو فضا خاموش ہو کر سننے لگتی وہ ''برکمو'' تھی وہ اس بہادر شخص کی ملکہ بن گئی، پہاڑوں، وادیوں میں ان کا راج تھا۔ ایک دن ہلافو کیسر کو معلوم ہوا کہ ایک علاقے کا حکمران رومردان چو اپنے لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ لوگ اس سے ناخوش ہیں۔ ہلافو کیسر کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اس علاقے پر حملہ کر دیا۔ رومردان چو کی عادت تھی کہ وہ ہفتوں سوتا رہتا تھا۔ یہ بات ہلافو کیسر کو معلوم تھی لیکن وہ بہادر تھا اور مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ اتفاقاً راستے میں کچھ رکاوٹیں آگئیں اور جب وہ اس علاقے میں پہنچا تو رومردان چو خواب غفلت میں پڑا تھا۔ ہلافو کیسر نے اس علاقے کو فتح کیا اور بڑی تعداد میں مال غنیمت لے کر واپس لوٹا جس میں قیدی مرد عورتوں کے علاوہ گھوڑے اور شکاری کتے بھی شامل تھے۔ رومردان چو کو جب ہوش آیا تو اس نے ہلافو کیسر کا پیچھا کیا اور ایک علاقے میں پہنچا جہاں وہ تھا۔ دونوں آمنے سامنے ہوئے رومردان چو نے خطاب کیا۔

''جوانوں کو پکڑنا دستور تھا تو عمر رسیدہ کو لے جانا کہاں کا اصول ہے؟ تازہ دم گھوڑوں کو اگر لے جانا تھا تو کمزوروں کو کیوں نہیں چھوڑا؟ جوان شکاری کتوں کو لے گئے تو کمزور اور مادہ کو لے جانا کون سی بہادری ہے؟''

ہلافو کیسر نے جواب دیا۔

''جب ہم بچوں کو ساتھ لائے تو مائیں خود بخود ساتھ چلی آئیں۔ جب نو عمر جانوروں کو ہانک کر لائے تو مادہ خود بخود آگئیں۔ بکریوں کے بچے لائے تو بکریاں بھی خود بخود چلی آئیں۔ بتاؤ بھلا اس میں میرا کیا قصور؟''

اس جواب کے بعد رومردان چو نے مقابلے کی دعوت دی جو ہلافو کیسر نے قبول کر لی۔

رومردان چو اور ہلافو کیسر سات دن تک ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور اس دوران دونوں نے اپنی اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ فن پہلوانی کے جوہر دکھائے۔ آخر رومردان چو تھک کر زمین پر گر گیا اور ہلافو کیسر نے خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا اور یوں وہ جیت گیا اور کثیر مال و اسباب لے کر اپنے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہلافو کیسر کی ملکہ نے واپسی کے سفر کے دوران

باتوں باتوں میں کہا کہ ہلافو کی جیت اس کی تدبیر کی وجہ سے ہوئی وہ اگر اس کی خدمت نہ کرتی اور صحیح مشورہ نہ دیتی تو یہ کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ ہلافو کیسر غصے میں آ گیا۔ اس نے اپنی ملکہ کو دعوت دی کہ وہ دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرے ایک وہ کہ جس پر انسان چلتے ہیں اور دوسرا جو کتوں کے نام سے منسوب ہے ملکہ نے انسانوں کا راستہ اختیار کیا اور اپنے آبائی گاؤں پنکسہ ہرژ کو پہنچ گئی۔

ہلافو کیسر کتوں سے منسوب راستے پر چل نکلا کیوں کہ اسے ایک اور مہم پر جانا تھا۔ ہلافو ملکہ کو پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ بعض کا کہنا ہے وہ کچھ عرصے کے بعد ایک سرخ چونچ والی نیلے جسم والی حسین چڑیا بن گئی تھی اور موسم بہار میں ڈال ڈال پر بیٹھ کر جانے کیا کہتی رہتی تھی۔ کچھ کا خیال ہے وہ سنہرے پروں والا وہ پرندہ ہے جو خزاں کے آنے سے پہلے وادیوں کی طرف اڑ جاتا ہے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ ہُد ہُد ہے جس کے سر پر ایک کلغی ہے جو ملکہ کے سر پر تاج کی طرح نظر آتی ہے۔''

عبدالرحمٰن ایک داستان گو ہے جس کے لفظوں میں جادو ہے جو لمحہ بھر میں اڑا کر سبز وادیوں، سفید کھاڑیوں اور خوبانی کے باغوں میں لے جاتا ہے اس کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو الف لیلیٰ میں لکھا ہے اس میں وہی جادو ہے جو قصص الحمرا میں بولتا ہے۔ اس میں وہی طلسم ہے جو امیر حمزہ کی داستان میں چھپا ہے۔ اس میں وہی سحر ہے جو طلسم ہوشربا میں ہے۔ جب وہ بول رہا تھا تو ایک ایسی خاموشی تھی جس میں برف گرنے کی سرگوشی بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہاں بیٹھے سب لوگ اپنے آپ کو ہلافو کیسر سمجھ رہے تھے۔ ہم نے محسوس کیا اَن دیکھے زمانے میں بلند چٹانوں کے نیچے ایک تنومند گھوڑے کو دوڑاتا پشت پر جو شخص بیٹھا ہے وہ ہم ہیں اور اَن دیکھی تاریخ میں ہمارا نام ہلافو کیسر تھا۔

الوداع اسکردو

اس دن صبح سے شدید سردی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سانس جمتی جا رہی ہے۔ ہم ریڈیو پاکستان اسکردو کے دفتر میں غلام عباس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ موسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مہکتے ہوئے قہوے کا دور چل رہا تھا۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل تھے۔ خیال تھا اس موسم کی سب سے زیادہ برفباری آج ہو گی۔ ابھی بادل جمے کھڑے تھے۔

ہمارا پروگرام یہ تھا کہ اسکردو سے گلگت فوکر کی پرواز سے جائیں گے۔ کل روانگی تھی، غلام عباس کا خیال تھا اگر بادل اسی طرح رہے اور برفباری بھی ہوئی تو نہ پرواز آئے گی اور نہ جانے کا کوئی امکان ہے۔ ہم گلگت جانا چاہتے تھے۔ غلام عباس نے ہمارے دوست اور گلگت ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر اکرم خان بلتی سے فون ملوایا اور وہ ہماری آواز سن کر بہت خوش ہوئے۔ اس موسم میں کراچی سے کون آتا ہے۔ وہ بتانے لگے آپ کے لیے ہوٹل کا کمرہ بک کر دیا گیا ہے اور یہاں سب منتظر ہیں۔ ہم نے اسکردو کے بارے میں کچھ کہنا چاہا انہوں نے ہمارا جملہ کاٹ دیا اور کہا۔

''مجھے معلوم ہے وہاں موسم خراب ہے اور کئی دن تک ایسا ہی رہے گا۔ آپ بائی روڈ آ جائیں۔''

ہم نے کہا۔ ''برفباری میں تو راستے بھی بند ہوں گے۔''

اکرم خان کہنے لگے۔ غلام عباس راستہ چیک کروا لیں گے اور وادی رندو سے آگے آئیں گے تو راستہ صاف ملے گا۔

اکرم خان بلتی نے اصرار کیا کہ آپ سڑک کے راستے گلگت آ جائیں۔ غلام عباس نے ہم سے کہا۔ میرے تجربے کے مطابق جہاز کا اب کئی دنوں تک آنا ممکن نہیں، میں آپ کا انتظام کوچ میں کروا دیتا ہوں۔ کل دوپہر تک آپ روانہ ہو جائیں گے اور شام تک گلگت پہنچ جائیں گے۔ ہم نے احتیاطاً اپنا ہوائی ٹکٹ غلام عباس کو دیا کہ اسے کنفرم کروا لیں شاید کل تک موسم بدل جائے۔

ہم ہوٹل جانے کے لیے باہر نکلے تو رات ہو چکی تھی، پہاڑوں پر دن جلدی ڈوب جاتا ہے

اور آسمان پر بادل ہوں تو رات جلدی آ جاتی ہے۔ غلام عباس ہمارے ساتھ ہوٹل آ گئے۔ ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ہم نے کھانے کا آرڈر دیا ایک میز کے قریب تیل سے چلنے والا ہیٹر رکھا تھا ہم وہیں بیٹھ گئے۔ غلام عباس نے کہا یہ اچھا ہے کہ آپ کل جا رہے ہیں کیوں کہ اب موسم روٹھا ہوا لگتا ہے۔ برف باری شروع ہو گئی تو کئی دن تک جاری رہے گی۔

کھانے کے بعد قہوہ پی کر غلام عباس صبح آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ہم کمرے میں آئے تو وہاں ہوٹل کی انتظامیہ نے تیل کے چولہے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ٹھنڈک اتنی تھی کہ ہم نے ایک اور چولہا مانگا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص دوسرا چولہا لے آیا اور اسے جلا دیا۔ کمرے کا درجہ حرارت ذرا سا بڑھا۔ اسکردو میں بجلی بہت کم آتی ہے۔ قراقرم ہوٹل میں اور کم تھی اس لیے لالٹین جلائی جاتی تھی ہمیں اس سے کوئی مسئلہ نہیں تھا سونا ہی ہے زیادہ روشنی کی کیا ضرورت ہے؟

ہم بستر پر لیٹے تو یوں لگا جیسے برف کی سِل پر لیٹ گئے ہیں۔ ایک موٹا لحاف اس پر سے ایک کمبل اوڑھا منہ بھی اندر کر لیا تھوڑی سی سردی کم ہوئی لیکن پھر بھی اتنی ٹھنڈ تھی کہ بستر پر کروٹ نہیں لے سکتے تھے کیونکہ لگ رہا تھا جیسے چاروں طرف برف کی سلیں ہیں۔ ہم صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہیں۔ علی الصبح بیدار ہو گئے۔ بستر سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سر چکرا گیا۔

یوں محسوس ہوا سینے پر بوجھ ہے اور سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے اسی وقت کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم ہمت کر کے اٹھے میز پکڑ کی دروازہ کھولا۔ ہوٹل کا ملازم گرم پانی کی ایک بالٹی لایا تھا وہ اس نے باتھ روم میں رکھ دی۔ دروازہ کھلا تو باہر سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ہر طرف برف اڑتی نظر آئی۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور استقبالیہ پہنچ گئے اس کے برابر ایک کمرے میں ناشتے کا انتظام تھا۔

برف باری مسلسل ہو رہی تھی اور ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب ہماری روانگی بس سے ہی ممکن ہو سکے گی، اسکردو میں رک کر جہاز کا انتظام کرنا کوئی دانشمندی نہیں تھی سنا تھا ہفتوں موسم خراب رہتا ہے۔

ناشتے کے بعد ہم نے غلام عباس کو فون کیا انہوں نے کہا بس میں آ رہا ہوں آپ کا ٹکٹ بھی لاؤں گا گلگت کے لیے آپ کی سیٹ ماشا بروم ٹرانسپورٹ سے بک کرا دی ہے دس بجے روانگی ہے۔ ہم نے کمرے میں جا کر اپنا سامان بیگ میں رکھا اور واپس آ گئے۔

غلام عباس نے آنے میں دیر نہیں لگائی کہنے لگے۔ ''آپ دو چار دن اور ٹھہر جاتے۔''

ہم نے کہا۔ ''گلگت بھی ہمارے انتظار میں ہے۔ یہ بتایئے کہ کیا راستہ ٹھیک ملے گا؟''

غلام عباس بولے۔ ''برفباری صبح شروع ہوئی ہے اور جب تک اس میں شدت آئے گی آپ انشاء اللہ اس علاقے سے نکل جائیں گے یوں بھی یہ راستہ خاصا محفوظ ہے۔''

غلام عباس راستے کے لیے بسکٹ کے کچھ پیکٹ اور پانی کی دو بوتلیں لائے تھے۔ وہ کہنے لگے۔ ''ایک بار موسم بہار میں ضرور آیئے گا۔ جہاں جہاں آج برف ہے وہاں آپ کو گھاس پودے اور پھول نظر آئیں گے۔''

ہم نے وعدہ کیا زندگی نے وفا کی اور دریائے سندھ ہمارے حصے کا پانی اسکردو لے آیا تو ہم وہ پینے ضرور آئیں گے۔ انسان ارادہ کر لے تو اسے ضرور پورا کرتا ہے۔''

ہم اور غلام عباس ہوٹل سے باہر نکلے تو سڑک نے سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ یہ منظر اچھا لگا۔

جب ہم چلتے ہوئے دوسری سمت جا رہے تھے تو ہمارے قدموں کے نشان بن رہے تھے لیکن برف انہیں مٹا رہی تھی۔ یہ برف نہیں تھی وقت تھا جو سارے نقش مٹا دیتا ہے یہاں تک کہ یادیں بھی مدھم پڑ جاتی ہیں۔

سامنے صاف ستھری کوچ کھڑی تھی۔ ہماری اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ پلٹ کر ہوٹل کو دیکھتے، نہ جانے وہ عمارت بھی کیوں ہمیں عزیز ہو گئی تھی جس میں چند روز گزارے تھے کسی عزیز سے بچھڑنا ہمیں اچھا نہیں لگا۔ بس ہم کوچ کی طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ اس کا دروازہ آ گیا اور ہم اس میں داخل ہو گئے اور اسکردو کی زمین ہمارے پیروں کے نیچے سے جاتی رہی۔ ڈرائیور کی پچھلی نشست پر کھڑکی کی طرف ہمیں سیٹ دی گئی۔ غلام عباس کا کہنا تھا یہ وی آئی پی سیٹ ہے۔ جب سے ہم اسکردو آئے تھے وی آئی پی تھے اور اب سیٹ بھی وی آئی پی ٹی تھی۔

غلام عباس نے ہاتھ ملایا اور کوچ سے اتر گئے۔ ذرا ہی دیر میں کوچ کا دروازہ بند ہوا اور وہ برف سے ڈھکی سڑک پر روانہ ہو گئی۔

اسکردو برف میں ڈھکا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ بس ہم جا رہے تھے۔

یا اللہ خیر

کوچ میں ہمارے برابر ایک جوان آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''میرا نام کیپٹن منیر لودھی ہے۔''

ہم نے اپنا تعارف کروایا۔

ہم نے پوچھا۔ ''آپ یہاں سیاحت کے لیے آئے تھے؟''

وہ بولے۔ ''اس علاقے میں میری پوسٹنگ ہے میں چھٹی پر اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔''

ہم نے اپنے بارے میں بتایا، انہیں ریڈیو سے خاصی دلچسپی تھی۔ سفر کے دوران ہم زیادہ تر خاموش رہتے ہیں لیکن وہ خاصے معقول آدمی تھے اور دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ ادب سے بھی شغف تھا۔

ہمارے دونوں طرف برف تھی اور مسلسل گر رہی تھی۔ یہ سلسلہ جاری تھا۔

کیپٹن لودھی نے اپنے تھرماس سے چائے نکالی ہمیں بھی پیش کی۔ ہم نے شکریے کے ساتھ معذرت چاہی۔ ابھی پی کر آئے ہیں۔

کوچ اب ایسی سڑک پر آ گئی جس کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف گہرائی میں دریائے سندھ تھا، کبھی اس کی گہرائی کم ہوتی کبھی بڑھ جاتی۔ اس میں پانی نظر آ رہا تھا لیکن کم تھا۔ بعض جگہ بڑے بڑے پتھر بھی تھے ابھی تک برف باری کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ سڑک ایک گاڑی کے چلنے کی تھی لیکن اس پر ٹریفک جاتا بھی تھا اور آتا بھی تھا۔ جب کوئی گاڑی مخالف سمت سے آتی تو وہ ٹھہر جاتی یا ہماری کوچ رک جاتی اور کوشش کرتے کہ گاڑی کو ذرا پیچھے کر کے نسبتاً چوڑی جگہ کھڑی کر لیں تاکہ مخالف سمت کی گاڑی نکل سکے۔ اس موقع پر جب ڈرائیور بریک لگاتا تو کوچ میں بڑے بڑے سرخ رنگ کے ''یا اللہ خیر'' کے لفظ روشن ہو جاتے۔

گلگت تک پہنچتے ہوئے ہم نے ہزاروں مرتبہ ''یا اللہ خیر'' کا لفظ روشن ہوتے دیکھا اور اس دن ہم نے اپنے رب کو اپنے خوف سے پہچانا۔ راستہ کبھی اترنے لگتا، چڑھنے لگتا۔ پتھروں کے درمیان آ جاتا۔ کبھی تنگ تو کبھی کشادہ ہو جاتا۔ بڑے بڑے پتھر اور نزدیکی پہاڑ پھر وادیاں اور دریا کا تنگ دہانہ یہاں تک کہ کوچ ایک جگہ رک گئی۔

یہ ''کچورا'' گاؤں تھا۔ وادی روندا میں واقع یہاں دو تین مسافر اترے اور دو ایک سوار ہوئے۔ یہاں بھی برف باری تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جو مسافروں کو کوچ میں ہی چائے پہنچا دیتے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد سفر شروع ہوا لیکن حیرت انگیز تبدیلی یہ ہوئی کہ کوچ کا دروازہ کھلا اور بند ہوا تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارے سینے پر جو بوجھ تھا، وہ جاتا رہا شاید وہ گیس جو کمرے میں تیل کے دو چولہوں سے نکل کر پھیپھڑوں میں چلی گئی تھی نکل گئی ایک سکون اور راحت کا احساس ہوا۔ کوچ چل پڑی اور اب آہستہ آہستہ برف باری کا علاقہ دور ہوتا گیا۔

کوچ ایک تنگ جگہ سے گزر رہی تھی۔ دوسری

سمت سے ایک بس آ گئی۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ دونوں برابر سے ہو کر اپنی اپنی سمت چلی جائیں اس لیے ہماری کوچ اس طرف رک گئی اور دوسری گاڑی ذرا فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد ہمارے ڈرائیور نے کوچ کو آہستہ آہستہ ریورس کرنا شروع کیا۔ جگہ خاصی کم تھی بار بار اس کا پاؤں بریک پر جاتا اور ''یا اللہ خیر'' کے الفاظ روشن ہو جاتے۔ اس لمحے یہ واحد سہارا تھا جو ہمت بندھا رہا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ بس کے پچھلے پہیے سڑک کے بالکل کنارے پر آ گئے۔ چند پتھر دریا میں جا گرے ڈرائیور نے بریک لگایا ''یا اللہ خیر'' پھر کوچ ذرا آگے کی طرف چلی اور پھر ریورس، چند گز کے بعد سڑک ذرا سی چوڑی ہوئی پھر پچھ اور یہاں تک کہ کوچ خاصی چوڑی جگہ پر آ گئی پھر وہ رک گئی اور مخالف سمت والی بس پاس سے ہوتی ہوئی گزر گئی۔ اس پورے عرصے میں ''یا اللہ خیر'' نے ہمارے رب کو اتنا نزدیک کر دیا تھا جس کا پہلے احساس نہیں ہوا تھا۔

ہماری کوچ روانہ ہوئی ایک طرف پہاڑ دوسری طرف گہرا دریائے سندھ اور ہر لمحے یہ خدشہ جانے کب کس تنگ سڑک پر سامنے سے گاڑی آ جائے۔ دیر تک ایسا نہیں ہوا۔ پھر ایک گاؤں آ گیا اس کا نام ''باغیچہ'' تھا۔ ہمیں پسند آیا اگر یہ نام نہ بھی ہوتا تو یہ سب ایک باغ ہی تو تھا سبزہ پودے اور کہیں کہیں تھوڑی سی برف۔

میجر لودھی نے ہم سے کہا۔ ''اس جگہ کھانا کھاتے ہیں۔''

ہمیں بھی بھوک لگ رہی تھی۔ اس لیے کوچ سے اتر کر ہوٹل کی طرف چلے۔

اندر بہت سے لوگ بیٹھے تھے اور تندور پر گرم گرم نان لگ رہے تھے۔ میجر لودھی نے ہوٹل کے برابر ایک کمرہ کھلوایا اس میں دو چارپائیاں پڑی تھیں بیچ میں ایک تپائی تھی۔ یہ وی آئی پی برتاؤ تھا۔ کھانے کے لیے پوچھنے ہوٹل کا ایک شخص آیا۔ ہم نے کہا مٹن کڑھائی ہے وہ بولا۔ ''جی۔'' ہم نے کہا۔ ''لے آؤ۔''

میجر لودھی نے اس آرڈر کو روک دیا اور کہا۔ ''یہاں ماش کی دال بہت اچھی ملتی ہے وہی دو لے آؤ۔'' جب ہوٹل کا آدمی چلا گیا تو میجر لودھی نے کہا یہاں ہوٹل میں لوگ گوشت کم کھاتے ہیں اس لیے وہ تازہ نہیں ہوگا۔ دال دن میں دو بار تازہ بنتی ہے اس لیے اچھی ہوتی ہے۔ یہ بات ان کے تجربے کی تھی۔

ذرا دیر میں گرم گرم نان اور ماش کی پتلی دال آ گئی۔ اس کا ذائقہ بے حد لذیذ تھا۔ گرم نان کے ساتھ سب کچھ اچھا لگتا ہے پھر قہوہ پیا گیا، کھانے کے بعد جب ہم پیسے دینے لگے تو میجر لودھی نے ہنس کر کہا۔

''یہاں میرا حساب چلتا ہے، وہ آپ سے پیسے نہیں لیں گے۔''

''لیکن کیوں؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ یہی میری منزل ہے اور آپ میرے مہمان۔''

ہم حیران ہوئے۔ ''جب یہ آپ کا گاؤں ہے، آپ کا گھر یہاں ہے تو پھر ہوٹل میں کیوں کھایا؟''

''آپ کی میزبانی کرنی تھی۔'' میجر لودھی ہنسنے لگے۔ پھر ہمارے ساتھ کوچ تک آئے اور ہاتھ ملا کر چلے گئے۔

سفر شروع ہوا اور پہاڑ اور دریا کے درمیان ہم چلتے رہے۔

ایک اور گاؤں آ گیا۔ ''اشنگ'' وہ بھی گزر گیا۔ اب سڑک ذرا چوڑی ہو گئی تھی۔ نہ جانے ہمیں کب نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی دریائے سندھ ہم سے جدا ہو گیا تھا۔ کسی اور طرف نکل گیا تھا اور ہماری کوچ تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اسکردو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

آہستہ آہستہ رات اتر رہی تھی اور گلگت بازو پھیلائے ہمارے استقبال کو تیار تھا۔

گلگت کے اکرم خان بلتی

1969ء میں ہم ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں پروڈیوسر تھے انہی دنوں وہاں اکرم خان بلتی بھی ہوتے تھے۔ جو بلتی پروگرام کے پروڈیوسر تھے۔

ہمارے دوست اور پروڈیوسر ظہیر حسن نے اکرم خان بلتی سے تعارف کروایا تھا۔ یہ ایک ملنسار اور ہمدرد انسان تھے اکثر ظہیر حسن کے کمرے میں ملاقات ہوتی ان دنوں وہاں بشیر زیدی ایبر پروگرام آرگنائزر تھے۔ ہر روز پروگرام میٹنگ کے بعد دوسری میٹنگ ان کے کمرے میں ہوتی تھی جس میں افسران کے لطیفے اور پروگراموں کی دلچسپ غلطیوں پر گفتگو ہوتی۔ سب لوگ چندہ کر کے آئس کریم منگواتے یا باری باری چائے پلواتے۔ اکرم خان بلتی اس گپ میٹنگ کے ممبر تھے۔

راولپنڈی اسٹیشن پر خوب محفلیں سجتیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بھاگ دوڑ رہتی۔ کینٹین والا رات گئے ہماری پسند کے کھانے پکاتا سب لوگ ڈٹ کر کھاتے۔ یہ سب ادھار پر ہوتا پہلی تاریخ کو حساب بے باق کر دیتے۔ اس امید پر کہ جب سرمایہ ختم ہو جائے گا تو کھانا پینا تو ادھار پر رہے گا۔

ہم لوگ شام کو کہیں گھومنے جاتے تو شام کے بعد ریڈیو ضرور آ جاتے کیوں کہ کینٹین سے کھانا اور چائے مل جاتی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے۔ راولپنڈی میں ٹوٹ کر بارشیں ہوتی ہیں۔ ٹھٹھرا دینے والی سردی ہوتی ہے، گرمی نام پوچھتی ہے لیکن ان دنوں ہماری زندگی کا وہ دور تھا کہ سرد ہوا اور تیز دھوپ دونوں اچھے لگتے اور بارشوں میں بھیگنا ہم پر لازم تھا نہ جسم کو کچھ ہوتا نہ طبیعت خراب ہوتی۔ راولپنڈی اسٹیشن پر ان دنوں بے شمار پھول کھلتے، سبزہ اگتا ہمارے کمرے کی پشت پر نارنگیوں کے درخت لگے تھے وہ خوب پھل دیتے یہ سب دن خوشی کے بہار کے تھے۔

سرکاری ملازمت میں اچانک تبادلہ ہو جاتا ہے ایک دن ہمارا بھی ہو گیا۔ کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ جب وہاں محفلیں جمنے لگیں تو حکم آیا حیدر آباد جاؤ، ہم چلے گئے۔ یہ ہمارا شہر ہے احباب ہیں رشتہ دار ہیں بلکہ ہر گلی کوچہ ہمارے دوستوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان سب سے ملاقات جاری تھی تو کہا کراچی چلے جاؤ پھر ایک دن اسلام آباد بلا لیا۔ کچھ عرصے کے بعد کراچی واپس گیا، بلوچستان کے علاقے خضدار میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کے ہیڈ کوارٹرز نے سمجھا ہمارا وہاں جانا ضروری ہے اس لیے وہاں کے آرڈرز آ گئے ان دنوں خضدار بے حد پرسکون شہر تھا۔ وہاں دوست بننے لگے فضا راس آنے لگی۔ اس بات کی خبر ہمارے افسران بالا کو ہو گئی اس لیے کراچی ریڈیو کے شعبہ مطبوعات میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ہم خاصے عرصے رہے۔ ایک بار خیال آیا تمام ریڈیو اسٹیشنوں کے الگ الگ خاص نمبر نکالتے ہیں۔

گلگت اور اسکردو ریڈیو پاکستان کے اہم اسٹیشن میں اسکردو کے بعد گلگت کا پروگرام بنایا تو معلوم ہوا کہ راولپنڈی والے پروڈیوسر اکرم خان بلتی ان دنوں گلگت کے اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں۔ اسکردو گلگت بلتستان کہلاتے ہیں۔ ہم بلتی کے لفظ سے پہلی بار اکرم خان کی وجہ سے متعارف ہوئے۔

جب اکرم خان بلتی کو ہم نے اپنے آنے کے ارادے سے مطلع کیا تو خوش ہوئے اور کہا ''پہلے گلگت آئیں۔''

ہم نے کہا۔ ''ہم اسکردو سے گلگت آئیں گے اور آپ کے پاس زیادہ قیام کریں گے۔ کیوں کہ ہمیں دریاؤں، پہاڑوں، راستوں سے واسطہ نہیں ہم اکرم خان بلتی کو دیکھنے آئیں گے اور آج وہ موقع آ گیا۔

ہمیں شیخ کا درجہ دیا گیا

اکرم خان بلتی کی خواہش تھی ہمارا قیام ریڈیو اسٹیشن کے نزدیک رہے۔ اس لیے ہوٹل البرج میں انتظام تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ریڈیو اسٹیشن فوجی چھاؤنی کے علاقے میں ہے۔ ہمیں ان کے سائے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس پر کون اعتراض کرے گا۔ پورا پاکستان وقفے وقفے سے ان کی زیرِ سایہ رہتا ہے۔ وہ یہ عنایت مستقل کرنا چاہتے ہیں لیکن جب وہ آتے ہیں ریڈیو ٹیلی ویژن ''وقفہ بہت ضروری ہے'' کے اشتہارات اس کثرت سے سناتے دکھاتے ہیں۔ وہ مجبوراً وقفہ دینے کے لیے بیرکوں میں چلے جاتے ہیں۔

ہم نے شکر ادا کیا، ریڈیو اسٹیشن فوجی چھاؤنی میں ہے اس سے پہلے دریا گلگت کے پار دینور قصبے میں تھا۔ رسیوں سے بنے پل سے دریا پار کرنا ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کا بیشتر حصہ رسہ کشی میں گزرا ہے۔ امارت ریاست کا رسہ جب بھی کھینچا اس نے ہمیں ایک انچ آگے نہ کھسکنے دیا۔ دریائے گلگت پر اس پلے کو بار بار نیچے پار کرتے۔

گلگت پہنچ کر جو پسند آیا وہ برف باری کا نہ ہونا اور اکرم بلتی کا ہونا تھا۔ ہوٹل اچھا تھا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی ہم اس میں قیام کرنے والے اکیلے مہمان تھے۔ باقی کمرے خالی رکھے گئے یا خالی رہ گئے۔ ہم نے اس پر فخر کیا۔ عرب شیخ جس ہوٹل میں قیام کرتے ہیں اس کے تمام کمرے خالی کرا لیتے ہیں۔ گلگت میں ہم عربی شیخ بن گئے۔ ہوٹل میں اکیلے قیام کی وجہ سے یہ بات بھی سوچی ہی نہیں کہ اس ٹھٹھرے جمے ہوئے موسم میں کون مہمان آئے گا۔ اس انکشاف ناشتے اور کھانے کے وقت ہوا جب ہم ہر بار اکیلے ہوتے تھے۔

ہوٹل کا کمرہ حسبِ دستور اچھا تھا۔ بجلی جاتی زیادہ آتی کم تھی۔ اس لیے لالٹین کا انتظام تھا۔ سردی دور کرنے کے لیے آتش دان میں شہتوت اور اخروٹ کی لکڑی جلائی جاتی تھی۔ کمرے میں گرم پانی کے لیے بھی مناسب انتظام تھا۔ ہوٹل میں دو بیرے تھے۔ اکبر اور علی بے حد مہذب اور صاف ستھری اردو بولتے۔

اکرم خان بلتی نے ان سے کہا جب ہم کمرے میں ہوں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر معلوم کریں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے کال بیل کام نہیں کرتی تھی۔ ابھی حکم کے غلام نکلے ہم جب کمرے میں ہوتے ذرا ذرا دیر بعد علی اور اکبر دروازہ کھٹکھٹاتے۔

''کچھ چاہیے۔''

ہم بھی ہر بار کچھ نہ کچھ منگوا لیتے۔

چھری لا دو

نمک دانی درکار ہے

کالی مرچ ہوگی؟

چائے لے آؤ۔

گیارہ بجے کے بعد روم سروس بند ہو جاتی۔ اکبر جاتے وقت تھرماس بھر کر گرم چائے دے جاتا۔ جی چاہا تو پی لی ورنہ صبح پھینک دیتے۔ ایک شام باہر نکلنے کو جی نہ چاہا سردی بے حد تھی ہوٹل میں رات کے کھانے کا پروگرام بنایا۔ اکبر کو بلا کر پوچھا۔

''کھانے میں کیا ہے؟''

اس نے میز سے اٹھا کر مینو دیا۔

''جو پسند کریں۔''

ہم نے کھانوں کی فہرست دیکھی۔ ہر قسم کے موجود تھے۔

''چکن کڑھائی ہے؟''

''جی۔''

''ہم ریسٹورنٹ آرہے ہیں۔''

''جی صاحب۔''

اکبر چلا گیا۔

گرم نان ایک بڑی نعمت ہے۔ سوچا ریسٹورنٹ میں بیٹھ جائیں گے۔ کمرے تک آتے آتے ٹھنڈے ہو جائیں گے اس لیے ہمت کر کے کمرے سے نکلے اور چند گز کے فاصلے پر ریسٹورنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ یہاں سردی تھی۔ پورا ہال خالی تھا۔ ہم ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ علی نے جلدی سے تیل کا چولہا ہماری میز کے نیچے رکھوا دیا۔ اس میں خاصی تپش تھی۔

ہمیں بیٹھے ذرا دیر ہوئی تو اکبر کو بلا کر کھانا لانے کے لیے کہا۔

''جی صاحب'' اس نے جواب دیا اور چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں گرم گرم چکن کڑھائی آگئی تب معلوم ہوا۔ جب ہم نے آرڈر دیا، فریج سے مرغی نکال کر اس کی بوٹیاں بنائی گئیں۔ ٹماٹر، ادرک، لہسن، پیاز، وہی اسی وقت ڈال کر چکن کڑھائی پکائی گئی۔ اچھا ہوا چکن لینے شہر

نہیں گئے۔

نان گرم تھے۔ چکن کڑھائی چٹ پٹی تھی لطف آیا ہم نے پوچھا ''سوئیٹ ڈش میں کیا ملے گا۔''

اکبر نے مینو کارڈ دیا۔ ہم نے جیلی کریم کا آرڈر دیا۔

ذرا دیر میں ایک بڑے پیالے میں جیلی آگئی اس پر گاڑھا دودھ تھا۔ ہم نے ایک چمچہ کھایا۔ اچھی تھی۔ اکبر کو بلا کر پوچھا۔

''کیسے بنائی؟''

وہ کاؤنٹر پر گیا اور ایک بوتل لے آیا جس پر لکھا تھا ''فرنٹ جیلی'' اس نے آدھی بوتل ہمارے پیالے میں ڈال دی تھی۔

ہم اس حسن انتظام پر بے حد خوش ہوئے۔

گلگت میں ''ترکیب'' ضرورت کی ماں کا احساس ہوا۔ ہوٹل آرام دہ، انتظام تسلی بخش۔

چند دن میں احساس ہوا۔ اس جگہ سے اکبر اور علی سے پرانی جان پہچان ہے۔ جب واپس آئے کئی دن تک وہ نظر آتے رہے۔ قراقرم اور نانگا پربت کے سائے تلے صاف صحت مند چہروں والے مودب اردو بولتے نوجوان۔

محبت کا گھر

ریڈیو پاکستان گلگت کا براڈ کاسٹنگ ہاؤس نیا ہے باہر سے ایک عمارت اور اندر ایک دنیا آباد ہے۔ زبان فن و ثقافت تہذیب و تمدن کی۔ یہاں ایک خاندان آباد ہے۔ جس میں صدا کار، فنکار ہیں۔ یہ شینا، بلتی، بروشکی اور اردو میں پروگرام نشر کرتے ہیں لیکن ان کی ایک مشترکہ زبان ہے جسے ''محبت کہتے ہیں۔''

گلگت کے باغوں وادیوں میں میٹھے شہتوت، لذیذ خوبانیاں، ذائقہ دار اخروٹ اور سیب پیدا ہوتے ہیں ان سب کی مٹھاس اس علاقے میں رہنے والوں کے لہجے میں بھی جھلکتی ہے۔

اکرم خان بلتی کے دفتر میں سب جمع تھے۔ موسموں سے لڑنے والے، حالات کا مقابلہ کرنے والے۔ فن کے لیے مشکل اٹھانے والے۔

خانزادہ عبدالسلام سے ملاقات ہوئی یہ انجینئر تک نیچبر ہیں۔ ہماری ان سے پرانی جان پہچان تھی۔ نفاذ

حسین اکاؤنٹ آفیسر ہیں۔ مستعد باصلاحیت پروڈیوسر، اناؤنسر، صداکار، اکرم خان کے دفتر میں سب جمع تھے سوکھے خوبانی کے ٹکڑے، شہتوت، اخروٹ اس کے ساتھ نمکین چائے، عجب لطف دے رہی تھی۔

گلگت میں موسم ٹھٹھرا ہوا تھا۔ کسی وقت بھی برف باری ہوسکتی تھی لوگ عادی ہیں۔ اپنے ساتھ موٹے گرم کوٹ لمبی ٹوپیاں رکھتے ہیں۔

ہم جانتے تھے یہاں وسائل کی کمی ہے۔ جو لوگ گرم علاقوں میں رہتے ہیں۔ ان کے حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔ پروگراموں کے لیے عملہ کم ہے لیکن کسی کی زبان پر حرف شکایت نہیں۔ کوئی مطالبہ نہیں صبر شکر کر کے کام کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی ''آہنگ'' کے خصوصی شمارے کے لیے مضامین، تصاویر، بیانات، اشتہارات کی فائل تیار تھی۔ ریڈیو پاکستان گلگت نے اس علاقے میں بہت کام کیا ہے۔ فن کار۔ صدا کار پیدا کیے ہیں۔ لوگوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ انہیں لکھنے، بولنے کی طرف راغب کیا ہے۔ شینا زبان کی حلاوت اور شیرینی سے ایک زمانے کو متعارف کرایا ہے۔

ہم محبت کرنے والوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی وہ ہماری دعوت کرے اگر ان سب کی خواہش پوری کریں تو ہفتوں یہاں رہنا ہوگا۔

اکرم خان بلتی نے مشورہ دیا۔ ایک دعوت کرتے ہیں اس میں سب شامل ہو جائیں۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی۔

خانزادہ عبدالسلام نے بتایا نشریات جب راولپنڈی سے نشر ہوتی تھیں نانگا پربت راستے میں حائل ہو جاتا۔ لوگوں کو شکایت تھی آواز صاف نہیں سنائی دیتی۔ نانگا پربت خود ہی سنتا اور کسی طرح دوسروں تک آواز پہنچنے نہیں دیتا۔ اس لیے گلگت میں ریڈیو کی ابتداء ہوئی۔ نانگا پربت اب کچھ نہیں کر سکتا۔ باہمت انسانوں کے سامنے کوئی صحرا، سمندر، طوفان نہیں آسکتا۔ یہاں کے لوگ بہادر ہیں۔ موسموں سے لڑ کے زندہ رہتے ہیں۔

اس دلچسپ سفرنامے کی سنسنی خیز روداد اگلے ماہ کی اشاعت میں ملاحظہ فرمایئے۔

بخت نامہرباں میرا تھا

نازیہ بتول رضا

اُس جوڑے کی داستانِ محبت، جنھیں کہانی کا تیسرا کردار برباد کر گیا

سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا ہے۔ رات اپنے پر پھیلا رہی ہے اندھیرے کا عفریت لمحہ بہ لمحہ میری جانب بڑھ رہا ہے۔ جیسے جیسے اندھیرا بڑھ رہا ہے میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ کانوں میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی ہے۔ اس سیلن زدہ کوٹھڑی میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں باہر نکلنا چاہتا ہوں لیکن مجھے کون باہر نکالے گا؟ باہر کی دنیا میں اب کون میرا منتظر ہے؟ سوائے میری بوڑھی ماں کے جو میرے لیے تڑپ رہی ہے لیکن کچھ نہیں کر پا رہی اور وہ کر بھی کیا سکتی ہے سوائے رونے اور تڑپنے کے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کاش اور بچوں کی طرح میں بھی پیدا ہوتے ہی مر گیا ہوتا۔ کتنے ہی بچے روز پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ بڑے خوش بخت ہوتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں آتے تو ہیں لیکن اس دنیا کے مکروفریب سے بچ جاتے ہیں۔ زندگی کے دکھ اٹھانے سے بچ جاتے ہیں۔ میری طرح راندۂ درگاہ نہیں ہوتے، میری طرح زندگی کو بوجھ کی مانند نہیں ڈھوتے لیکن میری زندگی میں، میں نے کسی کے ساتھ غلط نہیں کیا۔ بچوں کے ساتھ ایک شفیق باپ رہا اور بیوی کے ساتھ...... بیوی کے ساتھ بھی تو بہت محبت کی لیکن اسے میری سچی محبت راس نہ آئی۔ کچھ لوگوں کو سچی محبت راس کیوں نہیں آتی جیسے میری بیوی کو نہیں آئی اور وہ میری سچی محبت کو ٹھکرا کر چلی گئی۔ میری زندگی کو اندھیروں میں دھکیل کر...... آہ اب ساری زندگی مجھے صرف جلنا ہے، کڑھنا ہے اور بس خاموشی سے اپنی موت کا انتظار کرنا ہے۔ ٹھہریے آپ الجھ رہے ہیں ناں میری الجھی الجھی باتیں سن کر میں کیا کروں، میں بھی اپنی زندگی کے جال میں الجھ کر رہ گیا ہوں میں شروع سے اپنی زندگی کے بارے میں بتاتا ہوں۔

☆......☆

میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں ہیں میرا نمبر سب سے آخری ہے۔ گھر میں سب کی شادی ہو چکی تھی اور حسبِ روایت سارے بھائی شادی کے بعد اپنے الگ گھر میں جا بسے تھے۔ ابو کا اپنا کاروبار تھا یعنی ہماری دودھ کی دکان تھی جس پر میں اور ابو بیٹھا کرتے تھے۔ تعلیم کا کوئی خاص شوق نہ تھا تو صرف میٹرک ہی کر کے ابو کے ساتھ دکان سنبھال لی۔ ابو نے بھی مزید تعلیم کے لیے زور نہ دیا۔



زندگی روٹین کے مطابق چل رہی تھی کوئی فکر نہ تھی کہ ایک دن ایسا آیا کہ میری پرسکون زندگی میں ہلچل مچ گئی۔

ہوا یوں کہ میں معمول کے مطابق دکان پر تھا۔ دوپہر کا وقت تھا ابو کھانا کھانے گھر گئے تھے۔ میں اکیلا تھا کہ وہ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ وہ اسکول سے واپس آرہی تھی۔ شدید گرمی کے دن تھے اور دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے چہرے پر شبنم کے قطرے دکھائی دیتے تھے۔ میں بڑی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا جی چاہ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے آجائے اور میں قریب سے اسے دیکھ سکوں، بہت دیر تک

اور شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی کہ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ میری دکان پر چلی آئی۔

''پلیز ایک کولڈ ڈرنک دیجیے گا۔'' وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ میں نے یخ ٹھنڈی بوتل نکال کر اسے دی۔ میں ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھا وہ مجھے پیسے دے رہی تھی اور میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے کاؤنٹر بجا کر متوجہ کیا۔

''پیسے لے لیجیے۔'' میری محویت ٹوٹی تو مجھے شرمندگی نے آگھیرا میں نے جلدی سے پیسے لیے اور وہ چلی گئی۔ اس کی سہیلی ہنس رہی تھی۔ شاید اس نے میری محویت نوٹ کرلی تھی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا کہ مجھے کیا ہوگیا تھا۔ ٹھیک ہے وہ لڑکی مجھے اچھی لگی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر تکنے لگ جاؤں...... یہ تو بری بات ہے۔ اگر اس حرکت کو نوٹ کرکے اس نے برا مان لیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھے سب کے سامنے ذلیل بھی کرسکتی ہے یا پھر...... یا پھر اگر اس نے میری دکان پر آنا ہی چھوڑ دیا تو کیا ہوگا؟ نہیں نہیں میں آئندہ خیال رکھوں گا۔

لیکن اگلے دن میری ساری ملامتیں اور حفاظتی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں۔ جب اس کے آنے کا ٹائم ہوا میری نظریں غیر ارادی طور پر اس راستے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ جس راستے سے وہ آتی تھی یہ مجھے کیا ہورہا ہے؟ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میرا دل بڑا بے چین ہورہا تھا۔ اسے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی تھیں۔ میں بے چین ہوکر دکان سے باہر آکر ٹہلنے لگا، یکدم وہ سامنے سے آتی دکھائی دی اور

میرے دل کو جیسے قرار آ گیا۔ میں بے خود ہو کر اسے دیکھے گیا۔ سینے پر ہاتھ باندھے میں اپنی دکان کے سامنے کھڑا تھا کہ وہ گزرتی ہوئی چلی گئی۔ اس نے میری جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک گاہک کے آنے سے میری محویت ٹوٹی۔ گاہک کو فارغ کر کے میں اپنے دل کو ٹٹولنے لگا کہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میں کیوں اس لڑکی کے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔ میں جسے جانتا بھی نہیں کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے اور پتا نہیں وہ میری محبت کو قبول کرے گی بھی یا نہیں۔ کیا مجھے محبت ہو گئی ہے؟ اور پھر دل نے زور زور سے دھڑک کر اس کی محبت کا اقرار کر لیا۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا جو ہر دم اسی کا راگ الاپ رہا تھا۔

پھر کافی سارے دن گزر گئے۔ میری بے قراری دن بدن بڑھتی گئی۔ وہ روزانہ میری دکان کے سامنے سے گزرتی بھی زیادہ گرمی ہوتی تو وہ رک کر کولڈ ڈرنک یا جوس لے لیتی اور چلی جاتی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ کاش گرمی ہی رہے تا کہ اس کے آنے کا ایک بہانہ بنا رہے لیکن کب تک..... گرمی کو تو جانا ہی تھا لیکن اتنے دنوں میں مجھے اس کا نام پتا چل گیا تھا۔ اس کی سہیلی نے اسے نام لے کر پکارا تھا۔

مہوش تھا اس کا نام۔ اتنے عرصے میں مہوش میرے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ میں اسے پانے کو بے تاب تھا۔ میرے گھر میں تو سب شادی شدہ تھے۔ اب میرا ہی نمبر تھا اور شاید کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ میرے والدین آسانی سے مان جاتے لیکن مسئلہ اس کا اور اس کی فیملی کا تھا۔ نجانے وہ مجھے پسند کرتے یا نہ کرتے بہر حال سوال بہت تھے اور جواب کچھ نہیں۔

میں نے ایک دن غیر محسوس طریقے سے پیچھا کر کے مہوش کا گھر پتا لگا لیا اور اپنی اس پہلی کامیابی پر میں بہت خوش تھا۔ اب مجھے اپنی امی سے بات کرنی تھی کہ اس معاملے میں ان کی کیا رائے ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے جب اپنے دل کی بات امی سے کہی تو وہ خوش ہو گئیں اور بولیں۔

''میں تو خود کب سے چاہ رہی تھی کہ کہیں تیری بات پکی کر دوں۔ اچھی سی لڑکی دیکھ کر! لیکن اب تُو نے خود پسند کر لی تو میری مشکل آسان ہو گئی پھر اب کب جاؤں رشتہ لے کر۔'' امی کے منہ سے رضامندی سن کر میرے تو دل کی مراد بر آئی میں نے کہا۔

''امی جب آپ مناسب سمجھیں ابو کے ساتھ چلی جائیں۔'' اور پھر اسی اتوار کو امی ابو میرا رشتہ لے کر مہوش کے گھر پہنچے۔

☆......☆

میرا نام مہوش ہے اور میرا تعلق ایک متوسط طبقے سے ہے۔ ہم چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں دسویں جماعت میں تھی اسکول نزدیک تھا تو سہیلیوں کے ساتھ پیدل ہی آنا جانا ہوتا تھا۔ کچھ دنوں سے میری سہیلیاں بتا رہی تھیں اور میں خود بھی نوٹ کر رہی تھی کہ وہ لڑکا مجھے آتے جاتے دیکھتا تھا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا لیکن اب تک اس نے سوائے دیکھنے کے اور کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اس لیے میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا لیکن ایک دن اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ اتوار کے دن جب ابو گھر میں تھے اس لڑکے نے اپنے والدین کو رشتہ لے کر بھیجا لیکن جب بات چیت ہوئی اور پتہ چلا کہ وہ لوگ ذات کے قریشی ہیں اور ان کا دودھ کا کاروبار ہے تو میرے والدین نے اسی وقت منع کر دیا اور وہ لوگ نامراد لوٹ گئے۔

☆......☆

امی ابو کو مہوش کے گھر بھیج کر مجھ سے وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ لمحہ لمحہ بھاری گزر رہا تھا۔ بالآخر امی ابو آ گئے لیکن ان کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر میں بالکل ڈھے گیا، پھر بھی اک ہلکی سی امید کے سہارے امی سے پوچھا تو امی نے بتایا کہ انھیں ہماری ذات اور کاروبار سے تکلیف ہے اور انھوں نے منع کر دیا ہے۔''

''امی ہم کاروبار بدل بھی سکتے ہیں مطلب میں کچھ اور کام کر لوں گا۔'' میرے لہجے میں بے چینی، اضطراب اور نجانے کیا کیا تھا امی نے نظریں اٹھا کر

مجھے دیکھا اور کہا۔

"جیسے تیری مرضی بیٹا، میں تیری مرضی پہ خوش ہوں۔" میں امی کے گلے لگ گیا۔

پھر میں نے ابو سے مشورہ کر کے تھوڑی تگ و دو کے بعد اپنی بیکری کھول لی جس پر صبح ناشتے میں حلوہ پوری بکنے لگی۔ میں نے سوچا اب رشتہ بھیجوں مجھے مہوش کا جنون ہو گیا تھا۔ اسے پانے کے لیے میں سب کچھ کر سکتا تھا پھر جب تقریباً چار ماہ بعد دوبارہ رشتہ بھیجا تو انھوں نے سوچنے کا وقت مانگا۔ نجانے امی نے کون کون سے واسطے دیے ہوں گے۔ کیونکہ امی میری محبت دیکھ رہی تھیں یہ سب بھی انھوں نے کس طرح کیا ہوگا۔ یہ سن کر کہ انھوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔ مجھے اک مدھوم سی امید ہو چلی تھی۔ کہ شاید اب میرے خوابوں کو تعبیر مل گئی۔ میں اپنے کام میں اور محنت کرنے لگا تھا اور رب سے گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتا تھا کہ یارب مجھے مہوش مل جائے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

اے کاش کہ اس وقت میں مکمل دعا مانگتا مہوش کے ساتھ ساتھ پرسکون زندگی بھی مانگتا تو آج یوں تہی دست نہ ہوتا لیکن انسان بڑا ناشکرا ہے اس کو جتنی بھی نعمتیں عطا کر دی جائیں۔ وہ ہمیشہ مزید کی طلب کرتا ہے۔ چاہے وہ اس کے لیے برا ہی کیوں نہ ہو، بس اسے اپنی مرضی کی ہر چیز چاہیے۔ وہ کوئی بات پروردگار پر نہیں چھوڑتا جو خالق کائنات ہے جو ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے بس انسان تو ضد پر اڑ جاتا ہے جیسے میں اڑ گیا تھا۔ مجھے اس وقت مہوش کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں امی کو بار بار مہوش کے گھر بھیجتا۔

بالآخر بڑی منتوں مرادوں کے بعد میرا رشتہ منظور کر لیا گیا۔ اس دن میں بہت خوش تھا جیسے میرے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ گیا ہو۔ میں نے پوری مارکیٹ والوں کو مٹھائی کھلائی اور دوستوں کو ٹریٹ دی۔

جلد ہی مہوش میرے گھر دلہن بن کر آ گئی۔ میں مہوش کے خوب ناز نخرے اٹھاتا۔ سے ہنی مون پر لے گیا۔ ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کروائی۔ کیونکہ مہوش کو شاپنگ کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر سوٹ کے ساتھ پرس، سینڈل اور جیولری میچنگ کی لیتی۔ امی نے دبے لفظوں میں سمجھایا کہ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے گا۔ تھوڑی میانہ روی اختیار کرو۔ لیکن میں تو مہوش کے عشق میں پاگل ہو چکا تھا۔

☆......☆

وہ لڑکا اسد تو جیسے میرا دیوانہ ہو چکا تھا اس کے والدین نے میرے گھر کی دہلیز پکڑ لی۔ حتیٰ کہ میرے چڑنے پر اپنا کاروبار بھی بدل ڈالا۔ اب منع کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو میرے والدین نے بھی ہاں کر دی۔ اصل میں مجھے اور میرے والدین کو ایسے ہی لڑکے کی ضرورت تھی جو مجھ پر لٹو ہو جائے اور میرے لیے سب کر گزرے۔ مجھے جی حضوری کی عادت نہیں تھی بہت ضدی اور خودسر تھی میں۔

بہرحال شادی ہو گئی اور میں نے اسد کو اپنے اشاروں پر نچانا شروع کر دیا۔ میں جیسا کہتی وہ ویسا ہی کرتا، وہ تو جیسے دیوانہ تھا میرا۔

میں ڈھیروں پیسے شاپنگ پہ خرچ کرتی۔ آئے دن باہر ڈنر کی فرمائش کرتی اور اسد بلا چون چرا میری ہر خواہش پوری کرتا۔ میری ساس بہت اچھی تھیں گھر کا زیادہ تر کام بھی خود ہی کرتیں۔ بس وہ مجھے اور اسد کو میانہ روی کا درس دیتیں تو میں چڑ جاتی تھی اور اسد سے منہ پھلا لیتی۔ وہ اپنی امی کو سمجھاتا اور مجھے باہر ڈنر کرواتا، شاپنگ کرواتا اور میں راضی ہو جاتی۔ ان ہی حالات میں دو بچے ہو گئے۔ شایان اور ہانیہ لیکن میری عادتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ ساس نے بچوں کے بعد زیادہ سمجھانا شروع کیا تو میں نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆

مہوش کی عادتیں بہت بگڑی ہوئی تھیں کبھی کبھی اس کی فضول خرچیاں دیکھ کر میں بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ اس طرح کیسے زندگی کی گاڑی چلے گی۔

امی نے زور و شور سے سمجھانا شروع کیا تو مہوش کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے دوبدو لڑنا شروع کر دیا۔ گھر جو کبھی خوشیوں کا گہوارہ تھا جنگ کا میدان بن گیا، میں تنگ آ گیا تھا اس روز روز کی چخ چخ سے۔ مہوش نے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تو میں نے منع کر دیا، لیکن امی نے کہا کہ جاؤ الگ ہو کر شاید اسے آٹے دال کا بھاؤ پتا چلے اور یہ سدھر جائے۔''

میں نے امی کی بات مان لی اور ایک کرائے کے گھر میں شفٹ ہو گیا لیکن مہوش کی عادتوں میں رتی برابر فرق نہ آیا بلکہ اب تو بچوں کے ساتھ اس کے خرچے بہت بڑھ گئے تھے۔ میں بہت پریشان تھا۔ میری آمدنی کم تھی اور خرچہ زیادہ تھا، میں کیسے پورا کرتا اور اب تو گھر بھی کرائے کا تھا۔ مہوش کو کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ وہ اپنے خرچے کسی طور پر کم کرنے پر راضی نہ تھی۔ بلکہ مجھے کہتی کہ اپنی آمدنی بڑھاؤ ان پیسوں میں میرا گزارہ مشکل ہے۔ میں پریشان ہو کر ہر جائز ناجائز کام کرنے لگا۔ جیسے تیسے کچھ پیسوں کا انتظام کیا تاکہ نئے کاروبار میں انویسٹ کر سکوں ایک جاننے والے نے بتایا کہ فلاں بندے کے ساتھ شراکت میں کاروبار کر لو میں میٹنگ کروا دیتا ہوں۔ میں راضی ہو گیا، بس یہیں سے میری بربادی کے دن شروع ہوئے۔ میں نے اس آدمی سے مل کر نئے کاروبار کے لیے اسے رقم تھما دی۔

☆......☆

الگ گھر میں شفٹ ہو کر میں نے سکون کا سانس لیا میں کیا کرتی۔ میں بغیر شاپنگ کے رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اب میں دل کھول کے اپنے ارمان پورے کرتی، مجھے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا لیکن میرے خرچوں کے حساب سے اسد کی آمدنی کم تھی۔ میں اسے آمدنی بڑھانے کے لیے نئے کاروبار کی طرف مائل کرتی اور وہ نئے کاروبار کے لیے پیسوں کے انتظام میں جت گیا۔ مجھے نہیں پتا اس نے کیسے پیسوں کا انتظام کیا۔ مجھے تو بس اپنے خرچے پورے کرنے کے لیے بہت ساری رقم ہر مہینے چاہیے تھی اس کاروبار سے تو لگی بندھی آمدنی ہوتی تھی جو میرے اور بچوں کے لیے ناکافی تھی اب نئے کاروبار سے مزید پیسوں کی امید بندھ گئی تھی۔

☆......☆

میں نے جس آدمی کو رقم دی تھی وہ میری رقم ہڑپ کر گیا اور سارا منافع خود رکھنے لگا۔ مجھے کہتا کاروبار میں نقصان ہو گیا ہے اتنی آمدنی نہیں ہے کہ دو بندوں کے خرچے نکال سکوں۔ تھوڑا کاروبار جمنے دو۔

میں اس کی باتوں میں آ گیا اور تھوڑا انتظار کیا لیکن کب تک آخر میں نے پیسوں کے لیے تو نئے کاروبار میں انویسٹمنٹ کی تھی لیکن اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مہوش بار بار مزید پیسوں کا تقاضہ کر رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں جان بوجھ کر اسے پیسے نہیں دے رہا ہوں۔ بالآخر میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ وہ آدمی فراڈ نکلا۔ اب ہمیں اس سے اپنے پیسے واپس لینے ہوں گے۔

لیکن کیسے؟ یہ ایک سوالیہ نشان تھا مہوش نے اپنے ماموں کے دوست کا نام لیا۔

☆......☆

جب کاروبار شروع ہونے کے بعد بھی مجھے پیسے کم ملے تو میں یہی سمجھی کہ اسد مجھے کم پیسے دے رہا ہے۔ میں بھنا اٹھی اور اس سے جھگڑنے لگی۔ تب اسد نے بتایا کہ دراصل وہ آدمی ہمارے پیسے ہڑپ کر چکا ہے۔ اب ہمیں اس سے اپنے پیسے نکلوانے تھے لیکن اسد کے لیے یہ ناممکن تھا۔ یکایک مجھے اپنے ماموں کے دوست کا خیال آیا جو کہ وکیل تھے اور بہت پیسے والے تھے۔ وہ ہماری مدد کر سکتے تھے۔ میں نے جھٹ سے اسد کو ان کے بارے میں بتا دیا۔

☆......☆

''تم کیسے جانتی ہو اس آدمی کو؟'' میں نے مہوش سے پوچھا کیونکہ اس سے پہلے اس نے ایسے کسی آدمی کا ذکر نہیں کیا تھا۔

''ارے بھئی میرے ماموں کے دوست ہیں۔ تم ان سے ملو اور اپنا مسئلہ بیان کرو، مجھے امید ہے کہ

وہ یقیناً اس معاملے میں ہماری کوئی مدد کریں گے۔"
مہوش نے وثوق سے کہا تو میں بھی اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ مہوش تیار ہونے لگی۔ پھر ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ بچے ٹیوشن گئے ہوئے تھے اس لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ہم بے فکر ہو کر آ جا سکتے تھے۔

ہم جب ان کے گھر پہنچے وہ اسی وقت آفس سے گھر آئے تھے۔ عجیب بدصورت آدمی تھا، کالا، گنجا اور بڑی سی توند، کہیں سے بھی وکیل نہیں لگ رہا تھا۔ میں جو اپنے ذہن میں بہت اچھا Image لے کر گیا تھا چکنا چور ہو چکا تھا، بہرحال مجھے اس کی صورت سے کیا لینا تھا۔ مجھے تو اپنا کام نکلوانا تھا بلکہ میرے برعکس مہوش بڑی متاثر تھی۔ میں جانتا تھا کہ مہوش اس کی دولت سے مرعوب ہے۔ اس کا سجا سجایا ڈرائنگ روم، بہترین فرنشڈ بنگلہ اسے مرعوب کر رہا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر اس آدمی (جس کا نام پرویز تھا) سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہم اپنا مسئلہ بتا چکے تھے جس پر پرویز نے ہمیں تسلی دی تھی کہ ہمارا کام ہو جائے گا۔

میں وہاں سے اب جلد از جلد نکلنا چاہتا تھا لیکن مہوش کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ پرویز کی بیوی سے باتوں میں لگی تھی۔ میں نے کہا۔

"مہوش میرا خیال ہے ہمیں نکلنا چاہیے، بچے بھی ٹیوشن سے آنے والے ہیں۔"

"ارے بھئی اب کھانا کھا کر جائیے گا۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" پرویز مہوش کو دیکھتے ہوئے بولا۔ اور مجھے اس کی نظروں سے گھن آ رہی تھی۔ ایسے مہوش کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے نگل جائے گا، اس لیے میں وہاں سے جلد از جلد جانا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں مہوش یہ سب نوٹ کر رہی تھی یا پھر جان بوجھ کر انجان بنی ہوئی تھی۔ خلاف توقع مہوش بولی۔

"نہیں نہیں پھر کبھی ابھی ہمیں واقعی دیر ہو رہی ہے۔ بچے آتے ہی ہوں گے۔"

"مجھے امید ہے انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔" پرویز ہاتھ تو مجھ سے ملا رہا تھا لیکن نظریں مہوش پر تھیں۔ میں جل کر رہ گیا۔

"جی انشاء اللہ ضرور آپ اپنا نمبر دے دیجیے تاکہ رابطہ ہو سکے۔" مہوش مسکراتے ہوئے بولی تو اس نے جھٹ سے اپنا کارڈ مہوش کو تھما دیا۔ مہوش نے پرس میں رکھ لیا اور پھر ہم نکل گئے۔ میں بہت غصے میں تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس کی نظریں یاد آ رہی تھیں اور میں دل ہی دل میں اسے گالیاں دے رہا تھا جبکہ مہوش اس کے گھر کے قصیدے گا رہی تھی۔ اس کی تعریفیں کر رہی تھی۔

"پرویز صاحب بہت اچھے انسان ہیں، مجھے یقین ہے وہ ہمارا کام ضرور کر دیں گے۔"

"مجھے تو یہ پرویز صاحب ایک آنکھ نہیں بھائے۔"

"کیوں؟"

"تم نے دیکھا نہیں کیسے گھور گھور کر تمہیں دیکھ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا شوٹ کر دوں۔" میں نے اپنے دل کا غبار نکالا تو مہوش کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی مجھے اور تپا گئی۔

"ہنس کیوں رہی ہو؟"

"تمہاری سوچ پر۔"

"کیوں میری سوچ کو کیا ہوا ہے؟"

"ارے بھئی اچھی چیز کو ہر کوئی دیکھتا ہے، تمہیں تو فخر ہونا چاہیے کہ تمہاری بیوی کو لوگ دیکھتے ہیں۔" اس کی عجیب منطق تھی۔

"جی نہیں مجھے ایسی فالتو باتوں پر کوئی فخر نہیں ہوتا اور ہاں تم بھی آئندہ اس شخص سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی سمجھیں تم۔" میں نے غصے سے کہا۔

"پھر وہ پیسے کیسے واپس ملیں گے جو تم نے اپنی بے وقوفی سے گنوا دیے۔"

"بھاڑ میں جائیں پیسے۔ بس اب ہم کبھی اس شخص سے رابطہ نہیں کریں گے۔"

"ارے ایسے کیسے ہم کسی پر اپنے پیسے چھوڑ دیں مجھے وہ پیسے لازمی واپس چاہئیں اور اس کے لیے میں کچھ بھی کر دوں گی۔"

"مہوش میری بات کو سمجھو۔"

"تم میری بات کو سمجھو۔" مہوش نے کہہ کر مجھے

چپ کروادیا میں بھی وقتی طور پر خاموش ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ جب میں لے کر ہی نہیں جاؤں گا تو مہوش کیسے جائے گی۔ میں خود ہی کوئی رابطہ نہیں کروں گا تو پرویز بھی یاد نہیں رکھے گا۔ اس کو کیا پڑی ہے کہ ہمارے مسئلے میں ٹانگ اڑائے، اس لیے میں مطمئن ہوگیا اور یہی میری غلطی تھی۔

☆......☆

پرویز صاحب کو اپنا مسئلہ بتا کر میں مطمئن ہو چکی تھی، میں جانتی تھی کہ وہ میرا مسئلہ ضرور حل کریں گے کیونکہ وہ پہلے ہی مجھ پر لٹو تھے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت میں نے انکار کر دیا تھا۔ صرف ان کی شکل وصورت اور عمر دیکھ کر۔ وہ تو ابھی بھی مجھ پر فدا ہو رہے تھے۔ اپنی بیوی اور میرے شوہر کا لحاظ کیے بنا مجھے گھورے جا رہے تھے اور اسد نے یہ بات محسوس کرلی تھی اور مجھے سختی سے منع بھی کر دیا کہ میں اب اس شخص سے رابطہ نہ رکھوں لیکن میں کسی بھی طرح وہ پیسے نکلوانا چاہتی تھی جو وہ فراڈ آدمی ہڑپ کر چکا تھا۔ اگر پرویز مجھے دیکھتا ہے تو کیا حرج ہے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ اس لیے میں چھپ کر پرویز سے رابطہ رکھنے لگی۔

ابھی اس بات کو چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ اسد نے میرے موبائل میں پرویز کا نمبر دیکھ لیا جو کہ میں نے خود ہی Save کیا تھا۔ اس بات پر اسد نے مجھے کافی باتیں سنائیں اور ہمارے بیچ کافی تو تو میں میں ہوئی پھر وارننگ دے کر اسد نے بات ختم کر دی۔

پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ پرویز میرے گھر چلے آئے اس وقت میں گھر میں اکیلی تھی۔ بچے اسکول میں تھے اور اسد دکان پر تھے۔ نجانے پرویز نے یہ وقت کیوں منتخب کیا۔ میں ان کو سامنے دیکھ کر چونک گئی۔ گھر میں بلانا بھی مشکل تھا اور باہر سے روانہ کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں شش و پنج میں مبتلا تھی کہ بلاؤں کہ نہ بلاؤں کہ وہ بالکل نزدیک چلے آئے اور بولے۔

''اندر نہیں بلاؤ گی؟''

اور میں ایک دم راستے سے ہٹ گئی اور وہ اندر آگئے میں بولی۔

''اصل میں ابھی کوئی گھر میں نہیں ہے میں اکیلی ہوں۔'' میں سمجھی یہ سن کر وہ چلے جائیں گے مگر وہ ڈھٹائی سے آگے بڑھ گئے۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، سکون سے بات ہو جائے گی۔'' وہ سکون سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

میں بہت ڈر رہی تھی اسد کسی بھی وقت گھر میں آ سکتا تھا کیونکہ وہ اسی وقت ناشتا کرتا تھا میرے ساتھ گھر پر۔ اور اس کے پاس گھر کی چابی بھی موجود تھی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

☆......☆

ایک دن میں نے یونہی مہوش کا فون اٹھایا تو ڈائل میں پرویز کا نمبر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ پھر میں نے ریسیو کالز بھی چیک کیں تو وہاں بھی مجھے پرویز کا نمبر نظر آیا۔ میں غصے سے کانپ اٹھا کہ مہوش میں میرے منع کرنے کے باوجود اس غلیظ آدمی سے رابطہ رکھا اور مجھ سے یہ بات چھپائی۔ میں نے مہوش کو بہت باتیں سنائیں۔ مہوش ناراض ہوگئی تو پھر میں نے خود ہی اسے منالیا لیکن ایک دن تو میں خود پر کنٹرول ہی نہیں کرپایا اور سب کچھ ختم ہوگیا۔

کاش کہ وہ منحوس دن ہماری زندگی میں آیا ہی نہ ہوتا جس نے میری زندگی کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ہوا یوں کہ اس دن میں ناشتا کرنے کے لیے گھر پہنچا کیونکہ میں ناشتا گیارہ بجے مہوش کے ساتھ ہی کیا کرتا تھا اور چونکہ چابی میرے پاس موجود ہوتی تھی تو میرے پاس موجود چابی سے میں نے دروازہ کھولا تو اندر سے کسی مرد کی آواز سنائی دی میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ پرویز رخصت ہو رہا تھا اور مہوش کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اس نے جلدی سے چھڑایا۔ مجھے ایک دم سامنے دیکھ کر مہوش ہکا بکا رہ گئی اور میرے حواس بھی معطل ہو چکے تھے۔ میرے ذہن میں شک کا ناگ جو سویا تھا پھر سے بیدار ہوگیا اور اس نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مہوش کو ایک

تھپڑ جڑ دیا مہوش سن رہ گئی۔
"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ کب سے چل رہا ہے یہ سب؟" میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ میرے بھروسے کا خون ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی مہوش پرویز کو اکیلے گھر میں بلائے گی۔ نجانے میری پیٹھ پیچھے دونوں کے بیچ کیا چل رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ دونوں کا گلا دبا دوں۔
"دیکھو تم غلط کر رہے ہو۔" پرویز نے بس اتنا کہا میں نے اس کا بھی گریبان پکڑ لیا۔
"کیا غلط اور کیا صحیح اب تو مجھے سکھائے گا۔ میری غیر موجودگی میں میری بیوی کے ساتھ کیا کر رہا تھا تو۔"
"میرا گریبان چھوڑو، تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں۔ تمھیں اندر کروا دوں گا تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔"
وہ دھمکیوں پر اتر آیا اور میرا پارہ اور ہائی ہو گیا مہوش بھی سب بھول کر بیچ بچاؤ کروانے لگی۔ اسے اب بھی مجھ سے زیادہ پرویز کی عزت کا خیال تھا۔ میں پرویز کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا پیچھے سے مہوش مسلسل چیخ رہی تھی۔
"اسد انھیں چھوڑ دو ان کی کوئی غلطی نہیں ہے میں...... میں نے ہی انھیں بلایا تھا۔"
بس مہوش کے منہ سے اتنا سننا تھا کہ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح پرویز کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ اپنا گریبان ٹھیک کرتا مجھے دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا لیکن مجھے کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں تو بس مہوش کو حیرت سے تک رہا تھا۔ اس نے کیسے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ کہتے ہیں محبت کی کشتی میں شک پہلا سوراخ کرتا ہے اور پھر یہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ کر محبت کی کشتی کو ڈبو دیتا ہے میری محبت کی کشتی بھی اس وقت طوفانوں کی زد میں تھی۔ کیونکہ شک کا سوراخ تو بہت پہلے ہو چکا تھا اب کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ جذبات، غصہ، دکھ محبت نفرت میں ان سب کے بیچ پس کر رہ گیا اور میں نے انتہائی قدم اٹھا لیا جو ایسے وقت میں اکثر لوگ اٹھا لیتے ہیں۔ عقل تو مفلوج ہو چکی تھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں کھو بیٹھا تھا میں نے کھڑے کھڑے مہوش کو طلاق دے دی۔
مہوش بت بنی وہاں کھڑی رہ گئی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایسا کر بیٹھوں گا۔ میں غصے میں بھناتا ہوا کمرے میں چلا گیا اور توڑ پھوڑ مچا دی۔ درحقیقت توڑ پھوڑ تو میرے اندر مچی تھی، میری محبت کا جنازہ نکل چکا تھا۔ میں چیخنا چاہتا تھا، رونا چاہتا تھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

☆...☆

گھڑی میں جیسے ہی گیارہ بجے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اسد کے گھر آنے کا ٹائم ہو چکا تھا میں پرویز کو جلد از جلد روانہ کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ بات سے بات نکالے جا رہے تھے، بالآخر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے مجھ سے ہاتھ ملانا اپنا فرض سمجھا۔ میں نے بھی با دل نخواستہ ہاتھ ملا لیا اور اسی وقت اسد گھر میں داخل ہوئے۔ میرا ہاتھ پرویز کے ہاتھ میں دیکھ کر وہ نجانے کیا سمجھے کہ ہمارے بیچ کیا چل رہا ہے۔ انھوں نے آتے ہی میرے منہ پر ایک تھپڑ لگا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب اسد نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں بالکل گنگ ہو چکی تھی اسد نجانے کیا کیا بک رہا تھا وہ مجھ پر شک کر رہا تھا پھر اس نے پرویز کو گریبان سے پکڑ لیا۔ میں پہلے ہی بہت بے عزتی محسوس کر رہی تھی۔ اب پرویز کا گریبان جو اسد کے ہاتھ میں دیکھا تو مجھے لگا کہ اب اسد پرویز کو بھی مارے گا جو کہ یقیناً بے عزتی والی بات تھی۔ ایک تو وہ شخص ہمارا کام کر رہا تھا اور اسد اسی کو مارنے پیٹنے پر تلا ہوا تھا۔ میں اپنی بے عزتی بھول کر بیچ بچاؤ کروانے لگی۔
جب کسی طرح بات بنتی نظر نہ آئی تو میرے منہ سے یکدم نکلا۔
"اسد چھوڑ دو انھیں۔ ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں نے ہی انھیں بلایا تھا۔" کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن ان لفظوں کا مجھے بھاری خمیازہ بھگتنا پڑا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے یہ الفاظ تیر کی مانند جا کر

اسد کے دل میں گھپ جائیں گے اور وہ اتنا بڑا اقدم اٹھالے گا۔ بس میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسد نے اسے تو چھوڑ دیا۔ لیکن مجھے کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کبھی اسد کے منہ سے یہ الفاظ بھی سنوں گی۔ اسد جو مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ میری ہر جائز ناجائز خواہشات پوری کیا کرتا تھا۔ اس نے غصے میں مجھے طلاق دے دی تھی۔ اب میرا اسد سے کوئی رشتہ نہیں رہا تھا اور یہ گھر جسے میں نے ارمانوں سے سجایا تھا وہ بھی میرا نہیں تھا میں دکھ اور غصے میں پاگل ہو رہی تھی۔ کمرے سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسد چیزیں توڑ کر اپنا غصہ نکال رہا تھا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں خاموشی سے کمرے میں گئی اور ایک بیگ میں اپنے اور بچوں کے کپڑے رکھنے لگی۔ اب میرے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اسد کے شک نے سب پل بھر میں خاک کر دیا تھا۔ میں بچوں کے اسکول سے آنے کی منتظر تھی اسد اوندھے منہ بیڈ پر پڑا تھا بالکل خاموش۔

تھوڑی ہی دیر میں بچے بھی اسکول سے آ گئے ہمیشہ کی طرح خوش اور مگن اور آتے ہی سوال کیا۔

''امی آج کیا پکایا ہے؟'' ہانیہ نے پوچھا پھر میری روئی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''امی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں چلو جلدی کپڑے چینج کر کے تیار ہو جاؤ۔'' میں آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

''کیوں امی ہم کہیں جا رہے ہیں؟'' یہ شایان تھا۔

بچے خوشی خوشی تیار ہوئے تو اسد بولے۔ ''بچے کہیں نہیں جائیں گے۔''

''بچے میرے ساتھ ہی جائیں گے اور میرے پاس ہی رہیں گے۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

اسد نے پینترا بدلا اور بچوں کو پیار کرتے ہوئے بولا۔

''بیٹا آپ لوگ میرے پاس رک جاؤ ناں ہم خوب مزے کریں گے۔'' وہ بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا کیونکہ بہرحال وہ بچوں سے بہت پیار کرتا تھا لیکن بچے نہیں مانے۔

''نہیں پاپا آپ تو سارا دن گھر میں نہیں ہوتے ہم اکیلے کیا کریں گے۔ ہم نانو کے گھر جائیں گے مما کے ساتھ۔'' ہانیہ نے کہہ کر اسد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اسد خلافِ توقع خاموش ہو گیا۔ اب اس کے پاس کہنے کو بچا ہی کیا تھا اور میں تیزی سے بیگ اٹھا کر اس کے گھر سے اور اسد کی زندگی سے نکلتی چلی گئی۔

☆......☆

شاید غصے کو اسی لیے حرام قرار دیا گیا ہے کہ اس میں انسان بھلے برے کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ جیسے کہ میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے غصے میں مہوش کو طلاق تو دے دی تھی جبکہ اس کے اثرات کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ وہی ہوا جو ہونا تھا مہوش بچوں کو ساتھ لے کر اپنی امی کے گھر چلی گئی میں نے بہت چاہا کہ بچے میرے پاس رک جائیں لیکن بچے ماں کے ساتھ جانا چاہ رہے تھے اور پھر میں جانتا تھا کہ بچوں کی بہتر نگہداشت میں اکیلا نہیں کر پاؤں گا۔ میں تو سارا دن دکان پر ہوتا ہوں میرے پیچھے بچے اکیلے گھر میں کیسے رہیں گے۔ بس یہی سوچ کر میں نے دکھتے دل کے ساتھ بچوں کو مہوش کے ساتھ جانے دیا اور میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سوائے پچھتانے کے اور رونے کے۔ اس تنہائی میں یہ گھر مجھے کھانے کو دوڑ رہا تھا مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اُف یہ میں نے کیا کر دیا اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گھر اجاڑ دیا۔ میں نے کیوں پل بھر کو نہیں سوچا کہ اب میں کیا کروں گا۔ کیا مہوش اور بچوں کے بغیر میں جی پاؤں گا؟

''نہیں...... نہیں۔'' میرا دل زور زور سے دھڑک کر صدائیں دینے لگا۔ میں اکیلے گھر میں خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جیسے کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا، جیسے منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آتی اسی طرح اب مہوش اور بچے اس گھر میں نہیں آ سکتے تھے۔ میں نے خود اپنا گھر جلایا تھا میرے شک نے سب نیست و نابود کر دیا

تھا اب میرے لیے صرف پچھتاوے اور سوچیں تھیں جو مجھے پل پل جلا رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کیسے اب مہوش اور بچوں کو اپنی زندگی میں واپس لاؤں اور اب ایک ہی راستہ تھا حلالہ۔

☆......☆

میں جب امی کے گھر پہنچی تو میرے سارے ضبط جواب دے گئے اور میں جاتے ہی امی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ امی پوچھتی رہیں۔

''کیا ہوا کچھ بولو تو سہی؟ کیا اسد سے جھگڑا ہوا ہے؟'' بچے کچھ نہیں جانتے تھے اس لیے سہمے کھڑے تھے جب کچھ دل کا غبار چھٹا تو میں نے تمام روداد امی کو سنا دی۔ امی نے دل تھام لیا۔

''ہائے یہ کیا کیا اسد نے؟'' میں اپنا غم بھول کر امی کو سنبھالنے لگی۔ میری چھوٹی بہن مجھے اور امی کو پانی پلانے لگی پھر امی نے خود کو سنبھالا اور مجھے تسلی دی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا تم یہاں رہو آرام سے۔ یہ تمہارے ماں باپ کا گھر ہے مجھے پتا ہے اسد تمہارے اور بچوں کے بنا نہیں رہ پائے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ ہم اس کا بیٹھ کر حل نکالیں گے۔ تم پریشان مت ہو بچوں کو دیکھو۔'' میری چھوٹی بہن بچوں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

امی کی بات سن کر میں چونکی۔ مجھے پتا تھا کہ اب طلاق کے بعد ایک ہی حل بچتا ہے اور وہ ہے حلالہ جس کے لیے میں تیار نہ تھی لیکن ابھی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

امی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اسد ہمارے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔

دو دن بعد ہی اسد دروازے پہ تھا۔ دروازہ میری چھوٹی بہن نے کھولا۔ اس نے امی کو آ کر بتایا کہ اسد بھائی آئے ہیں۔''

امی نے کہا۔ ''اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھاؤ میں آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر امی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

''کیا لینے آئے ہو اب یہاں؟'' مجھے امی کی چبھتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں برابر والے کمرے سے ساری بات سننے لگی۔ ''تم نے میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی۔ ایک لمحے کو بھی بچوں کے بارے میں نہ سوچا۔ کیسے آدمی ہو تم؟'' امی شدید غصے میں تھیں۔

''سوری آنٹی میں شرمندہ ہوں واقعی میری غلطی ہے۔ مجھے ایک دم اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ لیکن اب مجھے احساس ہو چکا ہے اور اب میں اپنی غلطی سدھارنا چاہتا ہوں۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں میرا مطلب ہے......'' اتنا کہہ کر اسد لمحہ بھر کو خاموش ہوئے امی شاید سب اسد کے منہ سے ہی سننا چاہ رہی تھیں۔

''میں...... میں مہوش سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔'' اسد نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔

''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟'' امی نے پوچھا لہجہ بہت سخت تھا۔

''کیا مہوش راضی ہو جائے گی؟'' سوال ہی سوال تھے اسد کی آواز آئی۔

''آنٹی پلیز آپ مہوش کو راضی کریں پلیز بچوں کی خاطر۔'' اسد کا لہجہ رونے والا تھا۔

''تم ابھی کے ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تمہیں بچوں کا خیال ہوتا تو تم اپنا قدم ہی نہ اٹھاتے۔ پلیز چلے جاؤ یہاں سے۔'' میں چیخنے لگی تو اسد خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے بہت شکست تھی ان کے قدموں میں۔

☆......☆

میں نے جب اس بارے میں مہوش کی امی سے بات کرنا چاہی تو ان کے ساتھ ساتھ مہوش بھی بپھر اٹھی اور مجھے باتیں سنا کر گھر سے نکال دیا اور میں نامراد لوٹ آیا۔ لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہ تھا۔ میں نے چکر لگانے شروع کر دیے۔ میں بار بار مہوش سے التجا کرتا رہا۔ اسے مناتا رہا کبھی فون پر اور کبھی خود گھر جا کر۔ میں کیا کرتا اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ مجھے ہر حال میں مہوش کو راضی کرنا ہی تھا کیسے بھی۔ کیونکہ میری زندگی ایک جگہ رک چکی تھی۔ گھر ویران ہو چکا تھا۔ امی کو پتا چلا تو دوڑی چلی آئیں۔

''مجھے پتا تھا وہ عورت گھر بسانے والی تھی ہی نہیں۔ اچھا کیا تو نے۔'' امی الٹا مجھے سنانے بیٹھ گئیں۔

''امی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ مہوش بے قصور ہے۔ میں نے اس پر غلط شک کیا اور انتہائی قدم اٹھالیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے میرے بچے بھی مجھ سے دور ہو گئے۔ کچھ بھی ہو میں اب اپنی غلطی سدھار کے رہوں گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا میرے منہ سے سچائی سن کر امی نرم پڑ گئیں اور بولیں۔

''کیا اب تو پھر سے مہوش سے نکاح کرے گا؟''

''جی امی۔''

''تجھے پتا ہے اس کے لیے حلالہ ضروری ہے۔''

''جی امی یہی میری سزا ہے مجھے منظور ہے۔''

''جیسی تیری مرضی بیٹا۔''

پھر امی روز آکر میرا کھانا پکا جاتیں۔ انھوں نے بہت کہا کہ میں ان کے پاس رہوں لیکن میں اپنا گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہا تھا اس لیے انکار کر دیا۔ امی خاموش ہو گئیں۔

میں روزانہ مہوش کو فون کرتا رہا اور گھر کے بھی چکر لگاتا رہا۔ میرا کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا بالآخر میری محنت رنگ لائی، کہتے ہیں پتھر پر بھی قطرہ قطرہ گرتا رہے تو شگاف پڑ جاتا ہے۔ میرا بھی روز روز فون کرنا اور چکر لگانا کام کر گیا اور مہوش کچھ نرم پڑ گئی اور وہ حلالہ کے لیے راضی بھی ہو گئی لیکن کس سے؟ یہ سن کر میرے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔

مہوش مجھ سے انتقام لے رہی تھی لیکن اس طرح میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

☆..... ☆

اس دن تو میں نے اسد کو باتیں سنا کر نکال دیا لیکن وہ بھی دھن کا پکا نکلا۔ روز فون کر کر کے اس نے میرا دماغ خراب کر دیا۔ کبھی گھر کے چکر لگاتا، کبھی فون پر رو کر مجھ سے التجائیں کرتا۔ میں تنگ آچکی تھی لیکن اتنی آسانی سے معاف کرنے کو بھی تیار نہ تھی۔

پھر میرے سامنے یہ مسئلہ بھی تھا کہ حلالہ کس سے کروایا جائے کیونکہ ابھی میرے طلاق کی بات کہیں پھیلی نہیں تھی اور میں اسے راز ہی رکھنا چاہتی تھی اس کے ساتھ میں اسد سے اپنی بے عزتی کا بدلہ بھی لینا چاہتی تھی۔ میں انہی سوچوں میں تھی کہ پرویز کی کال آگئی۔ وہ میری خیر خیریت پوچھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مجھے طلاق ہو چکی ہے۔ میں نے بتا دیا۔

''جی میں امی کے گھر اسی دن آگئی تھی۔''

''پھر اسد نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔'' اسے ذرا احساس نہیں ہے تمہارا۔'' وہ جلے پر نمک چھڑک رہے تھے۔

''جی اسد آئے تھے وہ معافی مانگ رہے ہیں اور..... اور مجھ سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتے ہیں۔''

''پھر اس کے لیے تو.....'' انھوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''جی وہ راضی ہے۔''

''اچھا۔'' ان کا لہجہ بڑا معنی خیز تھا۔ ''اور تم..... تم راضی ہو اس کے ساتھ دوبارہ نکاح پر؟''

''جی شاید بچوں کے لیے میں مان جاؤں۔''

''صرف بچوں کے لیے؟ کیا تمھیں اب اسد سے محبت نہیں رہی۔'' وہ نجانے کیا اگلوانا چاہ رہے تھے۔

''پتا نہیں..... لیکن اسد نے میرا مان توڑ دیا ہے۔ مجھ پر شک کیا ہے اب میرے دل میں اس کے لیے پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ بس بچوں کی خاطر میں اس رشتے کو نبھاؤں گی۔ بچے بہت اداس ہیں اور خود اسد بھی خوش نہیں ہے۔ روز مجھے فون کرتا ہے، معافیاں مانگتا ہے۔ وہ واقعی شرمندہ ہے۔''

''پھر تم نے کیا سوچا؟''

''یہی کہ مان جاؤں گی۔''

''یعنی تم عدت کے بعد حلالہ کرواؤ گی تبھی تم اسد سے دوبارہ نکاح کر پاؤ گی۔''

''جی۔'' میں نے کہہ کر بات ختم کر دی۔

پھر تو روز پرویز کے فون آنے لگے، شاید وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے اور کہہ نہیں پا رہے تھے۔ آخر ایک

دن انھوں نے دل کی بات کہہ ڈالی خیر خیریت کے بعد مطلب کی بات پر آئے۔

''اب عدت پوری ہونے والی ہے، تمہارا کیا فیصلہ ہے۔''

''کس بارے میں؟''

''ارے بھئی دوسرے نکاح کے لیے۔ ہے کوئی اعتماد کا بندہ۔''

''نہیں ابھی تک تو کوئی نہیں ہے۔''

''اچھا اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''جی جی کہیے۔''

''میں...... میں تیار ہوں اس نیک کام کرنے کے لیے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ مجھ سے زیادہ بھروسے والا انسان تمھیں کہاں ملے گا۔''

انھوں نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی اور صفائی بھی دے ڈالی۔

میں لمحہ بھر کو چونک گئی میں نے کوئی جواب نہ دیا تو پھر بولے۔

''میں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے فون بند کر دیا اور میرے لیے سوچوں کے نئے در وا ہو گئے اور پھر سوچتے سوچتے میرے دل میں ایک کمینہ سا احساس جاگا، بدلے کا۔ اسد سے بدلے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اگر میں پرویز سے حلالہ کروں تو......

ویسے بھی حلالہ تو کرنا ہی ہے۔ یہی اسد کی بھی ضد ہے اور اس شخص (پرویز) کے علاوہ ابھی کوئی اور بندہ ہے بھی نہیں جس پر بھروسہ کیا جا سکے اور اسد جب پرویز کا نام سنے گا تو جل بھن کر رہ جائے گا اور یہی میرا انتقام ہوگا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یعنی سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ اب مجھے شدت سے اسد کے فون کا انتظار تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسد کا فون آ گیا۔

''مہوش پلیز مان جاؤ۔ اب تھوڑے ہی دن بچے ہیں عدت ختم ہونے میں۔ تم پلیز کوئی فیصلہ کر لو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ آئندہ وعدہ کرتا ہوں تمھیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''اچھا ہاں لو میں اگر راضی ہوتی ہوں تو تمہارے پاس کوئی اعتماد کا بندہ ہے دوسرے نکاح کے لیے؟''

''نہیں۔ لیکن میں جلد ڈھونڈ نکالوں گا اپنے دوستوں میں سے۔ تم راضی تو ہو جاؤ۔''

''میں راضی ہوں۔''

''سچ مہوش میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ تم نے مجھے معاف کر دیا ناں؟''

''ہاں لیکن حلالہ میری مرضی کے بندے سے ہوگا۔''

''تمہاری مرضی۔ لیکن کون ہے وہ؟''

''پرویز'' میں نے فوراً کہا اور اسد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''خاموش کیوں ہو گئے؟''

''مہوش تم جانتی ہو مجھے پوری دنیا میں صرف اسی شخص سے نفرت ہے اس کی وجہ سے ہمارا گھر اجڑا اور تم چاہتی ہو کہ......''

''میرا یہی فیصلہ ہے اگر منظور ہے تو بتا دینا۔'' کہہ کر میں نے جھٹ سے فون بند کر دیا۔

☆......☆

میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ آخر مہوش نے اسی شخص کو کیوں چنا۔ کیا اس طرح مہوش مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہے؟ آخر اس سب سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتی ہے۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ رگیں پھٹ رہی تھیں۔ میں پاگل ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مہوش اپنے موقف سے ایک انچ سرکنے کو تیار نہ تھی اور میں مجبور تھا۔ اس سے زیادہ بے بسی میں نے اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی۔ میں مہوش اور بچوں کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس کے لیے مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی تھا اس لیے میں نے دکھتے دل سے مہوش کو رضامندی دے دی اور پھر خود انگاروں پہ لوٹنے لگا۔

عدت ختم ہوتے ہی مہوش کا نکاح پرویز سے ہو گیا۔ وہ دن اور رات میں کیسے کاٹا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اگلے ہی دن میں مہوش کے گھر پہنچا تو پتا چلا

کہ مہوش اور پرویز دونوں کا موبائل فون بند ہے۔
میرا پریشان ہونا فطری تھا کیونکہ وعدہ کے مطابق آج صبح مہوش اور پرویز دونوں کا موبائل فون بند ہے۔ میرا پریشان ہونا فطری تھا کیونکہ وعدے کے مطابق آج صبح مہوش کو طلاق ہو جانی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ پرویز کے دل میں نجانے کیا تھا کہ اس نے اپنا اور مہوش کا فون بند کیا ہوا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ پرویز کے فلیٹ پر جا کر دیکھا جائے کہ کیا صورت حال ہے تو مہوش کا بھائی اور میں وہاں پہنچے تو تالا تھا۔ اب تو میں پریشان ہو گیا کہ کیا کروں، کہاں جا کر ڈھونڈوں۔ اب انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

پرویز نے ہمیں دھوکہ دیا تھا وہ اپنے وعدے کی پاسداری کے بجائے مہوش کو لے کر غائب ہو چکا تھا اور ہم بے بس تھے۔

☆......☆

اسد کی رضامندی ملتے ہی جیسے میرا انتقام پورا ہو گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اس نے کس دل سے مجھے پرویز سے نکاح کی اجازت دے دی ہو گی۔ بہرحال میں جو چاہتی تھی وہ ہو گیا تھا پھر جھٹ پٹ میرا اور پرویز کا نکاح ہو گیا اور پرویز مجھے فلیٹ پر لے گیا اور پھر صبح پانچ بجے ہم ایئرپورٹ کے لیے نکل گئے۔ اس سارے پروگرام کے بارے میں، میں نہیں جانتی تھی۔ میں نے بہت منع کرنا چاہا لیکن اس شخص نے میری ایک نہ سنی اور مجھے کہا کہ ہم صرف دو دنوں کے لیے اسلام آباد جا رہے ہیں۔ دو دنوں بعد تمہیں طلاق دے دوں گا۔ میں خاموش ہو گئی اب تو میں اسی کے رحم و کرم پر تھی اس نے میرا اور اپنا موبائل بھی سوئچ آف کر دیا۔ میں نے گھر پر اطلاع دینے کو کہا تو اس نے کہا۔

''اسلام آباد پہنچ کر ہم گھر پر فون کر دیں گے ابھی چلو۔'' اور میں چپ چاپ چل دی۔ پھر میرے بہت اصرار پر اگلے دن رات میں گھر والوں کو فون کر کے بتا دیا کہ ہم اسلام آباد میں ہیں جلد ہی لوٹ آئیں گے۔''

گھر والوں نے اسے وعدہ یاد دلایا کہ مجھے طلاق دینی ہے۔ پر وہ ہنس کر ٹال گیا اور فون کٹ کر دیا۔ میں بھی اب گھر واپس جانا چاہتی تھی کیونکہ ہمیں آئے ہوئے دس روز گزر چکے تھے۔ میں کافی پریشان تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پرویز کے دل میں کیا ہے۔ وہ آخر مجھے طلاق دینے میں اتنی تاخیر کیوں کر رہا ہے۔

میں روز اس سے پوچھتی۔ ''ہم گھر کب جائیں گے؟'' اس کا ایک ہی جواب ہوتا چلے جائیں گے ایسی بھی کیا جلدی ہے زندگی کو انجوائے کرو۔'' اور میں چپ ہو جاتی لیکن جب پندرہ دن ہوئے تو میں پھٹ پڑی۔

''پرویز یہ سب کیا ہے۔ تم مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔ اب تو پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ وہاں میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ گھر والے بھی پریشان ہوں گے پلیز۔'' میں تھوڑا سا نرم پڑ گئی کیونکہ اس نے مجھے گھورنا شروع کر دیا تھا۔ میں ڈر گئی اور پیار سے بولی۔ ''پلیز دیکھو ہمیں اب چلنا چاہیے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میرے بچے۔'' اتنا کہہ کر میں رو پڑی۔

''ہونہہ۔'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''میرا خیال ہے اتنا انتقام کافی ہے تمہارے سابقہ شوہر کے لیے ہے ناں۔'' وہ میری طرف گھوما۔ ''تم بھی تو یہی چاہتی تھیں اور اب اتنی جلدی تھک گئیں۔''

''ہاں اب مجھے گھر جانا ہے اپنے بچوں کے پاس۔''

''چلو ٹھیک ہے کل چلتے ہیں۔'' میں بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ ''ٹھیک ہے ناں؟'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں بادل نخواستہ مان گئی اور پھر اگلے دن پرویز نے مجھے طلاق کے کاغذات تھمائے اور میں بخیر و عافیت گھر پہنچ گئی اب مجھے اپنی عدت گزارنی تھی۔

☆......☆

ایسا لگتا تھا جیسے مہوش کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ مجھ سے وقت گزر نہیں رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر پرویز پر غصہ آ رہا تھا اس نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔ اس

کی نیت تو مجھے پہلے ہی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اب تو پختہ یقین ہو چکا تھا اس کے ساتھ ساتھ مجھے مہوش کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ دل سے ہر لحہ اس کی خیریت کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ بالآخر خدا خدا کر کے مہوش کا فون آیا اس نے بتایا کہ وہ اسلام آباد میں ہیں اور جلدی لوٹ آئیں گے۔ ہم سب مصلحتاً خاموش ہو گئے اور کر بھی کیا سکتے تھے سوائے انتظار کرنے کے۔

پرویز نے واپسی میں پندرہ دن لگا دیئے یہ پندرہ دن میرے لیے صدیوں سے کم نہ تھے۔ بہر حال یہ وقت کٹ چکا تھا۔ پرویز نے مہوش کو طلاق کے کاغذات دے دیئے تھے۔ میں نے لاکھ شکر ادا کیا۔ اب مہوش کو عدت کے دن گزارنے تھے وہ بھی گزر گئے اور پھر مہوش ایک بار پھر سے میری زندگی میں لوٹ آئی۔ اس دن تو بہت زیادہ خوش تھا۔ میں نے مہوش کو کھو کے دوبارہ پایا تھا اور اب میں اپنی زندگی کو حسین تر بنانا چاہتا تھا اور پھر میں نے مہوش کو بہت خوش رکھنا شروع کر دیا لیکن بغیر پیسے کے خوشیاں شاید پھیکی ہوتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مہوش بھی خوش نہیں تھی۔ بس گزارہ کر رہی تھی یا پھر اسے پرویز کے پیسوں کی لت لگ چکی تھی۔ کیونکہ بقول مہوش کے پرویز نے اس پر پانی کی طرح پیسہ خرچ کیا تھا اور ایک میں تھا جو پریشانی میں اپنا کاروبار بھی ٹھپ کر چکا تھا۔ گھر میں روز جھگڑا ہونے لگا۔ میں بری طرح پریشان ہو چکا تھا کہ ایک سال بعد پرویز پھر سے پاکستان لوٹ آیا۔ اتنے عرصے سے وہ ملک سے باہر تھا اور پھر ہماری زندگی میں بھونچال آ گیا۔

☆......☆

بالآخر اس سے دوبارہ نکاح کر کے میں بچوں کے ساتھ اپنے گھر آ گئی تھی اسد بہت خوش تھا۔ جیسے اسے ہفت اقلیم مل گئی ہو۔ خوش تو میں بھی تھی لیکن تھوڑے ہی دن میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسد اپنا کاروبار ٹھپ کر چکا ہے۔ گھر میں تنگی ہونے لگی تھی۔ جس کی میں عادی نہیں تھی۔ مجھے کھلے پیسے خرچ کرنے کی عادت تھی۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ پرویز نے پندرہ دن میں مجھ پر کیسے پیسے خرچ کیے تھے اور ایک اسد تھا جو اتنے عرصے میں ایک بار بھی شاپنگ نہیں کروا سکا تھا بلکہ کھانے کو بھی ڈھنگ کا نہ تھا میں تو اب دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ میں نے پرویز سے طلاق ہی کیوں لی۔

اسی طرح دھکا دیتے ایک ماہ بیت گیا۔ میں اسد سے بیزار ہو چکی تھی کہ ایک دن بالکل اچانک پرویز ہمارے گھر چلے آئے۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اب ہمارے گھر کیا کرنے آئے تھے۔ اسد بھی گھر میں ہی تھے۔ انہوں نے آتے ہی دھما کا کیا۔

''تم یہاں کس حیثیت سے رہ رہی ہو؟'' میں اور اسد ان کی اس بات پر چونک اٹھے۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟ مہوش میری بیوی ہے۔'' اسد چیخے۔ ''بلکہ میں پوچھتا ہوں تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ اب ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے جاؤ یہاں سے۔'' اسد کی بات سن کر پرویز ہنسنے لگا اور مکاری سے بولا۔

''بھئی میں تو اپنی بیوی کو لینے آیا ہوں اور مہوش سے میرا واسطہ ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔''

''کیا بک رہے ہو، تم ہوش میں تو ہو۔''

''میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں اور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مہوش آج بھی میری بیوی ہے۔ میں نے مہوش کو طلاق دی ہی نہیں ہے۔'' پرویز نے انکشاف کیا۔ اب چونکنے کی باری میری تھی۔

''کیا مطلب؟ تم نے جو مجھے طلاق کے پیپرز دیے تھے وہ......!''

''وہ جعلی تھے اصل میں وہ طلاق کے پیپرز تھے ہی نہیں۔ کیا تم نے انہیں چیک کیا تھا۔''

''نن...... نہیں۔'' میں ہونق بنی پرویز کو گھور رہی تھی۔ یہ اس نے میرے ساتھ کیسا کھیل کھیلا تھا۔ میں نے بہت بڑی غلطی کر دی تھی کہ اپنے طلاق کے پیپرز دیکھے ہی نہیں تھے۔ اس نے کتنی آسانی سے مجھے بے وقوف بنا دیا تھا اور میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسد ہوش میں آ گیا اور اس نے پرویز کا گریبان پکڑ لیا۔

''کمینے انسان! یہ تو نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا بول۔'' پرویز نے

جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور نخوت سے بولا۔

''یہ میری شرافت ہے کہ میں پولیس کو ساتھ نہیں لایا۔ اب عزت سے مہوش کو میرے ساتھ جانے دے ورنہ مجھے قانونی ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑیں گے اور تو اندر جائے گا تو تیرے بچے رل جائیں گے۔''

میں سر تھامے بیٹھی تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ تقدیر نے کیا مذاق کیا تھا۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔ پرویز کی دھمکی کام کر گئی تھی اسد ڈر گیا تھا لیکن پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ پیپرز جعلی تھے۔ تمہارے پاس کاپی ہے اس کی؟'' اسد نے بودا سا سوال کیا۔ پرویز نے فوراً کوٹ کی جیب سے پیپرز نکالے۔ وہ سارے ثبوت ساتھ لایا تھا۔

''اب تم بتاؤ کیا بغیر میرے طلاق دیے تمہارا نکاح ہو گیا؟'' وہ مکاری سے بولا۔

''لیکن یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی اب ایک ماہ بعد تمہیں یاد آیا؟''

''انتقام میری جان انتقام اسی کو کہتے ہیں میں تمہیں بار بار تڑپانا چاہتا تھا۔ اپنی بے عزتی کا بھرپور بدلہ لینا چاہتا تھا اور وہ بدلہ اب پورا ہوا ہے۔ چلو مہوش میرے ساتھ۔'' وہ دہاڑا۔

''نہیں تم ایسے مہوش کو نہیں لے جا سکتے۔ مجھے پہلے مفتی سے فتویٰ لینے دو۔'' اسد نے آخری کوشش کی۔

''بڑے شوق سے فتویٰ لو۔ میں سارے کام کر کے آیا ہوں۔ تم بھی ارمان پورا کر لو۔'' لمحہ بھر کو ٹھہرا پھر بولا۔ ''لیکن مہوش تمہارے ساتھ اب ایک پل بھی نہیں رہے گی۔ اسے میکے بھیج دو۔ تم فتویٰ لے آؤ میں پھر مہوش کو لے جاؤں گا۔ ہمیشہ کے لیے سمجھے۔'' یہ کہہ کر وہ پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔

کافی دیر تک میں اور اسد سر تھامے بیٹھے رہے۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تھا میں نے بچوں کا ہاتھ تھاما اور بیگ اٹھایا۔

''چلو بیٹا ہم نانو کے گھر جا رہے ہیں۔'' بچے جو دوسرے کمرے میں کھیل میں مگن تھے ایک دم خوش ہو گئے اسد بولے۔

''ٹھہرو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ میں باہر ہی جا رہا ہوں مفتی صاحب سے ملنے چلو۔'' میں نے دیکھا اسد کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ نہ جانے ضبط کے کن مراحل سے گزر رہا تھا۔ میں کچھ بھی نہ بول پائی اور خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑی۔ ایک بار پھر تقدیر نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا یا پھر سب میری ہی غلطی تھی۔

☆......☆

پرویز کو اچانک اپنے گھر دیکھ کر میں بھنا اٹھا لیکن جب اس نے مہوش کا شوہر ہونے کا دعویٰ کیا تو میرا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس کمینے انسان نے ہمیں اتنا بڑا دھوکا دیا تھا جو میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔ ان کے پاس سارے ثبوت موجود تھے۔ واقعی مہوش اب بھی اس کی بیوی تھی اور میں بے بس تھا۔

پرویز نے مجھ سے خوب دشمنی نبھائی تھی۔ ساری خوشیاں مجھے دے کر ایک دم چھین لی تھیں، جس پر میں بوکھلا کر رہ گیا تھا لیکن آخری کوشش کے طور پر مفتی صاحب سے ملنا چاہ رہا تھا۔ اتنی آسانی سے میں ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ مہوش کو میکے چھوڑ کر میں سیدھا مفتی صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کو جب ساری روداد بتائی تو انہوں نے فیصلہ پرویز کے حق میں دیا۔ ظاہر ہے جب پرویز نے طلاق دی ہی نہیں تو مہوش اب تک اس کے نکاح میں تھی۔ مفتی صاحب کی بات تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی اور میں نے بالکل ہمت ہار دی۔ میں وہیں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ لیکن اب رونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں جیسے تیسے گھر پہنچا کر مہوش کی کال آ گئی۔

''کیا کہا مفتی صاحب نے؟''

''تم......! تم اب بھی پرویز کی بیوی ہو۔'' میرا لہجہ میرے دکھ کی غمازی کر رہا تھا۔ ''مہوش کیا واقعی پرویز نے تمہیں زبانی طلاق نہیں دی تھی یاد کرو۔''

''نہیں اسد اس نے صرف پیپرز مجھے دیے تھے

اور گھر چھوڑ دیا تھا۔"

"اور تم نے دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟"

"بس غلطی ہو گئی بہت بڑی کہ میں نے پرویز پر بھروسا کیا۔" مہوش نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

اب کہنے سننے کو باقی کچھ نہیں بچا تھا اس لیے میں نے فون رکھ دیا۔

☆......☆

وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میں اب بھی پرویز کی بیوی تھی کیونکہ اس نے مجھے طلاق دینے کا صرف ڈھونگ رچایا تھا اور حقیقت اس نے ہمیں دھوکا دیا تھا بہت بڑا دھوکا! اور ہم کسی سے اس بارے میں کوئی بات بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ابھی تک ہمارے خاندان میں بھی کسی کو اس بارے میں کوئی بھنک بھی نہیں تھی کہ اسد اور میرے بیچ کیا چل رہا ہے یا پھر پرویز سے میں نے حلالہ کیا ہے۔ اور اب تقدیر مجھے کس موڑ پر لے آئی تھی۔ جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ میں نے تو صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے اسد سے انتقام لینا چاہا تھا اور شاید یہ اسی کی سزا مل رہی تھی مجھے۔

میں سخت ڈپریشن کا شکار تھی۔ گھر میں بھی سب حقیقت جاننے کے بعد بھونچکے رہ گئے تھے۔ یہ پرویز نے کیسی گھناؤنی حرکت کی تھی۔ جس کا بھی نہ دیکھا نہ سنا۔ جس نے سنا دل تھام لیا یعنی میں تقریباً ایک سال اسد کے ساتھ بغیر نکاح کے رہی...... یہ سوچ ہی میرے لیے سوہان روح تھی۔ میں پرویز کے خلاف چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہت شاطر اور گھاگ آدمی تھا۔ الٹا ہمیں ہی پھنسا دیتا اور پھر پرویز کا فون آ گیا۔ وہ مجھے لینے آ رہا تھا۔

"ہیلو کہاں ہو تم؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"امی کے گھر۔"

"تیار رہو میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"لیکن......!" میری بات سنے بغیر ہی اس نے فون کاٹ دیا تھا۔

میں بہت بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ امی کو بتایا کہ پرویز مجھے لینے آ رہا ہے تو وہ بولیں۔

"جاؤ بیٹی اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ اب ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں سوائے پچھتانے کے۔ تمہارا فیصلہ ہی غلط تھا جو تم نے بغیر کسی سے مشورہ لیے ایسے انسان پر بھروسا کیا جو درحقیقت انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ وہ انسانی کھال میں قید ایک درندہ ہے جس کا کام ہی دھوکا دہی ہے۔ خدا کرے وہ تمہیں خوش رکھے۔ یہ تو مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

"ہونہہ...... نقصان اب اس سے بڑھ کر میری زندگی میں اور کیا نقصان ہونا باقی ہے۔ ٹھیک ہے میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔" میں نے سرد آہ بھری، باہر سے گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میرا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ مستقل ہارن دے رہا تھا۔ میں باہر نکلی اور پوچھا۔

"بچے کہاں رہیں گے؟" بہت بے بسی، بہت آس تھی میرے لہجے میں۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید یہ ظالم اور خود غرض آدمی مجھ پر تھوڑا سا ترس کھا لے اور میرے بچوں کو سہارا دے دے لیکن یہ میری بھول تھی۔ اگر اس کے دل میں ذرا سا بھی احساس ہوتا تو وہ میرے ساتھ اتنا گھناؤنا مذاق نہ کرتا لیکن کچھ لوگ انسانیت سے بالکل عاری ہوتے ہیں، وہ نہ تو کسی پر ترس کھاتے ہیں اور نہ ہی زندگی میں کوئی بھی اچھا کام کرتے ہیں۔ یہ شخص بھی ایسا ہی تھا۔ لاپروائی سے بولا۔

"اس ذلیل آدمی اسد کے بچے تمہاری ماں کے گھر رہیں گے، میں ان کی ذمہ داری نہیں اٹھاؤں گا۔"

"لیکن وہ میرے بھی بچے ہیں۔" میں تڑپ کر بولی۔

"میں بس اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں تمہارے بچوں سے ملوانے لا سکتا ہوں اور کسی بات کی مجھ سے امید مت رکھنا۔" بہت سفاک تھا وہ۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے خود غرض اور ظالم نکلو گے۔" میں نفرت سے بولی۔

"چلو اچھا ہے ناں وقت پہ پتا چل گیا۔" جواب

گاڑی میں بیٹھو دیر ہو رہی ہے مجھے۔'' وہ رعونت سے بولا۔ ''اور تمہارے گلی والے تماشا دیکھ رہے ہیں۔''

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ عورتیں مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں میں جلدی سے ''ابھی آتی ہوں'' کہہ کر اندر بھاگی۔ امی سے گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میری رخصتی آج ہو رہی ہے۔ بچے پریشانی سے مجھے تک رہے تھے۔ انہیں کچھ کچھ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے اور ویسے بھی مجھے بچوں کو سب کچھ بتانا ہی تھا اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

''مما آپ کیوں رو رہی ہیں۔'' ہانیہ پوچھ رہی تھی۔ میں تڑپ کر مڑی اور بے تحاشا دونوں بچوں کو پیار کرنے لگی اور پھر دل کڑا کر کے میں نے بچوں کو ساری حقیقت بتا دی کہ اب انہیں نانو کے ساتھ رہنا ہے۔ مما دوسرے پاپا کے ساتھ رہیں گی۔''

''تو کیا ہم اپنے گھر کبھی نہیں جائیں گے۔'' یہ شایان تھا میں نے اسے پیار کیا۔

''جاؤ بیٹا اپنے پاپا سے ملنے۔ میں بھی آپ دونوں سے ملنے روز آیا کروں گی اوکے۔'' میں آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی رہی تھی۔

''آپ نانو کو تنگ نہیں کرنا۔'' باہر سے مسلسل ہارن کی آواز آ رہی تھی، میں نے دل ہی دل میں پرویز کو گالیاں دیں اور اپنے بچوں پر الوداعی نظر ڈالتی باہر نکل آئی۔

☆......☆

اگلے دن پتا چلا کہ پرویز مہوش کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں اس کی کمینگی پر تلملا کر رہ گیا۔ میں اتنا مجبور و بے بس تھا کہ میں پرویز کے خلاف چاہ کر بھی کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیے تھے جو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچے تھے۔ مجھے مہوش اور بچے بہت یاد آ رہے تھے۔ اکیلا گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا بچوں سے مل آؤں ویسے بھی کام کاج تو سب چوپٹ ہو ہی چکا تھا۔ کس کے لیے پیسے کماتا؟ کس کے لیے محنت کرتا؟ میری زندگی میں اب سوائے تنہائی اور بے بسی کے بچا ہی کیا تھا یا پھر وہ حسین یادیں تھیں جو میں نے مہوش کے ساتھ وقت گزارا۔

میں بچوں سے ملنے گیا بچے بہت بجھے بجھے تھے۔ مجھے دیکھ کر کھل اٹھے۔ میری ساس خلاف توقع بولیں۔

''اچھا کیا بچوں سے ملنے آ گئے۔ میں تمہیں بلانے ہی والی تھی۔ بچے تمہیں بہت یاد کر رہے تھے۔'' میں نے بچوں کو بے تحاشا پیار کیا۔

''کیسے ہو بیٹا۔'' میں نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

''پاپا اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔ ہم آپ اور مما کے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' یہ ہانیہ تھی۔ اس کی معصومیت پر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ پرویز کے لیے دل بھر کے بددعا میں نکلیں۔ اس نے کیسے بدلے کی آگ میں میرا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں کہیں، بچے کہیں اور مہوش کہیں! ہم کیسے ٹکڑوں میں بٹ کے رہ گئے تھے۔ صرف اور صرف پرویز کی وجہ سے۔ ابھی میں کوئی جواب دے نہیں پایا تھا کہ شایان پوچھ بیٹھا۔

''پاپا! مما دوسرے پاپا کے ساتھ کیوں چلی گئیں؟ کیا آپ سے ناراض ہو گئیں؟'' بچے مجھ سے کیسے سوال کر رہے تھے، میرے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے بڑے ضبط سے جواب دیا۔

''ہاں بیٹا اب مما دوسرے پاپا کے پاس رہیں گی لیکن آپ سے ملنے آئیں گی۔''

''اور پاپا آپ اکیلے رہیں گے؟'' ہانیہ کو میری بھی فکر تھی۔

''نہیں بیٹا میں کام سے واپسی پر روز آپ سے ملنے آؤں گا یا پھر آپ کو گھر لے جاؤں گا۔ ہم خوب کھیلیں گے اوکے۔'' میں نے انہیں تسلی دی تو دونوں خوش ہو گئے۔

''اچھا چلو جلدی ہم باہر کھانا کھانے چلتے ہیں۔''

''سچ پاپا! مما بھی چلیں گی؟'' ہانیہ کا سوال سن کر

میں ایکدم بجھ سا گیا۔

''نہیں بیٹا بس ہم تینوں چلیں گے چلو جلدی کرو شاباش۔'' بچے تیار ہونے چلے گئے تو میری ساس آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

''اچھا کیا تم نے بچوں کے سامنے ایسے ہی حوصلہ رکھنا ورنہ بچے اور سہم جائیں گے۔ اللہ ان بچوں کے نصیب اچھے کرے اور پرویز کو غارت کرے۔'' میں نے دل ہی دل میں آمین کہا اور بچوں کو لے کر نکل گیا۔

☆......☆

پرویز اپنی جیت کی خوشی میں چُور تھا اور میں خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ کچھ بھی تو نہ تھا میرے بس میں! میں تو بس ایک کٹھ پتلی بن چکی تھی پرویز کے ہاتھوں اور وہ مجھے اپنی دھن پر، اپنے اشاروں پر نچا رہا تھا۔ میری مرضی کے بغیر۔

ہماری طرف سے کوئی بھی مزاحمت نہ پا کر پرویز بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ سب کچھ اس کی مرضی، اس کے پلان کے مطابق بڑی آسانی سے ہو گیا تھا کیونکہ اسد ایک کم ہمت اور قدرے ڈرپوک واقع ہوا تھا۔ پرویز جانتا تھا کہ اسد اس کے خلاف کچھ نہیں کر پائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا لیکن وہ کامیاب ہو کر بھی ناکام تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ خوش نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے! میں اپنے بچوں سے دور رہ رہی تھی۔ کتنا تڑپتی تھی اپنے بچوں کو یاد کر کے روتی رہتی تھی۔ وہ بڑا احسان جتا کر میرے بار بار اصرار پر مجھے بچوں سے ملوانے لے جاتا اور شام میں واپس لے لیتا۔ بچوں سے مل کر میں زندگی میں واپس لوٹ آئی۔ ورنہ تو میری زندگی کا مقصد جیسے ختم ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ اکیلے فلیٹ میں پرویز مجھے بند کر جاتا اور پھر اپنی مرضی سے لوٹ کر آتا۔ میں نے رو رو کر اس سے منت سماجت کی کہ مجھے امی کے گھر رہنے دو۔ جب تمہارا جی چاہے مجھے لے کر آیا کرنا۔ میرے بچے میرے بغیر کیسے رہتے ہوں گے۔ پلیز! میں تم سے اور کچھ نہیں مانگوں گی۔ مجھے میرے بچوں کے ساتھ رہنے دو۔'' میں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ وہ بڑی نخوت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ بھی اب مجھ سے اکتا گیا تھا یکدم بولا۔

''چلو!'' اس کا مثبت جواب سن کر میرے کانوں کو یقین نہ آیا۔ میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ تو سفاک تھا اتنی آسانی سے کیسے مان گیا۔ شاید یہ میری دعاؤں کا اثر تھا جو میں اپنے رب سے مانگا کرتی تھی۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی جیسے لمحے کی بھی دیر ہوئی تو اس کا ارادہ بدل جائے گا۔ میں جیسے حلیے میں بیٹھی تھی چل پڑی۔ پرویز نے مڑ کر ایک نظر مجھے دیکھا، میرے حلیے پر نظر دوڑائی۔ میں جھینپ کر کپڑوں کی شکنیں دور کرنے لگی وہ خاموشی سے آگے چل پڑا۔ یہی کیا کم تھا کہ اس کے دل میں اللہ نے اتنا رحم ڈال دیا تھا کہ وہ مجھے بچوں کے پاس لے کر جا رہا تھا ورنہ تو مجھے لگتا تھا جیسے میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خود بات شروع کی۔

''میں کل صبح دبئی روانہ ہو رہا ہوں اس لیے تمہیں وہاں چھوڑ رہا ہوں۔ جب تک میں واپس نہ لوٹ آؤں تم وہیں رہنا۔ میں ایک کیس میں بری طرح پھنس چکا ہوں۔ کسی بھی وقت گرفتار ہو سکتا ہوں اسی لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔'' اس کے منہ سے یہ سب سن کر میں چونک اٹھی۔

''لیکن تم تو خود وکیل ہو پھر؟'' ہزاروں سوال تھے میرے دماغ میں۔

''میں کوئی وکیل نہیں ہوں۔'' وہ نخوت سے بولا۔ ''جھوٹ بولتا ہوں سب سے۔ بس تعلقات ہیں میرے سب سے۔ جس کا میں فائدہ اٹھایا کرتا تھا اور سب پر بھرم دکھاتا تھا۔ اب یہی سب میرے گلے پڑ گیا ہے۔ میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر میرے ساتھ کچھ ہو جائے تو تمہارے علم میں سب ہو اور اگر کچھ کر سکو تو کر لینا۔ پیسے کی میرے پاس کمی نہیں ہے بس مجھے باہر نکال لینا۔''

پرویز کے منہ سے اتنے انکشافات سن کر میں بری طرح چونک اٹھی تھی یعنی اتنے عرصے سے وہ

ہمیں بے وقوف بنا رہا تھا اپنی جھوٹی شان دکھا رہا تھا۔ دراصل وہ تو وکیل تھا ہی نہیں بس اس کے تعلقات تھے نجانے کس کس سے۔

میں حیرت سے اسے تک رہی تھی۔ یہ شخص کتنا شاطر ہے۔ اپنے مطلب کے لیے اس نے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے۔ مجھے دھوکا دیا اسد کی زندگی برباد کردی اور ہم چاہ کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ شاید اب قدرت کی طرف سے اس کا احتساب ہو۔ کچھ تو ایسا ہو جو اس کی عقل وغرور ٹھکانے آئیں۔

یہ ظالم شاطر شخص جو اپنی جھوٹی شان میں اکڑتا ہے اب کیسا بے بس ہے۔

''تمہیں اب بھی امید ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ کروں گی حیرت ہے۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا جیسے اسے امید نہ ہو کہ میں ایسا کہوں گی۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟ میں تمہارا شوہر ہوں اتنا تو کر ہی سکتی ہو تم میرے لیے۔''

میرے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی لیکن میں نے کچھ اور بولنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس شخص سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ اگر یہ شخص مجھے اکیلا چھوڑ کر فرار ہو جاتا تب بھی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ یہی اس کی مہربانی تھی کہ وہ مجھے امی کے گھر چھوڑ کر جا رہا تھا، بہرحال مجھے امی کے گھر چھوڑ کر وہ باہر ہی سے روانہ ہوگیا اور میں اندر چلی گئی۔

بچے مجھے اچانک دیکھ کر کھل اٹھے۔ میں نے بھی انہیں بے تحاشا پیار کیا۔ امی کی بھی آنکھیں چھلک گئیں۔

مجھے امی کے گھر کافی ٹائم ہوگیا ہے۔ پرویز ہنوز فرار ہے۔ نہ جانے کس کیس میں وہ انوالو ہے لیکن میری زندگی خراب ہوگئی ہے۔

قدرت نے ہم دونوں سے ہی بدلہ لیا۔ پرویز نے میرے ساتھ جو دھوکا کیا اسے اس کی سزا ملی اور وہ چھپتا پھر رہا ہے۔ ایک نہ ایک دن قانون کی گرفت میں آ ہی جائے گا اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلے گا اور میں...... میں نے بھی تو اسد سے انتقام لینے کے لیے پرویز سے نکاح کیا تھا۔ وہ پل بھر کا انتقام کا جذبہ مجھ پر اتنا حاوی ہوگیا کہ میری پوری زندگی برباد ہوگئی۔ اسد بے قصور تھا کوئی اور شوہر ہوتا تو شاید وہ بھی یہی کرتا لیکن میں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے اسد کو تکلیف پہنچائی اس کی سزا میں آج بھی بھگت رہی ہوں اور شاید ساری زندگی بھگتوں گی۔ اگلے دن پتا چلا کہ اسد جیل میں ہے۔ میرا شک فوراً پرویز کی طرف گیا یقیناً اس نے ہی اسد کو کسی معاملے میں الجھوا دیا ہے لیکن چونکہ اسد بے قصور تھا تو مجھے امید ہے کہ وہ جلد باہر آجائے گا اور اب پرویز کی باری ہے حساب دینے کی۔ اپنے کیے کی سزا بھگتنے کی۔ قدرت کی مار کھانے کی اور مجھے یقین ہے وہ دن دور نہیں جب پرویز کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوگا اور وہ سزا بھگتے گا۔

☆......☆

ابھی میں اپنی زندگی میں سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں پوچھتا ہی رہ گیا کہ صاحب میں نے کیا کیا ہے لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی پھر میں نے لاکھ بار کہا کہ میں نے کچھ نہیں کیا لیکن مار کے آگے میری ایک نہ چلی اور پھر میں نے ان چیزوں کا بھی اعتراف کرلیا جس کے بارے میں، میں کچھ جانتا بھی نہ تھا۔ شاید پرویز کا ابھی دل نہیں بھرا ہے انتقام سے۔ وہ مجھ پر پے در پے وار کیے جا رہا ہے نہ جانے اس کا احتساب کب ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ وہ دن جلد ہی آئے گا۔ میری ماں مجھے باہر نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ شاید جلد ہی میری ضمانت ہو جائے کیونکہ میں بے قصور ہوں اور اپنی زندگی سے بہت تھک چکا ہوں۔

پتا نہیں میرے بچے کس حال میں ہوں گے اور مہوش...... وہ پرویز کے ساتھ اب بھی خوش ہوگی یا نہیں۔ اب تو بس یہ جیل کی کوٹھڑی ہے اور میں ہوں۔ قارئین میرے لیے آپ دعا تو کریں گے نا میری کہانی پڑھ کر۔

☆☆

عشق کی انوکھی کتھائیں؟ جو یقیناً آپ کے ذہنوں پر نقش ہو جائیں گی
عشق نمبر کی 6 دل نشیں نقش آفریں کہانیاں؟



بے چاری شمو!

ارم ناز

عشق کی تفسیر لیے حقیقی تصویر عشق ایسے عشق ہر دوسرے محلے میں عوامی تفریح کا ساماں ہوتے ہیں

شمو تھی رمضان بھائی عرف رمضو کی پانچوں بیٹیوں میں سب سے بڑی بیٹی۔ دونوں لڑکے چھوٹے تھے۔ رمضو گلی گلی پھیری لگا کر پان چھالیہ بیچتا تھا۔ لڑکیاں سگھڑ تھیں مگر زبانیں بنا دھار لگائے تیز تھیں۔ جب آپس میں لڑتیں تو دوسری جنگ عظیم کا گمان ہوتا۔ ایک دوسرے کے وہ وہ عیب گنوائے جاتے جو انہیں پیدا کرنے والی ماں بھی نہ جانتی تھی۔ ان کی ماں خاموش طبع اور اپنے آپ میں گم رہنے والی عورت تھی۔ رمضو گھر کا ہر کام جانتا تھا۔ کھانا پکانے سے لے کر سویٹر بننے تک، اسی لیے اس کے



آگے بیوی کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بیوی کا پکایا ہوا بد ذائقہ کھانا وہ اس کے منہ پر دے مارتا۔ جب باپ عزت نہ دیتا تو اولاد کس طرح عزت دے سکتی تھی، بس وہ اس گھر میں فالتو چیز کی طرح رہ رہی تھی۔ لڑکیاں جہاں سگھڑ تھیں وہاں فیشن میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک سے ایک کپڑا خود کاڑھ سی کر پہنتی تھیں اور ایک سے ایک میک اپ کرتیں۔ پکے رنگ والی شمو ہمیشہ لال سرخی سے ہونٹ رنگتی۔ گھنٹوں لگتے کاجل کی ڈوریاں دیا سلائی سے کھینچنے میں۔ اس زمانے میں صرف سرکاری چینل ہی آتا تھا لہٰذا ہر فیشن آٹھ بجے کے ڈرامے سے کاپی ہوتا تھا اب تو ٹی وی پر اتنے چینلز ہیں جتنے برسات میں مینڈک۔ محلے محلے گلی گلی کی خبر ٹی وی پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ شاید کچھ دنوں میں یہ بھی سننے کو ملے کہ کس کے گھر کیا پکا ہے، شکیلہ کے گھر لڑکی ہوئی ہے، پپو نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور مجھے تو خوف اس شبیر کا ہے جو سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی شمو کی، باقی چار تو پھر قبول صورت تھیں مگر شمو کو اللہ نے بھٹی میں زیادہ ہی سینک دیا تھا۔ لڑکیوں کی شادی کی عمر تھی مگر نہ تو ماں کو ہوش تھا نہ باپ کو فکر۔ لڑکیاں بھی جانتی تھیں کہ انہیں اپنی مدد آپ کرنی ہوگی۔

شمو کی زندگی میں اتھل پتھل تب شروع ہوئی جب ان کا ایک دور پار کا کزن اچانک آدھمکا۔ ان دنوں گلوکار شوکت علی بہت مشہور تھا۔ یہ کزن آفاق بالکل شوکت علی کی طرح گبرو جوان تھا۔ آفاق کی رشتے داری رمضو کی طرف سے تھی۔ خاندانی جھگڑے کی وجہ سے کافی عرصے سے ملنا جلنا بند تھا مگر آفاق چھپ چھپا کر شمو کے گھر آجاتا۔ پھر لڈو، کیرم کی محفل جمتی، چائے کا دور چلتا۔ بات بے بات قہقہہ بلند ہوتا...... زندگی اپنی تمام تر رنگینیاں بکھیر رہی تھی اور جوانی تیز گام کی طرح دوڑ رہی تھی۔ آفاق کی طرف سے کوئی ذومعنی جملہ اچھال دیا جاتا تو وہ چاروں جوان لڑکیاں من ہی من میں مسکراتی رہتیں۔ پانچویں ابھی چھوٹی تھی وہ تو ہونق بنی چاروں بہنوں کی لن ترانیاں دیکھتی۔ آفاق کی محبت کی قوس وقزح نے چاروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ آفاق نے گو کمیٹی ڈالی تھی، اب انتظار یہی تھا کہ پہلا نمبر کس کا آتا ہے۔

آفاق کو ان چاروں سے تحفے تحائف ملتے رہتے۔ کڑھائی والا کرتا، سفید نگوں والی انگوٹھی، چنبیلی کا پرفیوم، میوزک والی لائٹر...... مفت میں اتنے تحفے مل رہے ہوں تو کون کافر انکار کرتا ہے۔ بدلے میں صرف ایسی گول مول باتیں کہ سب خوش رہیں۔

آفاق رمضو کے گھر اندھوں میں کانا راجا بنا بیٹھا تھا۔ اس کی تواضع قسم قسم کے کھانوں سے ہوتی تھی۔ کئی دنوں سے رمضو یہ ڈرامے بازی دیکھ رہا تھا، ایک دن آفاق کو گدی سے پکڑ لیا۔

''کیوں بے لونڈے سارا سارا دن یہاں پڑا رہتا ہے۔ کام دھندے پر کس وقت جاتا ہے؟''

''وہ چچا نائٹ ڈیوٹی ہے، نو بجے جاؤں گا۔''

''ابے مجھے تو آج کل تو کوئی اور ڈیوٹی دیتا نظر آتا ہے۔ اپنی ماں سے بولیو چچا نے بلایا ہے۔''

آفاق نے چچا کا پیغام اماں کو دیا۔ اماں بھی ہانپتی کانپتی، دوڑی چلی آئیں۔ رمضو نے کہا لڑکیاں جوان ہیں اپنے لونڈے کو لگام ڈال۔

آفاق کی اماں نے سچ مچ کی لگام کا انتظام کر دیا یعنی شمو کا رشتہ آفاق کے لیے مانگ لیا۔ رمضو نے قبول بھی کر لیا۔ ان تیز طرار پانچ بلاؤں کو کہاں لے کر جاتا۔ آفاق کی اماں لوٹ گئیں شمو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ باقی تین بھوکی شیرنیاں بنی بیٹھی تھیں۔ تینوں کا یہی کہنا تھا کہ آفاق میرا ہے، وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

رمضو کے گھر اس فیصلے سے بھونچال آگیا۔ چاروں نے ایک دوسرے کی چٹیا پکڑ لی۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے دما دم مست قلندر سنتے آئے تھے آج وہ دیکھ بھی لیا۔

وہ جدید گالیاں جملے بازیاں کہ جو سنتا کانوں سے دھواں نکلنے لگتا۔ البتہ پانچویں کونے میں زمین

میں گھسی روتی رہیں۔
آخر کار رمضو کو معاملہ سنبھالنا پڑا۔

''خاموش کرو بے غیرتو، چڑیلوں ابھی بڑی خالہ کو بلواتا ہوں۔ وہی تمہارا فیصلہ کریں گی۔''

بڑی خالہ رمضو کے خاندان میں اقوام متحدہ جیسی تھیں ہر نہ سلجھنے والا مسئلہ ان کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ بڑی خالہ نے چاروں لڑکیوں کو وہ وہ سنائیں کہ رہے نام سائیں کا۔ آفاق کو بلا کر پوچھا کس سے شادی کرے گا تو اس نے جواب دیا۔

''چاروں سے جو بھی مل جائے۔''

شمو بڑی تھی اس لیے خالہ نے قرعہ شمو کے نام نکالا، باقی تینوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

☆......☆

جمعے کے مبارک دن نکاح ہونا قرار پایا۔ رمضو نے جہیز کے نام پر چند چیزیں اکٹھی کی۔ شمو نے بروکیڈ کا سرخ غرارہ پہنا۔ آفاق بھی پکا سہرا باندھے قاضی کی ہمراہی میں چلے آئے۔ سہرے کی چار لڑیاں آپس میں ٹکرا کر لڑ رہی تھیں۔ شمو کی تینوں بہنیں سرخ آنکھوں اور اجڑے بالوں کے ساتھ گھر اوندھائے بیٹھی تھیں۔ نکاح ہوا سب نے ایک ایک کپ چائے کا پیا اور شمو آفاق کے ساتھ رخصت ہو کر اس کے گھر آ گئی۔

اچھے دن صرف پانچ ہی تھے پھر وہی جوتم پیزار...... آفاق چھ دن کماتا اور آٹھ دن بیٹھ کر کھاتا۔

اسی کھینچا تانی میں ایک بیٹا ہو گیا۔ خرچہ ساس نے برداشت کیا۔ شمو زبان کی تیز تھی اس لیے ساس سے بھی نہ نبھ پائی۔ ساس نے سامان سمیت نکال باہر کیا۔ جلد بازی میں ایک کرائے کا گھر ملا اور پھر کرائے کا گھر ہی نصیب ہو گیا۔ آٹے دال کا بھاؤ اور گھر کے کرائے نے آفاق میاں پر سے محبت کا بھوت اتار دیا۔ معاشی تنگی وہ واشنگ پاؤڈر ہے جو محبت کے رنگ کو دھو کر اتار دیتا ہے۔ پہلا بچہ ابھی دو سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ دوسرے کی آمد ہو گئی۔ دوسرا تیسرا پھر چوتھا...... حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ چار بچوں کے بعد محبت دم دبا کر بھاگ گئی۔ آئے روز شمو اپنی زبان کی وجہ سے آفاق سے مار کھاتی۔ سارا محلہ آئے دن کا ڈراما دیکھتا۔ اب تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کرانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بچے بھی ماں کی طرح بدزبان اور باپ کی طرح ہاتھ چھوٹ تھے۔ یہ حالات ہونے کے باوجود بھی شمو کی لال رنگ کی سرخی اور کاجل کے ڈورے کم نہ ہوئے تھے۔ بڑی سخت جان عورت تھی۔

☆......☆

ایک دن زوردار لڑائی ہوئی، نہ شمو کی زبان رکی تھی نہ آفاق کے ہاتھ اور پھر غصے میں آفاق نے طلاق دے دی۔ شمو بچے لے کر رمضو کے گھر آ گئی۔ واضح الفاظ میں دی گئی تین طلاقیں سارے محلے نے اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ بہنوں نے شمو کے آنے پر منہ پھلا لیا۔ رمضو نے بھی سر پکڑ لیا۔ خدا خدا کر کے تو یہ چڑیل گھر سے رخصت ہوئی تھی۔

ماں باپ کے گھر کچھ دن گزار کر شمو کو آفاق کی یاد ستانے لگی۔ شمو نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آفاق نے تو صرف دو طلاقیں دی تھیں۔ رمضو نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے واپس جانے کی کوئی صورت تو نظر آئی۔ آفاق گھر کے قریبی پارک میں بیٹھ کر خط لکھتا اور کسی بچے کے ہاتھ شمو کو بھجواتا۔ شمو بھی جوابی محبت نامہ لکھ کر کسی بچے سے بھجوا دیتی۔

یہ عشق محبت کا کھیل دیکھ کر محلے والے ہنستے۔ محبت نامے کے ساتھ ساتھ میٹھے پان اور چھولے کی چاٹ کے بھی تبادلے ہونے لگے۔

ایک مرتبہ پھر بڑی خالہ کو طلب کر لیا گیا۔ بڑی خالہ نے مفتی سے پوچھ کر شمو کو آفاق کے ساتھ روانہ کر دیا۔ طلاق کے معاملے میں شمو نے غلط بیانی سے کام لیا اور پھر گھر بسا لیا۔ پھر وہی جوتم پیزار آفاق مارے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ شمو کا پٹے بغیر کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے۔ اسے کہتے ہیں محبت۔ شمو کی محبت نے پھر سے آس کے دیپ جلا کر گھر کی جو منت مانگی تھی۔ اللہ نے پوری کر دی تھی۔

☆☆☆

لالہ موسیٰ سے دوسری دردبھری محبت کہانی

بڑی باجی

عابدہ طارق

اُس بہن کی محبت کا مآل، جس نے اپنوں پر خود کو قربان کردیا

میرے والد صاحب مزمل احمد شروع سے درس و تدریس کے شعبے سے منسلک تھے اور یونیورسٹی میں معلم کے فرائض بڑے احسن طریقے سے انجام دے رہے تھے۔ والدہ ریحانہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور کالج میں لیکچرار تھیں۔ گزر اوقات بہت اچھی ہو رہی تھی۔ ماں باپ ہم سب بہن بھائیوں سے بہت پیار کرتے تھے۔

دونوں بہنیں پڑھائی میں جتنی اچھی تھیں، بھائی اتنے ہی پڑھائی سے دور بھاگتے تھے۔ ماں باپ کو ان دونوں کی تعلیم کی طرف سے بہت پریشانی رہتی تھی۔ مگر کیا کر سکتے تھے سوائے سمجھانے کے۔

اور حالات نجانے کیسے ہو جائیں یہ سوچ رکھتی تھیں ہماری والدہ۔

ہم تینوں بہنوں کے لیے ماں نے بہت جہیز بنا کر رکھا ہوا تھا کہ آخر ایک نہ ایک دن بیٹیاں رخصت ہوتی ہی ہیں مگر قسمت کی ستم ظریفی کہ وہ ہماری خوشیاں نہ دیکھ سکے اور تمام خواہشیں دل ہی میں لے کر چلے گئے۔

☆...☆

محلے بھر میں ہمارا گھر پڑھا لکھا اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ زندگی جیسے ٹھہر سی گئی تھی اور سوچوں نے اپنا گھیرا کر رکھا تھا۔ کیا سے کیا ہو جاتا ہے انسان تو کبھی وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا کہ آئندہ آنے والا وقت اس کے لیے کیسی سوغات لا رہا ہے۔

ہما بھی اسی تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کو اپنی تعلیم چھوڑنا پڑی تھی کیونکہ بڑے ہونے کے ناتے ہر ذمہ داری اسی پر تھی۔ ندا اور حرا بہت روتی تھیں ماں باپ کو یاد کر کے، بھائی بھی روتے اور چپ ہو جاتے تھے رونا مقدر بن چکا تھا۔ وہ سب کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی۔

مگر اس کے آنسو سمیٹنے والا تو کوئی بھی نہ تھا۔ ہر نماز میں اپنے لیے دعا کرتی کہ یا اللہ چار بہن بھائیوں کا بوجھ مجھ پر آن پڑا ہے تو مجھ کو ہمت اور حوصلہ دینا کہ میں ان کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھا سکوں۔"

وہ خود کو اکیلا پا کر بہت روتی تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار لگنے لگی تھی۔ ہر ذمہ داری کو بخوبی نبھاتی، بہن بھائی کا اسکول کالج چلے جاتے تو وہ گھر کے کاموں میں جت جاتی۔ ندا اور حرا

تھرڈ ایئر اور فورتھ ایئر میں تھیں۔ بھائی نویں، دسویں جماعت میں تھے۔ ہما ایم اے، اسلامیات کے آخری سال میں تھی مگر سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ زندگی امتحان بن گئی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ ماہ و سال دبے پاؤں سرکتے رہے۔ ندا اور حرا نے بی اے کے بعد تعلیم کو خیر آباد کہہ ڈالا۔ میں نے بہت کوشش کی ان کو پڑھانے کی مگر گھر کے حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ اس



طرح ہم تینوں بہنوں نے گھر میں ہی اکیڈمی کھول لی۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ امی ابو جب زندہ تھے تو ہمارے بہت سے رشتے آئے مگر میں اپنی تعلیم مکمل کر کے کچھ کرنا چاہتی تھی تو امی ابو نے بھی زور نہ دیا۔ ہمیشہ میری طاقت بنے رہے۔ مگر میں تو اب خود کو بھول بھی چکی تھی، میں اب سب کے لیے ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کر رہی

تھی۔ اس لیے اپنی تمنائیں، خواہشیں دل سے نکال پھینکی تھیں۔ کیونکہ میرا مرکز صرف اور صرف میرے بہن بھائی تھے۔

ہماری اکیڈمی اچھی چل نکلی تھی۔ خوب آمدن ہونے لگی تو پریشانیاں بھی کم ہوتی چلی گئیں مگر اب ندا اور حرا کی شادی کی عمر تھی اور یہ پریشانی مجھے اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ میں نے اپنی ایک خالہ ان سے دونوں بہنوں کے لیے اچھے رشتے ڈھونڈنے کا کہا لیکن جواب ملا کہ پہلے تمہاری شادی ہونی چاہیے بعد میں کسی اور کی۔'' میں ان کی بات سن کر بولی۔

''خالہ میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ میرے سامنے چار ذمہ داریاں ہیں جو مجھی کو نبھانی ہیں۔ آپ بس دونوں کے لیے کچھ کوشش کریں۔''

آخر میرے بے حد اصرار پر وہ راضی ہو گئیں۔ ندا اور حرا کی قسمت جاگی اچھے رشتے ملے اور دونوں اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں تو مجھے

بھی سکھ کا سانس ملا۔ جنید اور حیدر بی اے کر کے فارغ تھے۔ جنید کو ٹیکنیکل فیلڈ میں جانے کا شوق تھا۔ اس نے اسپیئر پارٹس کی دکان کھول لی، وہ اس میں لگ گیا اور موٹر بائیک اور گاڑیوں کی مرمت بھی کرتا تھا۔

حیدر کو باہر جانے کا شوق چرایا مگر بغیر ہنر کے کامیابی ناممکن ہوتی ہے۔ جنید نے کہا کہ میرے ساتھ دکان پر بیٹھا کرو۔ اس کو بڑھائیں گے مگر اس کے دماغ میں تو باہر جانے کی دھن سوار تھی۔ سو وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ حیدر چلا گیا اور مجھے اداس کر گیا۔

ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ دوسروں کے لیے قربانی دینے والے آخر میں خود اکیلے ہی رہ جاتے ہیں۔ کم عمری میں جب چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری کندھوں پر آجائے تو سوچ اپنے آپ بڑی ہو جاتی ہے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ماں باپ کی قدر کرتے ہیں، ان کی دعائیں لیتے ہیں۔

میں اب صرف مذہبی درس و تدریس کی بچیاں پڑھانے لگی کیونکہ میں اب اکیلی تھی۔ لہٰذا قرآن اور درس کی تعلیم دینے لگی۔ میرے گھر سے تلاوت قرآن کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو دل کو سرور سا آنے لگا۔ میری کوئی دوست یا سہیلی نہ تھی۔

سب مجھے ''بڑی باجی'' کے نام سے بلانے لگے۔ خالہ نے کئی جگہ میرا رشتہ لگوایا مگر عمر زیادہ ہے کا کہہ کر رشتہ ختم کر دیا جاتا۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو میں نے خالہ کو منع کر دیا کہ اب کسی کو مت لے کر آنا مجھے نہیں کرنی شادی۔''

اپنا ایک گھر ہو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے مگر میں نے سب کچھ اپنوں پر قربان کر دیا۔

☆......☆

حیدر نے جا کر صرف ایک بار فون کیا۔ اس کے بعد کچھ خبر نہ ملی۔ میں بہت روئی اس کے لیے۔ بہت معلومات حاصل کیں مگر وہ تو ایسے ہو گیا جیسے یہاں پر اس کا کوئی تھا ہی نہیں۔

نماز میں بھی دعا کرتی یا اللہ جہاں تک ہو سکا میں نے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی۔ مجھے سب کی نظروں میں اور ماں باپ کی نظروں میں سرخرو رکھنا۔

سب بہن بھائیوں کے لیے بہت دعا کرتی، ان کی کامیابی اور خوشیوں کے لیے اب تو میں نے خود کو وقف کر دیا ان بچیوں کے لیے جو قرآن حفظ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے شوق اور جذبے کو دیکھ کر میں ہر قدم پر ان کا ساتھ دیتی اپنے علم کو ان تک پہنچاتی رہتی۔ جیسے وہ بہت توجہ سے سنتی تھیں اور مجھے اپنے اندر سکون حاصل ہوتا تھا اور فخر ہوتا تھا کہ میں نے اپنے والدین کی دی ہوئی تعلیم اور تربیت کا صحیح استعمال کیا ہے۔ میری اب صرف ایک ذمہ داری تھی اور وہ تھا جنید!

میں اکثر اس سے کہتی کہ جنید اب تم بھی شادی کر لو تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔''

''آپی ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ مجھے آپ کی ابھی بہت ضرورت ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے آپ کے لیے میں نے۔

آپ نے ساری زندگی ہماری خواہشیں پوری کرنے پر لگا دی۔ پہلے آپ کی شادی ہوگی بعد میں اپنا سوچوں گا۔''

میں ہنس دیتی۔ ''اب اس عمر میں، میں شادی کرتی اچھی لگوں گی۔ چلو میں دیکھتی ہوں کوئی لڑکی تمہارے لیے۔''

جنید بات ٹال دیتا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

☆......☆

خوشیاں نجانے کم وقت کے لیے کیوں حصے میں آتی ہیں۔ سب کو خوشیاں دینے والی کی زندگی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ایک دم سے قسمت پلٹا کھا گئی۔ جو بھی سوچا نہ تھا وہ ہو گیا۔

کیا رشتے ایسے بھی بدل جاتے ہیں۔ شک کی پٹی ایسی بندھی کہ کسی کی جان ہی چلی گئی۔ ہما نے کچھ دنوں کے لیے درس کی بچیوں کو چھٹی دے رکھی تھی تو خالہ جو پوچھنے آئیں مگر ہما کی حالت اس قدر خراب

دیکھ کر وہ تو پریشان ہو گئیں۔

''ہما کیا ہوا ہے میرا بچہ۔ اس قدر تیز بخار میں پھنک رہی ہو۔ رنگ کیسا زرد ہو گیا ہے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ آخر بات کیا ہے اور جنید کدھر ہے۔ چلو تم میرے ساتھ اسپتال۔'' خالہ نے جو بولنا شروع کیا تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں خالہ ہلکا سا بخار ہے ٹھیک ہو جائے گا، آپ پریشان مت ہوں۔'' اور رونا شروع کر دیا اور ساری بات خالہ کے گوش گزار کر ڈالی۔

خالہ تو جیسے آگ بگولہ ہو گئیں اور جنید کو لعن طعن کرنے لگیں تم فکر نہ کرو میرا بیٹا، میں سب ٹھیک کر دوں گی۔''

''نہیں خالہ وہ اب نہیں آئے گا وہ مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے نہ آنے کے لیے۔ مجھ کو سب چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا قصور کیا تھا۔ میں نے ان کی پرورش میں کہاں کوتاہی برتی۔ جنید نے تو مجھے جیتے جی مار ڈالا۔ میرے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں رہا۔ میں اکیلی رہ گئی خالہ، ہاں میں اکیلی رہ گئی۔

میں ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی، میں تو ان سب کے لیے روشنی کا ستارہ بنی رہی۔ خود کو مٹا ڈالا۔ ایک اچھی زندگی کے خواب دیکھتی تھی کہ بھائی میرا آسرا بنیں گے۔ میری امید بنیں گے میری محبتوں اور قربانیوں کا کچھ تو صلہ دیں گے جس کو پا کر میں اپنی بے رونق زندگی کی سحر کو پالوں گی مگر یہ سب کیا ہو گیا......''

وہ روتی رہی۔ خالہ بھی آنسو بہاتی رہیں اور روتی رہیں۔

''مت رو، میرا بچہ۔'' خالہ نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور وہ جیسے نیم بے ہوش ہو گئی تو خالہ گھبرا کر ڈاکٹر کو لینے بھاگیں۔ لیکن وہاں تو کچھ بھی باقی نہ رہا۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر ہما کی موت کی تصدیق کر دی اور خالہ یہ خبر سن کر وہیں ڈھے گئیں۔

محلے میں اچانک یہ خبر بجلی بن کر گری کہ بڑی باجی مر گئیں۔

☆......☆

جنید تم شک کی چنگاری میرے دامن میں ڈال کر سرخرو ہو گئے۔ میں تو تمہاری ماں کی جگہ تھی اور تم میرے بیٹے جیسے۔ مگر تم نے ایک منٹ میں اس رشتے کو شک کی ایسی گالی بنا دیا کہ جس نے مجھے ایک لمحہ بھی سکون سے رہنے نہ دیا۔ میرا دامن پاک تھا اور مرتے وقت بھی پاک ہے۔

کریم صاحب تو اپنی بیٹی حنا کی بات کرنے کی غرض سے آئے تھے تم گھر پر نہیں تھے تو وہ دروازے پر ہی کھڑے ہو کر تمہارے رشتے کی بات کر رہے تھے۔ نہیں یقین تو تم خود حنا سے پوچھ لینا۔

وہ خط نہیں تھا اس میں حنا کی تصویر تھی جو نقاب لے کر میرے پاس پڑھنے آتی تھی اس نے کتنی دفعہ خود بھی تم سے چاہت کا اظہار کرنا چاہا تمہارے لیٹ گھر آنے کی وجہ سے میں تم سے بات نہ کر سکی۔

جنید تم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا۔ مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ تم نے تو میری کسی بھی قربانی کا کوئی صلہ نہ دیا اور ایک شک کی بنا پر میری ساری زندگی کی محنت پر پانی پھیر دیا مگر میں پھر بھی تم کو بددعا نہیں دوں گی۔ کوئی شکوہ نہیں ہے تم سے۔ بس آخری بات کہ جب اپنے ہی شک کے شعلوں سے دامن بھر دیں، جلا دیں تو پھر زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا۔ میرے پاس تو اب صرف تم ہی امید اور میری سحر تھے۔''

جنید پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے ماں جیسی بہن کو مار ڈالا۔

وہ خط جو ہما نے مرنے سے پہلے لکھا تھا جنید کے لیے خالہ نے اس تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ہما کے قدموں میں بیٹھا سر جھکائے پچھتاوے کے آنسو بہا رہا تھا۔ اب معافی مانگتا بھی تو کس سے۔ دوسروں کو روشنی دینے والی اب خود اندھیر نگری چلی گئی تھی۔ سو چکی تھی ہمیشہ ابدی نیند۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ڈوب سے تیری منفرد عشق کی کتھا

عشق کی معراج



عمران مظہر

اُس محبت کا فسانہ جو ملن ہوتے ہی اپنے مفہوم کھو بیٹھا

بڑا سکون تھا شجاع کے ساتھ۔ میں اس کی موجودگی میں سکون سے آنکھیں موند لیتی۔ شجاع اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہتا اور کبھی کبھی اُس کو اس طرح سکون سے سوتا دیکھ کر اور اس کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر شجاع کے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ عود آتی۔ احساس کا یہ سارا عمل جذبوں کی پاکیزگی پر ہوتا۔ اُس سے اُن دونوں کے درمیان صرف احساس رہتا۔ اس سے آگے وہ کبھی نہیں بڑھتے تھے۔ یہی زندگی تھی شجاع اور سویرا کی۔

دونوں نجی بینک میں کام کرتے تھے۔ دونوں کزنز تھے، اچھے دوست تھے اور دونوں اپنے شہر سے دور اپنے کام کی وجہ سے یہاں اکٹھے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔

وہ دن بہت فرحت بخش تھا جب شجاع کو محسوس ہوا تھا کہ اُن دونوں میں دوستی سے بڑھ کر بھی کوئی رشتہ پنپ رہا ہے اور شجاع نے سویرا کو اس کا احساس دلانے میں دیر نہیں کی تھی۔ اُس نے سویرا سے دل کی بات کہہ دی تھی۔

یہ سن کر سویرا کی نظریں شرم سے جھک گئی تھیں اور جب شجاع نے اُس کی ٹھوڑی آہستہ سے اوپر کی تھی تو اُس کی غزالی آنکھوں میں معصوم سے جگنو چمک رہے تھے۔ شجاع اُس کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا اور جذبات کی شدت میں بہتے ہوئے اُسے گلے لگا لیا تھا۔ یہ اقرار کا لمحہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں۔

دن بھر کی مصروفیت کے بعد جب وہ دونوں شام کو اپنے فلیٹ آتے تب شجاع گٹار پر کوئی دھن چھیڑ دیتا اور سویرا اُس کی چاہت کے احساس میں قطرہ قطرہ گھلتی رہتی۔ لفظ ان کے لیے ثانوی تھے۔ لفظوں سے زیادہ وہ احساس کی زبان سمجھتے تھے۔ ان کے رشتے میں پاکیزگی پور پور بسی ہوئی تھی۔ احساس کا یہ کارواں بہت پرسکون تھا۔ جسموں کو چھونے اور اپنی پاکیزگی کو فنا کرنے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دونوں عشق کی معراج کے زینے طے کر رہے تھے۔

اُس دن بہت زور کی بارش برس رہی تھی۔ سویرا مارکیٹ میں کہیں پھنس گئی تھی۔ شجاع گٹار پر کسی دھن کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہا تھا جب سویرا پوری طرح بھیگی ہوئی فلیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ شجاع نے ایک نظر اُسے دیکھا اور پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ سویرا نے شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں۔ شجاع چند ثانیے اُسے یونہی دیکھتا رہا۔ یہ پہلی بار تھا جب پاکیزگی کے دریا

میں کوئی میلا کنکر گرا تھا۔

سویرا چند لمحے یونہی بھیگی کھڑی رہی پھر آہستہ سے پلکیں اٹھائیں۔ شجاع کو یوں اپنی طرف دیکھتے وہ گڑبڑائی لیکن پھر سنبھل کر شجاع کے ٹرانس کو توڑا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ پہلے کبھی نہیں دیکھا کیا؟"

شجاع چونکا اور سر جھٹک کر بولا۔

"جاؤ جا کر کپڑے بدل لو، سردی لگ جائے گی۔"

یہ سن کر سویرا واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ شجاع گٹار کی تاروں کے ساتھ فضول کی کشمکش کر رہا تھا۔ آج اُس کی دھن لڑکھڑا رہی تھی۔ احساسات کی زبان وہ دونوں سمجھتے تھے اور اس وقت ایک دوسرے کی حالت کو وہ دونوں بخوبی سمجھ رہے تھے لیکن پاکیزگی کی حدیں پھلانگنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ رات اسی کشمکش میں گزرتی چلی گئی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ جب بھی اُن دونوں کو تنہائی میسر آتی تو وہ چور بن جاتے۔ اپنے جذبوں کی چوری کرتے۔ خود کو سنبھالنے کی جستجو ماند پڑنے لگی تھی۔ یہ اذیت اُن پر بھاری ہونے لگی۔ وہ خود سے ہارنے لگے تھے۔ جذبوں کی یہ جنگ زیادہ دن نہ چل سکی اور آخرکار اُن دونوں نے ہار مان لی۔ اُس دن نہ برسات تھی نہ شجاع کی نظروں میں کوئی وارفتگی تھی بلکہ سویرا معمول کی طرح شجاع کے ساتھ تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، لیکن آج...... وہ دونوں جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ احساس کی زبان آج مر گئی تھی اور پاکیزگی اپنے لٹنے پر ماتم کر رہی تھی۔

اگلے دن آفس میں ایک معمولی سی بات کو لے کر اُن دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن دونوں نے آپس میں بات کرنا بند کر دی۔ سارا دن وہ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہے لیکن شام کو پھر وہ تھے، گٹار تھا لیکن احساس نہ تھا۔

اُن دونوں کے جھگڑے اب روز کا معمول بنتے جا رہے تھے۔ جہاں وہ دونوں پہلے بنا کہے احساس کی



زبان سمجھ لیتے تھے اب انھیں لفظوں کی تکرار کرکے بھی ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھانا ناممکن لگتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ پیار مرتا جا رہا تھا۔

آج سویرا کا ڈنر اپنے باس کے ساتھ تھا۔ اور شجاع کو اس کی کمی شدت سے کھل رہی تھی۔ اُسے گٹار بھی آج زہر لگ رہا تھا۔ وہ باؤلے جانور کی طرح ادھر اُدھر بوکھلا رہا تھا۔ سویرا کافی دیر بعد لوٹی۔ وہ تھکی ہوئی تھی اور آتے ہی بیڈ پر ڈھے گئی۔

''کہاں تھیں تم اتنی دیر؟'' شجاع تقریباً چیختا ہوا اُس کے پاس آیا تھا۔

''پلیز شجاع اب پھر سے جھگڑا شروع مت کرنا، میں تھکی ہوئی ہوں، مجھے سونا ہے۔'' سویرا نے اکتا کر جواب دیا۔

''اچھا......؟؟ اپنے باس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے بڑا مزہ آیا ہوگا نا؟''

شجاع نے طنز کیا اور شجاع کا یہ طنز سویرا کو سلگا گیا اور اُس نے شجاع کے گال کو پانچ انگلیاں دکھا دیں۔ شجاع اپنی توہین سے تلملا اٹھا اور چیختے چلاتے ہوئے اُسے بازو سے پکڑ کر فلیٹ سے باہر نکال دیا۔ وہ فلیٹ کا دروازہ پیٹتی رہی۔ لیکن شجاع پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سویرا کو کوئی اور راستہ نظر نہ آیا تو وہ اتنی رات کو اپنے باس کے گھر چلی آئی۔

☆......☆

وہ دونوں الگ ہوگئے تھے۔ آفس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے۔ آپس میں کوئی بات نہ کرتے۔ اُن دونوں میں انا کی دیوار کھڑی ہوگئی تھی۔ اپنے تئیں وہ دونوں ایک دوسرے کو بھول چکے تھے لیکن یہ اُن کی غلط فہمی تھی۔ کام ختم کرتے ہی دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ یہ ہی انھیں کہیں نہ کہیں کھلنے لگی تھی۔ لیکن انا کی دیوار گرانا انھیں پل صراط پہ چلنے سے بھی مشکل لگتا تھا۔

ایک شام جب سارا اسٹاف کام ختم کرکے نکل گیا تھا۔ سویرا آفس میں ہی بیٹھی رہ گئی۔ وہ دانستہ نہیں بیٹھی تھی نہ اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ سوچتے سوچتے کہیں کھو گئی۔ وقت سے اس طرح [illegible]

میں وہ حقیقتوں کی سیڑھیاں بہت تیزی سے چڑھتی اٹھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ کتنا سکون اور پیار تھا۔ شجاع اور اس کے درمیان وہ پیار، وہ سکون آخر کہاں چلا گیا۔ جس دن سے انھوں نے احساس کو چھوڑ کر صرف نفس کو اپنی ضرورت بنایا تھا سب کچھ تہس نہس ہو گیا تھا اور رہی سہی کسر اُن کی انا اور ضد نے پوری کردی تھی۔ قصور تو دونوں کا تھا۔ سزا بھی دونوں بھگت رہے تھے۔

وہ سوچوں کی پرواز میں بھٹک جاتی اگر اُس کے موبائل کی بیل نہ بجتی۔ وہ چونکی اور موبائل کان سے لگایا۔ دوسری طرف اُس کا باس راحیل تھا۔

''کہاں ہو بھئی۔ بہت دیر کردی؟''

''ہاں وہ میں آفس میں ہوں۔ آرہی ہوں آدھے گھنٹے میں۔'' سویرا نے ٹالنا چاہا۔

''تمھیں نہیں لگتا تم رونگ نمبر وے پر جا رہی ہو؟'' راحیل نے ایک دم سے موضوع بدلا۔

''جی......'' سویرا چونکی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو سویرا میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔'' راحیل کا لہجہ از حد سنجیدہ تھا۔ وہ شجاع اور سویرا کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔

''ہاں......'' سویرا نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کرسی سے ٹیک لگائی۔ ''کیا کروں میں، کچھ سمجھ نہیں آرہا۔''

''تمہارا دل کیا کہتا ہے؟'' راحیل نے فوراً سوال کیا۔

''تم جانتے ہو راحیل کہ میرا دل کیا چاہتا ہے۔ بس دماغ اور دل کی لڑائی میں میں پس رہی ہوں۔'' سویرا نے تھکا تھکا سا جواب دیا۔

''سویرا صرف دل کی سنو۔ تمھیں دل کبھی غلط راہ پہ نہیں لے جائے گا۔ دماغ کی صرف وہ سنتے ہیں جن کے پاس دل نہیں ہوتا۔'' راحیل نے مشورہ دیا۔

سویرا نے مزید کوئی بات کیے بنا موبائل بند کردیا اور موبائل ہاتھ میں لہراتے ہوئے کتنی دیر صرف اُسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم سے ایک جھٹکے سے وہ اٹھی۔ جلدی سے بیگ کاندھے پر ڈالا اور باہر کی جانب مڑ گئی۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ شجاع کے فلیٹ کے دروازے پہ تھی۔ اُس نے بیل بجائی۔ چند ثانیے بعد

شجاع نے دروازہ کھولا۔ سامنے کھڑی سویرا کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ لیکن پھر کتنی ہی دیر دونوں صرف ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پلکیں جیسے جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اسی اثناء میں سویرا کی آنکھوں سے دو موتی نکلے اور اس کے گالوں کو بھگوتے چلے گئے۔

''میں سمجھ گئی شجاع۔ محبت کا احساس صرف جذبوں کی پاکیزگی پر ٹکا ہے۔ اگر نفس کو چھو لیا جائے وہاں یہی ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ہوا۔'' وہ دھیمے سے بولی تھی۔

اس کی بات جاری تھی کہ شجاع گھٹنوں کے بل ڈھے گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

''سوری سویرا..... سب قصور میرا ہے۔ مجھے خود کو سنبھالنا چاہیے تھا لیکن میں بہک گیا۔ میں معافی کے قابل نہیں ہوں سویرا۔ میں بہت برا آدمی ہوں۔ مگر تم صرف میری ہو اور میں تمہیں جائز طریقے سے اپناؤں گا۔''

''شش..... شش!'' سویرا نے اسے پچکارا۔ کاندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے گلے لگ پڑی۔

''غلطی میری بھی ہے شجاع۔ ہم آئندہ اپنی محبت کو اپنی ناجائز خواہشات کی نذر نہیں کریں گے۔ وعدہ کرو شجاع۔''

سویرا نے اپنا ہاتھ شجاع کی طرف بڑھایا۔ شجاع نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مسکرا اٹھی۔

''بہت دن سے تمہارے گٹار پر کوئی دھن نہیں سنی۔'' سویرا نے نم آنکھیں انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے فرمائش کی۔

شجاع نے اسے بھینچا اور اسے لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن ان کی محبت کی معراج پانے والی تھی کیونکہ آج کی اس رات دونوں کا فیصلہ شادی کے بندھن میں بندھنے کا تھا۔ کورٹ میرج کر کے وہ اس محبت کو معراج بخشنے والے تھے۔

☆☆☆

شہرِ عروس البلاد سے پہنچی حساس محبت کہانی

گڑیا

نسیم سحر

اُس فرشتہ صفت بچی کی کہانی جو صرف محبت بانٹنے کے لیے دوبارہ زندہ ہوگئی تھی

"گڑیا ارے او گڑیا ذرا پانی تو دے جا گولی کھالوں میں۔ کب سے چلا رہی ہوں کوئی سنتا ہی نہیں۔" دادی نے آواز کے ساتھ ہی تاز بھی دیا۔

"جی ابھی آئی۔" گڑیا فوراً بھاگی۔ دادی کو دوا کھلا کے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ تائی سامنے کھڑی تھیں۔

"ارے دوپہر ہونے لگی ہے، روٹی کب ڈالو گی؟ تمہارے تایا بس آتے ہی ہوں گے۔" جب کہ تایا کے آنے میں دو گھنٹے تھے مگر تائی اس کو فارغ رکھنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ "جی ابھی ڈال دیتی ہوں۔" گڑیا نے سر جھکا کے کہا۔ وہ کچن کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ آواز آئی۔ "گڑیا ذرا میری شرٹ تو پریس کر دینا، دوست انتظار کر رہے ہیں میں نہانے جا رہا ہوں۔" یہ ساجد بھائی تھے جن کو ہر وقت ایمر جنسی ہی رہتی تھی۔

"گڑیا باجی میری بال کہ تیرے ال ہی نہیں رہی۔" ننھے حارث کو بھی پورے گھر میں گڑیا ہی نظر آتی تھی اور گڑیا... اس نے انکار کرنا سیکھا ہی نہیں تھا بس جی جی کرتی رہتی۔

☆......☆

اللہ میاں لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں میرے ساتھ، میں تو سب کے کام آتی ہوں اور کوئی مجھے ہنستا بھی نہیں۔ وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ "پھر بھی لوگ مجھے برا کہتے ہیں۔ اللہ میاں میری مشکل آسان کر دے۔" وہ گلی کی پچھلی طرف سیڑھیوں پر بیٹھی اللہ سے ہم کلام تھی۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں وہ سب سے چھپ کر کچھ دیر کے لیے اپنا دل ہلکا کر لیتی تھی۔ ورنہ تو پورے گھر میں اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

☆......☆

گڑیا اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ دونوں بہت سادہ مزاج، دیندار، دوسروں کے کام آنے والے نیک سیرت تھے۔ یہ سب لوگ جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے۔ گڑیا کی دادی، تایا اور ان کے تین بچے۔ ایک بیوہ پھوپو اور ان کی دو بیٹیاں، سب مل کر رہتے تھے۔ تایا ملازمت کرتے تھے جب کہ گڑیا کے ابو بزنس مین تھے۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں بہت برکت دی تھی اور اسی حساب سے ان کو دل بھی بڑا دیا تھا۔ وہ گھر کی آدھے سے زیادہ ذمہ داریاں بہت خوش دلی سے نبھاتے تھے۔ تایا کا ہاتھ عموماً تنگ رہتا تھا کیونکہ تائی بہت شاہ خرچ تھیں۔ ایسے میں گڑیا کے ابو ہی اکثر بھتیجوں کی فیس وغیرہ بھر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح پھوپو کا بوجھ بھی ان کے ہی سر تھا۔ انہوں نے کبھی گڑیا اور گھر کے دیگر بچوں میں کوئی فرق نہ کیا مگر جواب میں ان کو وہ محبت اور عزت نہ ملی جس کے وہ حقدار تھے ہی خواہش

مند بھی تھے۔ تائی تو خیر کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہ کرتی تھیں مگر دادی اور پھوپو بھی ضرورتاً ہی بات کرتیں جب انہیں کسی نہ کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ وقت کا کام تو گزرنا ہے اور وہ گزر ہی رہا تھا۔

ایک مرتبہ گڑیا اور اس کے والدین کسی سے ملنے کے بعد واپس آرہے تھے کہ ایک سانحہ ہوگیا۔ ان کی گاڑی ٹرک سے ٹکرا گئی۔ گڑیا کے والدین تو موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے اور گڑیا تھوڑی زخمی ہوئی تھی۔ چھ سات دن تو سب نے اس کا خیال رکھا پھر سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ گھر کے حالات خراب ہونے لگے تھے کیونکہ گڑیا کے ابو کا بزنس بند پڑا تھا اور تایا کی آمدنی میں تو بمشکل ہی گزارہ ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں گڑیا کا خیال کون رکھتا۔ وہ سارا دن کمرے میں بند روتی رہتی۔ کسی کو خیال نہ آتا کہ اس نے کچھ کھایا یا نہیں۔ آخر ایسے کب تک چلتا آخر گڑیا نے گھر سے باہر قدم نکالا۔ تائی سامنے بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر منہ بنایا مگر خاموش رہیں۔

''لائیں میں سبزی بنا دوں۔'' گڑیا نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم بناؤ گی؟'' تائی حیران ہوئیں۔

''جی۔'' کہہ کر گڑیا نے سبزی کی ٹوکری اپنے آگے کرلی۔ تائی امی کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

''ہاں یہ لو جب تک میں آٹا گوندھ لوں۔'' وہ کہتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ پھر تو تائی نے آہستہ آہستہ گھر کے سارے کام گڑیا سے کروانا شروع کردیئے اور گڑیا نے تو انکار کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ سب کے کام بخوشی کرتی۔ تائی کی لڑکی اور پھوپو کی بیٹیاں تو اب ہل کے پانی بھی نہیں پیتی تھیں جب کہ یہ گھر گڑیا کے والد کا تھا مگر اس گھر میں اس کی حیثیت نوکرانی جیسی تھی اور دوسرے لوگ اس پر حکم چلاتے تھے۔ کبھی کبھار گڑیا کو رونا آتا تو وہ مکان کی پچھلی طرف جاکر رو کر اپنا دل ہلکا کرلیتی تھی۔

ایک دن تایا تائی سے کسی پریشانی کا ذکر کررہے تھے۔ ان کا ہاتھ تنگ تھا اور ان کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ گڑیا یہ سب سن رہی تھی اس نے سامنے آکر کہا۔ ''تایا ابو آپ ابو بزنس کیوں نہیں سنبھالتے۔'' تایا نے حیرانی سے اسے دیکھا۔



"مگر......!" وہ خاموش ہو گئے۔

"تایا ابو آپ بڑے ہیں اور اب تو آپ ہی اس گھر کے مالک ہیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی بس آپ وہ بزنس سنبھالیں ابو کی بھی تو یہی خواہش ہو گی ناں۔" یہ کہہ کر گڑیا کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆

تایا ابو نے بزنس سنبھالنا شروع کر دیا اور اپنے بیٹے کو بھی اس میں شامل کر دیا۔ بزنس دیکھتے ہی دیکھتے بڑھنے لگا اور گھر میں خوش حالی آنے لگی۔ اب سب مطمئن ہو گئے تھے۔ گھر کے دوسرے معاملات بھی حل ہونے لگے۔ پھوپو کی بیٹیوں کے بہترین رشتے آئے تو تایا نے جھٹ پٹ ان کی شادیاں کر دیں۔ پھوپو کا ایک داماد امریکا میں تھا۔ کوشش کر کے پھوپو کو بھی اپنے ساتھ ہی امریکا لے گیا۔ تایا کی بھی ایک بیٹی کی شادی طے ہو گئی تھی۔ بڑا بیٹا بزنس خوب سنبھال رہا تھا جب کہ چھوٹا حارث پڑھ رہا تھا۔ نہیں بدلی تو گڑیا کی تقدیر، جس میں ابھی بھی اپنوں کا رویہ سرد ہی رہا۔ تائی کو تو گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں تھی۔ گھر میں ایک دو ملازم بھی تھے مگر پھر بھی گھر کو دیکھنا گڑیا کے ہی ذمے تھا۔ صرف دو سال کے اندر ہی گھر کے تقریباً سارے مسئلے حل ہو گئے تھے۔

☆......☆

رمضان قریب تھے۔ تائی گھر کی سالانہ صفائی کروا رہی تھیں۔ یہ ان کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ گڑیا ان کا برابر ساتھ دے رہی تھی۔ کچھ چیزیں رمضان کے لیے خصوصی تیار کروا کے رکھ لی جاتی تھیں۔ پھر اچانک دوسرے شہر سے دادی کے بھائی کی آمد کی بھی اطلاع تھی۔ ان کے لیے کمرہ صاف کروایا گیا۔ رمضان سے دو دن پہلے دادا جان آ گئے۔ وہ بہت نورانی چہرہ بزرگ تھے۔ بہت دیندار اور پرہیزگار۔ ان کی آمد سے گھر میں رونق سی آ گئی تھی۔ دادی بھی اپنے بھائی سے مل کر بہت خوش تھیں۔ گڑیا کو تو وہ بہت اچھے لگے۔ وہ ان کے کام بھاگ بھاگ کر کرتی تھی۔ رمضان شروع ہو چکے تھے اور سب لوگ رمضان کو دادا کی محبت اور رہنمائی میں مذہبی اہتمام سے منا رہے تھے۔ دادا کی موجودگی نے گھر میں عجیب ہی بابرکت سا ماحول باندھ دیا تھا اور سب لوگ خود کو بہت محفوظ اور مطمئن محسوس کر رہے تھے۔ دوسرے تیسرے روزے کو افطار کے بعد دادی نے دادا جان سے بات کی۔ گڑیا کی شادی کے حوالے سے کیونکہ اب گھر میں گڑیا ہی باقی تھی۔ باقی تین لڑکیوں کی تو شادی ہو گئی تھی۔ حالانکہ ان میں سے ایک گڑیا سے چھوٹی تھی۔ پھر بھی رشتے کے وقت کسی کو گڑیا کا خیال نہ آیا۔ تائی کو تو یہ فکر تھی کہ پھر گھر کون دیکھے گا۔ ان کے سیر سپاٹوں میں فرق آ جائے گا۔ دادی اب بیمار رہنے لگی تھیں تو ان کو بالآخر گڑیا کا خیال آ گیا اور وہ چاہ رہی تھیں کہ اپنے سامنے گڑیا کو اپنے گھر کا کر دیں تاکہ وہ اپنے بیٹے کو آخرت میں منہ دکھا سکیں۔ یہی سوچ کر انہوں نے اپنے بھائی سے بات کی تو وہ خاموش ہو گئے۔

"ارے کیا ہوا چپ کیوں ہو گئے؟ تمہارے پاس تو بہت اچھے جاننے والے ہیں۔ ان ہی میں سے کوئی دیکھو گڑیا کے لیے۔" دادی نے دادا جان کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"کیا آپ کو اپنے گھر کی خوش حالی پسند نہیں؟" دادا کا سوال حیران کر دینے والا اور عجیب تھا۔

"ہیں......! کیا مطلب؟" دادی نے اچنبھے سے پوچھا۔ "مطلب یہ کہ ساری خوش حالی تو اسی کے دم سے ہے اگر وہ رخصت ہو گئی تو......" دادا کہتے کہتے رک گئے۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی بھئی! مانا کہ یہ سب اسی کے باپ کا تھا مگر ہم حق تلفی نہیں کریں گے۔ جو سب لڑکیوں کو دیا ہے اس سے زیادہ ہی دے کے رخصت کریں گے۔" دادی اب بھی نہیں سمجھی تھیں۔

"اسے ان سب چیزوں کی ضرورت نہیں۔ اگر دینا ہی تھا تو اسے پیار، محبت اور وہ توجہ دیتے جس کی اسے ضرورت تھی۔" دادا نے کہنا شروع کیا۔ "اور اب آپ نے بات شروع ہی کی ہے تو بتائے دیتا ہوں کہ اب اسے رخصت کر دیں، زیادہ دیر رکھنا ٹھیک نہیں، میرا خیال ہے کل ٹھیک ہے۔" "کیا......!" دادی بے ساختہ چلائیں۔ "کل...... ارے کیا کہہ رہے ہو ابھی تو کوئی......" دادی کی بات ادھوری رہ گئی۔

"آپ تیاری کریں۔" کہہ کر دادا حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔ دادی نے سب کو بلایا سب حیران تھے اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات کہ گڑیا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ دادا نے سب کو گڑیا کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا اور خود تخت بچھا کر اس کے کمرے کے سامنے بیٹھ کر دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ ساری رات دادا جان وظیفے پڑھتے رہے۔ سحری

میں بھی گڑیا نظر نہیں آئی تائی بلانے لگیں تو دادا نے خاموش کرا دیا۔ پھر عصر کے وقت دادا نے وظیفہ ختم کیا۔ سب سہمے ہوئے اپنے کمروں میں تھے۔ دادا نماز پڑھنے گئے اور واپسی میں ایک ڈاکٹر کو ساتھ لائے اور سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ سب حیران پریشان گڑیا کے کمرے میں داخل ہو گئے تو دیکھا وہ ساکت اپنے بستر پر لیٹی تھی۔

''ارے میری بچی کو کیا ہوا۔'' دادی گھبرا کے آگے بڑھیں مگر دادا نے روک دیا۔ ڈاکٹر آگے بڑھا اور اس نے گڑیا کو چیک کیا۔

''یہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔'' ڈاکٹر نے جیسے ہی یہ بتایا۔ ''کیا......!'' سب بیک زبان چلائے۔ ''یہ پچھلے دو سال سے کومے میں تھیں مگر صبح سحری میں ان کی ڈیتھ ہوگئی۔''

ڈاکٹر تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ سب کا حیرانی وصدمے اور خوف سے برا حال تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو زندہ سلامت رہ رہی تھی اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ وہ کومے میں تھی۔ دادا نے سب کو خاموش کر دیا اور کہا کہ تدفین کی تیاری کریں۔ پھر دادا کے کہنے پر افطار سے پہلے گڑیا کی تدفین کر دی گئی۔ دادا نے پھر مستقل وظیفہ جاری رکھا تھا تدفین تک۔ رات کو عشاء کے بعد دادا نے سب کو بلایا۔ سب لوگ خود بھی سہمے ہوئے اور بے چین تھے۔ وہ سب کچھ جاننا چاہتے تھے۔ دادا نے بتایا کہ ایکسیڈنٹ میں گڑیا کے والدین تو فوت ہو گئے تھے اور وہ خود معمولی زخمی تھی مگر والدین کا دکھ اس کو بہت تھا۔ وہ اس صدمے سے نکل سکتی تھی اگر تم لوگ اس کا خیال رکھتے مگر تم لوگوں نے اس سے ہمدردی کے دو بول بھی نہیں بولے اور وہ اکیلی کمرے میں بیٹھی اپنے والدین کو یاد کرتی رہی۔ اس صدمے اور دکھ میں وہ کومے میں چلی گئی۔ پھر جب اس گھر کے حالات خراب ہوئے تو وہ بے چین ہوگئی۔ آخر اسی باپ کی بیٹی تھی ناں جس نے ساری زندگی تم لوگوں کو سنبھالا مگر تم سے اس کی ایک بچی بھی نہ سنبھالی گئی۔'' دادا نے ایک نظر سب پر ڈالی سب کے سر جھکے ہوئے تھے اور وہ شرمندہ تھے۔ ''اس کی روح تم لوگوں کے درمیان آگئی اور تمہارے مسئلے حل ہونے لگے۔'' دادا نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''اس کے ماں باپ بھی تم لوگوں کا سہارا تھے اور اس نے بھی تمہارا سہارا ہی بننا چاہا۔ وہ قدم قدم پر تم لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتی چلی گئی مگر تم لوگوں نے پھر بھی اس کی قدر نہیں کی اور ایک نوکرانی سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ آخر کب تک ایسا ہوتا؟'' دادا تھوڑی دیر رکے اور پھر بولے۔ ''تم لوگوں کو پتا ہے میں برسوں بعد اچانک کیوں آیا؟'' دادا نے سب کو دیکھا مگر کسی کے پاس جواب نہ تھا۔

''مجھے رضی الدین (گڑیا کے والد) خواب میں آیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان تھا اور مجھے بار بار کہہ رہا تھا کہ میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔ اس کا وہاں کوئی خیال نہیں رکھ رہا اور جب گڑیا میرے خواب میں آئی وہ رو رہی تھی تو میں فوراً چلا آیا تاکہ اس کی مشکل آسان ہو جائے اور میں نے یہاں آ کے جو دیکھا تو سچ ہی نکلا کہ وہ واقعی پریشان تھی۔ مجھے آپ لوگوں سے یہ امید نہیں تھی۔ خاص کر آپ سے۔'' انہوں نے دادی کو کہا تو دادی بہت رونے لگیں اور معافی مانگنے لگیں۔

''مگر وہ......'' تایا کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''وہ اور اس کے ماں باپ نیک روحیں تھیں وہ بھی زندہ رہتی جب بھی خلق خدا کے لیے باعث رحمت ہی ہوتی لیکن جو اللہ کو منظور اب بھی اس نے لوگوں کا بھلا ہی کیا۔'' دادا نے انہیں بولنے نہ دیا۔ ''قدرت کو اس کی اتنی زندگی ہی منظور تھی وہ تو ماں باپ کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور کومے میں چلی گئی اگر تم لوگ بروقت اس کو دیکھ لیتے تو اس کی مشکل پہلے ہی آسان ہو جاتی مگر خیر۔'' دادا خاموش ہو گئے۔ سب بے حد شرمندہ تھے اور معافی مانگ رہے تھے مگر دادا نے کہا۔ ''معافی مجھ سے نہیں اللہ سے مانگو وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔'' اس کے بعد دادا صبح سحری کر کے چلے گئے۔ سب نے بہت روکا مگر انہوں نے کہا۔

''میرا کام ختم ہو گیا۔''

☆......☆

دادا کے جانے کے بعد تایا نے گڑیا کے نام پر ایک اسکول کھلوایا جس میں خاص کر یتیم بچیوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے علاوہ بھی وہ یتیم بچیوں کی شادی وغیرہ میں دل کھول کر مدد کرتے تھے اور تائی اماں۔ نے بھی گھومنا پھرنا چھوڑ کر اسکول سنبھالنا شروع کر دیا اور دادی بھی جب تک زندہ رہیں اپنے بیٹے اور خاص کر گڑیا کے لیے ایصال ثواب کرتی رہیں کیونکہ اسی طرح وہ اپنے غلط رویے کی ندامت دھو سکتے تھے باقی تو اللہ تعالیٰ بڑا رحمٰن ورحیم ہے اور غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ سچے دل سے توبہ کی جائے۔

☆☆☆

تم میرے ہو

اظہر عباس

اگر محبت سچی ہو تو خدا خود یہ خود عطا کر ہی دیا کرتا ہے

نام تو اس کا چاندنی تھا مگر چاند جیسا نکھار اس میں نہیں تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی، ناک قدرے لمبی، البتہ کمر حد سے زیادہ پتلی تھی جو اس کے جسم میں واحد خوب صورت چیز تھی۔ رنگت بھی گندمی تھی۔ وہ جب بھی شاہد کے سامنے آتی تو شاہد جھنجھلا سا جاتا کیونکہ وہ اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ چاندنی شاہد کی خالہ زاد تھی۔ اس کا گھر شاہد کے گھر کے سامنے واقع تھا۔ وہ اکثر شاہد کے گھر بہانے سے آیا کرتی تھی اور شاہد کو بھی اس بات کا بخوبی علم تھا کہ چاندنی اس پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ خاصی شریر لڑکی تھی لیکن اس کا چنچل پن شاہد کے لیے متاثر کن نہیں تھا۔

کچھ مہینے پہلے شاہد کے ماموں کی شادی تھی اور اس میں چاندنی نے شاہد پر بہت حربے آزمائے کہ کسی طرح وہ بھی اس کے قریب آجائے۔ اس سے اظہار محبت کرے۔ اسی لیے اس نے بیوٹی پارلر جا کر خوب صورت انداز میں بال بنوائے، آنکھوں میں خوب صورت لینس لگوائے۔ نین نقشوں کی تراش خراش کی، درزی سے جدید ترین فیشن سوٹ سلوائے، گردن میں کالا دھاگا باندھا تاکہ کسی طرح وہ شاہد کو اپنی طرف متوجہ کرا سکے۔ وہ بار بار اس کے سامنے آتی، کبھی چائے دینے کے بہانے، کبھی دیوار پر لگے گھڑیال پر وقت دیکھنے کے بہانے اور کبھی یوں ہی شوخ ادائیں دکھانے...... مگر شاہد کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ پتا نہیں وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ شادی کی رونقوں میں چار پانچ دن گزر گئے لیکن مجال ہے کہ شاہد نے ایک بار بھی پسندیدگی کی نظر سے اسے دیکھا ہو۔

☆......☆

جس دن ماموں کا ولیمہ تھا۔ چاندنی بہت اداس تھی کیونکہ اس کی اتنی کوششوں کے باوجود شاہد نے ایک نگاہ اس پر ڈالنا گوارا نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنے گھر جانے لگی تو نمناک آنکھوں سے ایک بار شاہد کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

''شاہد! مجھے پتا ہے تم مجھے پسند نہیں کرتے لیکن تم میرے ہو۔ تم چاندنی کے ہو۔ یہ بات یاد رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس کا ڈھلکا ہوا

دوپٹہ بھی اس کی طرح رنجیدہ لگ رہا تھا۔ شاہد ہر طرح کے جذبات سے عاری چہرہ لیے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆......☆

کافی دن گزر گئے لیکن چاندنی شاہد کے گھر نہ آئی۔ وہ بہت افسردہ تھی شاید۔ اس کو اپنے محبوب کی عدم توجہی کا بہت افسوس تھا۔ اس لیے اس نے خود کو اپنے گھر محدود کرلیا تھا حالانکہ وہ تو شاہد کے گرد تتلی کی مانند منڈلایا کرتی تھی۔

چاندنی شکل وصورت کے لحاظ سے اتنی بھی گئی گزری نہ تھی مگر شاہد کچھ زیادہ ہی حسن پرست واقع ہوا تھا۔ وہ ایسی لڑکی کا آرزومند تھا جسے دیکھتے ہی جلترنگ بجنے لگیں۔ اس کے سراپے میں بجلیاں سی دوڑ جائیں۔ جس کے نور سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوجائیں اور جس کی موجودگی کا احساس اس کو زندہ کردے۔ وقت موم کی طرح پگھلتا رہا۔ ایک دن اسے اس کی ماں نے بتایا۔

''میں نے تمہارے لیے ایک بہت خوب صورت لڑکی دیکھ لی ہے۔ وہ لوگ پاس کے محلے میں رہتے ہیں۔ اچھے لوگ ہیں۔'' شاہد ماں کی بات سن کر خاموش ہوگیا کیونکہ اسے اپنی ماں کی پسند پر مکمل بھروسا تھا۔

اگلے ہی ہفتے اس کی شادی کی تاریخ پکی کردی گئی اور اس نے بہانے بہانے سے اپنی ہونے والی بیوی کو بھی دیکھ لیا۔ وہ واقعی چاند کا ٹکڑا تھی۔ اس کے خوابوں کی شہزادی! مگر عین جس دن بارات روانہ ہوئی۔ اس کی ہونے والی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ شاہد یہ اندوہناک خبر سن کر نڈھال تھا۔ اسی شام اس کا نکاح چاندنی سے کردیا گیا۔

جب وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہو رہا تھا تو یہ الفاظ درودیوار میں گونج رہے تھے۔

''تم میرے ہو۔ تم چاندنی کے ہو!''

☆☆☆



ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

قسط نمبر: 02

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستانِ عجب

تصوف اور محبت کی پراسرار دنیا کی کہانی

تین چار دن کے بعد جیسے میں اپنے آپ میں آ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ چیزوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ لوگوں سے رابطہ بڑھنے لگا۔





''بات یہ ہے اپنے تنزیل جی۔۔!'' احمد عبدالحئی نے کہا۔'' اپنا اپنا نکتہ نظر ہے۔۔!''

''غلط۔۔!'' اظہر صدیقی نے مداخلت کی۔'' تنزیل جی کا نکتہ نظر، دلیل کے عین مطابق ہے۔تم جیسے لوگ فیشن کے نام پر اسلام کا استحصال کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔صرف الفاظوں کے اُلٹ پھیر سے باتوں کے محل تعمیر کرتے ہیں مگر ان کی اصلیت کوئی نہیں ہوتی۔''

''اظہر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' آشفتہ ناز نے کہا۔'' تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔اگر اسلام کو نہیں مانتے تو نہ مانو، مگر اس کی روح کو سمجھے بغیر اس پر گفتگو نہ کرو۔یہ بھاری پتھر ہے، چوم کر چھوڑ دو۔۔!'' آشفتہ ناز ہنسا۔

احمد عبدالحئی نے چاروں طرف دیکھا، مگر اس سے کوئی اس کو آسانی دینے کی کیفیت میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''میں بہر حال منافق نہیں ہوں۔۔!'' وہ بولا۔'' جو صحیح سمجھتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں۔۔!''

''اس کو منافقت نہیں کٹ حجتی کہتے ہیں۔'' قدیر نے ہاتھ کو ہلایا، جیسے بحث کو ختم کرنا کا اشارہ کر رہا ہو۔

''کیا آپ قادری سرکار کے بہت قریب ہیں۔۔؟'' اظہر صدیقی نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں تو۔۔!'' میں نے جواب دیا۔'' میری تو آج تک ان سے گفتگو نہیں ہوئی!''

''اچھا!'' اظہر صدیقی نے مجھے دیکھا اور بولا۔'' مگر آپ کا اندازِ استدلال تو قادری سرکار جیسا ہے۔۔!''

میں صرف اس کو دیکھ کر رہ گیا۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں۔۔؟ میری تو کبھی قادری سرکار سے گفتگو تو کجا، بات تک کی نوبت نہیں آئی تھی۔سوائے اس کے کہ میں گاہے بگاہے خانقاہ چلا جاتا تھا۔پھر وہ مجھ پر کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔۔؟

بے شمار سوالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔

☆☆☆

''یہ کیا کیا تو نے کتی دے پتر۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کا جلال پورے عروج پہ تھا۔'' میری عدم موجودگی میں تیری یہ جرات، تو لڑکیاں اٹھائے، تو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے آگا پیچھا کیا ہے۔۔؟''

''شاہ جی۔۔!'' منیجر طارق نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر شاہ ہارون گیلانی کے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''بک کیا بکنا ہے۔۔؟'' لمحے بھر میں شاہ ہارون گیلانی کی چھٹی حس نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

''شاہ جی۔۔!'' طارق لپک کر شاہ ہارون گیلانی کے پیروں میں جا بیٹھا اور ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔'' شاہ جی ہم تو حکم کے غلام ہیں۔آپ کے نمک خوار ہیں۔حکم عدولی کی طرف ہمارا دھیان بھی جائے تو مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔''

شاہ ہارون گیلانی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا، صرف طارق کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے رہے۔

وہ سر جھکا کے آہستہ سے بولا۔'' شاہ جی جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ماشاء اللہ سے چھوٹے شاہ جی جوان ہو گئے ہیں۔۔! بس جی۔۔!'' اس نے شاہ ہارون گیلانی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

''جی بس پہلا ہی موقع تھا۔نرگس کو چھوٹے شاہ جی نے دیکھا، تو طلب کر لیا۔مگر وہ الھڑ مٹیار بڑی ڈاھڈی نکلی، کچھ شاہ جی کی نئی نئی جوانی اور ناتجربے کاری، دو بندے اور بھی تھے، وہ بھی چھوٹے شاہ جی کے دوست ہی تھے، شہر سے آئے تھے۔بس جی وہ زندہ بچ گئی، بے برکتی زنی۔ورنہ بات باہر نہ جاتی۔وہ تو سوہنے سائیں کا شکر ہے کہ اس نے چھوٹے شاہ جی کو پہچانا نہیں۔میں ہی اس کو لے کر جا رہا تھا۔مجھ کو ہی پہچانتی ہے۔تو پھر میں کیا کرتا۔؟ سارا الزام اپنے سر لے لیا۔!''

منیجر طارق کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

شاہ ہارون گیلانی نے پیروں کو سمیٹ لیا۔

طارق منیجر ویسے ہی بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔صرف شاہ ہارون گیلانی کے سگار سے اٹھنے والے دھوئیں کے مرغولے ہوا

پندرہ بیس منٹوں کے بعد تعارف اور ہلے گلے کا مرحلہ ختم ہو گیا۔ چائے آ گئی، ساتھ میں سموسے بسکٹ، دال موٹھ اور لوکی کا حلوہ تھا۔ قدیر دوست دار آدمی تھا۔ اس کے اندر بندے کو سمو لینے کی صلاحیت تھی۔

''یار جمالی۔'' غزالی نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ لیا۔ ''تم نے آج کا اخبار پڑھا؟''

''کیوں کوئی خاص بات۔؟'' جمالی نے چمچہ بھر کے حلوہ منہ میں بھرا۔

''ہاں آج قادری سرکار کی پیش گوئی چھپی ہے۔'' غزالی نے کہا۔ ''انہوں نے آئندہ سیاسی سیٹ اپ کے لئے بڑی اہم پیش گوئی کی ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ مجھے ان آوازوں سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ لوگوں کے لئے قادری سرکار کا نام نیا نہیں ہے۔

☆☆☆

''کیا پیش گوئی کی ہے قادری سرکار نے۔؟'' آشفتہ ناز نے اپنے لمبے گھنگھریالے بالوں کو زور سے جھٹکا ساتھ ہی اپنا ہاتھ فضاء میں لہرایا۔

''انہوں نے کہا ہے کہ ضمنی انتخابات کے نتیجے میں حکمران جماعت میں پھوٹ پڑنا شروع ہو جائے گی۔!'' غزالی نے بتایا۔

''ضمنی انتخابات سے اپ سیٹ کیسے ہو سکتا ہے۔؟'' اظہر صدیقی نے کہا۔ ''ضمنی انتخابات تو عموماً حکمران جماعت ہی جیتتی ہے۔'' اظہر صدیقی ایک قومی اخبار کا کالم نویس تھا اور اس کے تجزیے بہت پر مغز ہوتے تھے۔

''معلوم نہیں۔'' غزالی نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''لیکن انہوں نے کہا ہے کہ ضمنی الیکشن کے نتائج حکمران جماعت کو بہت مہنگے پڑیں گے اور اسی سے اپ سیٹ سامنے آنا شروع ہو جائے گا۔!''

''یار یہ پیر ہیں یا سیاستدان۔؟'' احمد عبدالحئی نے سر کھجایا۔ وہ ٹی وی پر آنے والا ایک معروف دانشور تھا۔ اس کی بڑی ڈیمانڈ تھی۔ کیونکہ وہ اپنے مخاطب کے بخئے ادھیڑنے میں ملکہ رکھتا تھا۔

''تم بھی ان سے ایک بار ضرور ملو۔!'' جمالی نے کہا۔ ''بلکہ ان کو کسی پروگرام میں بلواؤ۔!''

''یار میں مذہبی ٹائپ کے پروگرامز میں نہیں پڑتا۔'' احمد عبدالحئی نے حسب عادت کندھے اُچکائے اور چائے کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

''کیونکہ مجھے اسلام کا پتا نہیں۔!'' سہیل دانش نے مسکرا کے کہا۔ وہ بھی ایک معروف ادیب تھا۔

''دراصل میں غیر ضروری اسلام میں نہیں اُلجھتا۔'' احمد عبدالحئی نے خوش دلی سے کہا۔ ''جتنے اسلام کی مجھے ضرورت ہے، وہ مجھے معلوم ہے۔ اُلجھنے والے لڑانے والے اسلام سے میں الرجک ہوں۔!''

''معاف کیجئے گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس کا اسلام کے حوالے سے نکتہ نظر پسند نہیں آیا۔

''اسلام ایک دین ہے۔'' میں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''اور دین تمام زندگی سے علاقہ رکھتا ہے۔ دین یا تو پورے کا پورا قبول کرنا پڑتا ہے، یا پورے کا پورا رد کرنا پڑتا ہے۔ اسلام کے معاملات دیکھو اور منتخب کرو، کی اجازت نہیں دیتے۔!''

''آپ کو غصہ آ رہا ہے۔!'' احمد عبدالحئی نے مسکرا کے کہا۔ ''بات کو ٹھنڈے دل سے سوچیں، مولوی نے اسلام کو کیا دیا۔؟''

''یہی انداز فکر غلط ہے۔!'' میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ ''یہ کہیے کہ مولوی نے اسلام سے کیا لیا۔ کیا سمجھا۔؟ اور پھر دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام بحیثیت دین مولوی کی ذمہ داری نہیں، بلکہ فرد کی ذمہ داری ہے۔ کیا آپ نے کبھی یہ پوچھا یا سوچا کہ مولوی نماز پڑھانے سے کیوں انکار نہیں کرتا۔؟ سب سے سخت ڈیوٹی موذن کرتا ہے۔ گرمی، سردی، برسات کسی موسم میں، کسی وقت اذان کا ناغہ نہیں کرتا اور ہم جیسے آدمی اس کو کیا دیتے ہیں۔؟ نہ اچھی تنخواہ، نہ اوور ٹائم، نہ اولڈ ایج بینی فٹس، نہ سالانہ چھٹیاں، نہ بونس اور نہ اپنی بیٹی کا رشتہ۔۔۔ پھر بھی آپ مولوی کو برا کہتے ہیں۔؟''

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کنج کے وسط میں قائم حویلی کم و بیش پچاس سالوں سے پورے کروفر سے ایستادہ تھی۔ سہ منزلہ حویلی سے بلند اردگرد کے سارے علاقے میں کوئی عمارت نہ تھی۔ کیونکہ کوئی دوسرا شاہ ہارون گیلانی نہیں تھا۔ اس کے بالکل عقب میں پرانی حویلی تھی۔ جو کہ اب اجناس کے ذخیرے اور کمی کمینوں کو درست رکھنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔

صدر دروازے سے حویلی کے مرکزی پورچ تک دائرے میں سڑک گھومتی ہوئی جاتی تھی۔ سیاہ سڑک کے دونوں جانب خوبصورت ملکی غیر ملکی پھولوں کی قطار در قطار کیاریاں تھیں اور مرکزی دروازے سے حویلی کے پورچ تک ایک سیدھی، بیس فٹ چوڑی نہر بہتی تھی۔ جس میں سفید سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ اور درمیان میں بہت خوبصورت کہیں مور، کہیں عورت، کہیں سورج مکھی کے سنگ مرمر کے فوارے لگے ہوئے تھے۔ جن میں پوشیدہ رنگین روشنیاں خاص خاص مواقع پہ روشن کی جاتیں تھیں۔ جو لحہ بہ لحہ رنگ بدلتی رہتی تھیں۔ سفید سنگ مرمر کی طویل نہر میں سنہری رنگین مچھلیاں، ننھے منے سے چھوٹے، سفید مرغابیاں تیرتی تھیں۔ نہر کے درمیان میں سنگ مرمر کی چار جگہ نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں راتوں کو مہمان بیٹھتے تھے۔ غرض حویلی کیا تھی ....؟ پریوں کا محل تھی۔ ایسا محل جس کی لوگ شائد خوابوں میں بھی تمنا نہ کر پاتے ہوں۔

تاج دین عرف تاجا چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیوں بلایا گیا ہے۔ اس جیسے معمولی آدمی کو شاہ ہارون گیلانی سے ملنے کا پیغام جائے....؟ ان سے، جن سے ملنے کے لئے لوگ ترستے ہیں....!

بعض اوقات معلوم ہی نہیں ہوتا کہ قسمت مہربان ہو رہی ہے یا کسی نئے امتحان میں مبتلا کر رہی ہے۔ واہ قسمت کی پری نجانے کس سے اپنی جادو کی چھڑی سے کونسا نیا منظر تخلیق کر دے....!

وہ سوچتا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ وہ سورج چڑھے آیا تھا۔ اب سورج نصف دن گذار چکا تھا۔ مگر ابھی تک طلبی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس دوران کئی بار ریاض کمدار نے اندر باہر کے چکر لگائے مگر اس کو کچھ نہ کہا، نہ بتایا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی بھولی بسری شے ہے، جس کو لا کر سب بھول گئے ہوں۔

عصر کے قریب اچانک حویلی کے اندرونی دروازے پر ہلچل ہوئی۔ شاہ ہارون گیلانی کے مخصوص کمانڈوز، گارڈز نظر آنے لگے ان میں سے چار پانچ تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلے آئے اور پھر وہ چلتے چلتے چند لمحوں میں تاجے کے پاس پہنچ گئے۔

ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ''تم ہی تاجے ہو....؟''

''ہاں.... ہاں جی....!'' تاج دین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں ہی تاجا ہوں....!''

''چلو....! تمہیں شاہ جی نے طلب کیا ہے....!''

''چلیں جی....!'' تاجے نے ان کے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

وہ چلنے کو تو چل رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیوں طلب کیا گیا ہے۔

وہ چلتے ہوئے حویلی کے عقب میں بنی ہوئی پرانی حویلی کی طرف پہنچ گئے اور پرانی حویلی کے اندر غلام گردش سے گزر کر، وہ کافی سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے۔ اندر ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ جس میں شاہ ہارون گیلانی ایک بھاری بھر کم دیوان پر بیٹھے تھے اور ایک کمدار ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

تاجا کچھ فاصلے پر جا کے کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیر بے جان ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اب اس کی جان نکل جائے گی۔

''چل آگے چل....!'' کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اور گھٹنوں کے بل شاہ ہارون گیلانی کے سامنے گر پڑا۔

''تو تم ہو تاجے....؟'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری بھرکم آواز بلند ہوئی۔

''جی سرکار....!'' اس نے جلدی سے گھٹنوں کے بل کھڑے کھڑے ہاتھ جوڑے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے شاہ ہارون گیلانی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا کہ ان کے کپڑوں سے اٹھنے والی خوشبو اس کو

میں چکراتے رہے۔
''شاہ جی۔!'' منیجر طارق نے پوچھا" اجازت ہو تو پوچھ لوں، شہر میں کوئی بات ہو گئی ہے کیا۔؟''
''ہونہہ۔'' شاہ ہارون گیلانی نے ہنکارا بھرا۔
''کسی چینل والے کو خبر لگ گئی کیا۔؟''
''اگر یہ بات ہوتی تو میں پریشان ہوتا۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے خشک لہجے میں کہا۔ ''دراصل قادری سرکار اس معاملے میں آگئے ہیں۔''
''کیا۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی یہ بات سن کر منیجر طارق یوں اچھلا جیسے اس کو بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔
لمحے بھر میں اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔
''اب کیا ہوگا۔؟'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا" یہ تو بہت بُرا ہوا۔''
''ہاں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''سوچنا پڑے گا۔؟''
''شاہ جی اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔''
''کہو۔!''
''کیوں نا لڑکی سے نکاح کے دو بول پڑھوا لوں، میرے ہی اوپر الزام ہے نا۔ میں اس سے اس طریقے سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ اور پھر سارا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ مسئلہ عزت کی بحالی کا ہے۔ پورے گاؤں کے سامنے نکاح کروں گا۔ اب کیا سرکار کے لئے اتنا بھی نہ کر سکوں، تو پھر لعنت ہے میرے نصیب پر۔!'' منیجر طارق سخت جذباتی ہو گیا۔
شاہ ہارون گیلانی نے غور سے اس کو دیکھا اور بولے" سور دے پتر، اس پر دل آگیا ہے کیا تیرا۔؟''
منیجر طارق نے سر اٹھا کے ہارون گیلانی کو دیکھا اور شرمیلے سے لہجے میں بولا" شاہ جی دل تو اب رہا نہیں، اگر دل رکھتے تو پھر، ہر حکم کیسے بجا لاتے۔؟''
شاہ ہارون گیلانی نے منیجر طارق کو ایک زوردار لات رسید کی۔ طارق لڑھک کر سرخ دبیز قالین پر اوندھا ہو گیا۔ پھر بڑی پھرتی سے سیدھا ہوا۔ اور شاہ ہارون گیلانی کے قدم پکڑ کے بولا" سب آپ کی برکتیں ہیں۔''
شاہ ہارون گیلانی نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی دیکھے بغیر اس کی طرف اچھال دی۔ منیجر طارق نے جھک کر نوٹوں کی گڈی اٹھائی اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔
شاہ ہارون گیلانی نے طمانیت سے ایک گہری سانس لی۔ اور بڑا سا دھوئیں کا مرغولہ ہونٹوں سے خارج کیا۔
وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں کیوبن سگار کی مہک پھیل گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن شاہ ہارون گیلانی نے نرگس کے باپ تاج دین کو بلوایا۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتا ہوا حویلی میں حاضر ہوا۔
ریاضے کمدار نے اطلاع دی۔ ''شاہ جی! تاج دین آگیا ہے۔''
''اسے بٹھاؤ'' شاہ ہارون گیلانی نے جواب دیا۔ ریاضے کمدار نے سر جھکایا اور باہر آ کے تاج دین کو بادام کے درختوں کے نیچے بچھی چارپائی پر بٹھا دیا۔
''خیر تو ہے نا۔؟'' تاج دین نے حیرت آمیز گھبراہٹ سے پوچھا" اس سے پہلے تو کبھی شاہ جیؒ نے مجھے نہیں بلوایا۔!''
''پتا نہیں۔!'' ریاضے کمدار نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''تجھے معلوم ہوگا یا پھر شاہ جی کو۔!'' اور چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔
چاروں طرف حویلی کا صحن پھیلا ہوا تھا۔ کئی ایکڑوں میں بنی اس حویلی کے چاروں طرف بادام، آم، امرودوں، شہتوتوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں پھولوں کی وسیع و عریض کیاریاں تھیں۔ درختوں، پھولوں کے

''کیا تم نے اس کی مریدی کر لی ہے۔؟'' دفعتاً جیسے شاہ ہارون گیلانی کے بدن کو غصے کا تپ چڑھنے لگا۔
''جی ہم نے اُن کی، قادری سرکار کی، بیعت حاصل کر لی ہے۔ جی یہ تو اعزاز کی بات ہے نا۔!'' تاجے نے غیر محسوس انداز میں قادری سرکار کے احترام کی حدود واضح کر دیں۔
''مگر تم تمہارے پرکھے، یہ سارا علاقہ تو ہمارا مرید ہے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے اس کو کڑی نگاہوں سے گھورا۔
''جی سرکار ہم سب تو آپ کے والد جنتی شاہ جی کے مرید تھے۔'' تاجے نے کہنا شروع کیا۔ ''مگر جنتی شاہ جی کے پردہ کرنے کے بعد جب آپ نے گدی سنبھالی تو کسی کو بھی تجدید بیعت کے لئے طلب نہیں کیا۔ اور بیعت نہ لی۔ قادری سرکار فرماتے ہیں۔ جب تک مرشد حیات ہوں بیعت فسخ نہیں ہوتی۔ یا تو پیر و مرشد خود کسی سے بیعت کی اجازت دیں۔ یا مرشد پاک پردہ فرما جائیں۔ تو بیعت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر فیض کیلئے یا تو مرشد کے خلیفہ مجاز سے یا کسی سے بھی جس پر آپ کو یقین ہو کہ یہ اللہ والا ہے۔ اس کی تجدید بیعت کریں۔'' ''جی یہ تو شریعت کی بات ہے تو پھر ہم لوگ شریعت سے کیسے مکر سکتے ہیں جی۔۔۔!'' تاجے نے بڑے غور سے شاہ ہارون گیلانی کو دیکھا۔ ایک لمبا وقفہ لیا۔ اور گفتگو کا مسئلہ آگے بڑھایا۔ ''جی جب تک مجھے میں مرشد کے نام کا پتہ نہ ہو۔ زندگی کیسے آگے چلے گی۔ قیامت میں کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم تک لے جائے گا۔؟'' اس نے کمال معصومیت سے سوال کیا۔ ''کون اللہ کی۔۔۔ سوہنے رب کی پہچان کروائے گا۔؟''
شاہ ہارون گیلانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کے مضبوط قلعے کی بڑ جیاں گر رہی ہیں۔
''تو تم ان کے مرید ہو گئے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
''جی میں ہی کیا، سارا علاقہ ہی ان کا مرید بن گیا ہے۔۔۔!'' تاجے نے بتایا۔ اس کے انداز میں بلا کی لاپرواہی، بلا کا سکون تھا۔
شاہ ہارون گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے تاج دین عرف تاجا، تاج دین نہ رہا ہو۔ پھیل کر سمندر ہو گیا ہو۔ جس میں ان کی ذات بلکیاں کھا رہی ہو۔
''کیوں مرید ہو رہے ہیں۔ سب لوگ ان کے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے بے دھیانی میں سوال کیا۔
لمحے بھر کے ہزارویں حصے میں اچانک تاج دین عرف تاجے کو یہ احساس ہوا کہ وہ یہاں کمین تاجا نہیں۔ بے وقعت، بے نام، بے آسرا تاجا نہیں، ایک جیتے ہوئے سپہ سالار کا نمائندہ ہے۔!
''پتا ہے جی کیوں۔!'' تاجے نے کمال سکون سے جواب دیا۔ ''وہ تو بس بندے کو اتنا پیار دیتے ہیں۔ اتنا مان دیتے ہیں کہ بس نہال کر دیتے ہیں، اجال دیتے ہیں۔ شہد کر دیتے ہیں۔!'' تاجے کی آنکھیں افراطِ محبت سے، وفورِ جذبات سے، بے پناہ التفات کے احساس سے بند ہو گئیں۔ اس کا رواں رواں اپنے مرشد کے پیار کی بارش میں بھیگ گیا۔
''کیا کہتے ہیں وہ۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے دھیمے سے پوچھا۔
''جی وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نرگس کو لیجا رہے ہیں۔ تمہیں شاہ ہارون گیلانی بلائیں گے تو بتا دینا۔!'' تاجے نے بے خودی کی کیفیت میں جواب دیا۔
شاہ ہارون گیلانی کے منہ سے بے ساختہ ایک لمبی سانس جاری ہو گئی۔ انہیں لگا کہ جیسے بے پناہ گھٹن ہو رہی ہے۔ وہ تیزی سے اٹھے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے۔
ان کے پیچھے پیچھے ان کے کمدار، کمانڈوز بھی باہر نکل گئے۔ تاجا کیلا رہ گیا۔
تھوڑی دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وسیع و عریض ہال خالی تھا۔ تاجے نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے باہر آ گیا۔ طویل غلام گردش خالی تھی۔ دھوپ ماند پڑ گئی تھی۔ زرد ہو گئی تھی۔ وہ حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ اس کے آس پاس لوگ پھر رہے تھے، مگر وہ ان کے بیچ میں سے گزرتا ہوا صدر دروازے سے باہر نکل آیا۔ اسے کسی نے نہ روکا، نہ ٹوکا۔ وہ حویلی سے باہر آ کر بڑی سڑک

محسوس ہو رہی تھی۔ کیوبن سگار سے بنتا ہوا دھواں اس کو اپنی ناک میں جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔؟''

''سرکار جی غلام کو کیا خبر۔!'' تاج دین عرف تاجے نے بدستور ہاتھ جوڑے جوڑے کہا'' مائی باپ نے طلب کیا ہے۔ تو ضرور ای کوئی حکم ہوگا۔ جی ہم تو حاضر ہیں۔''

''نرگس کہاں ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سرد لہجے میں پوچھا۔

ان کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ تاجے کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے بدن میں سینکڑوں سانپ رینگنے لگے ہوں۔ مارے خوف و دہشت کے اس کی شلوار گیلی ہوگئی۔

☆☆☆

''ج۔۔۔ج۔۔۔جی وہ تو چلی گئی۔!'' تاجے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''کہاں چلی گئی۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے گرج کے پوچھا۔

''جی۔۔۔جی شاہ جی اس کو قادری سرکار لے گئے۔۔۔!'' تاجے نے ہاتھ جوڑے۔

''کیا۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا سارا کروفر ڈھیلا پڑ گیا۔ تنے ہوئے اعصاب، اُبلتی ہوئی قہر برساتی ہوئی سرخ آنکھیں، بدن کا تناؤ، جیسے یکدم رخصت ہونے لگا ہو۔

اچانک۔۔۔ بالکل اچانک، کسی الہام کی طرح، لمحے کے ہزارویں حصے میں، تمام زندگی کی گذری بے برکت ساعتوں میں سے، جیسے مرتے کو زندگی مل جائے، کسی پھسلتے ہوئے کو کسی چٹان کا، کسی پتھر کا کونا مل جائے۔ کسی ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ مایوس، نامراد، ناکام، ناشاد کو جیسے کن فیکون کا ادراک ہو جائے۔ بیعنہ ایسے ہی۔ تاج دین عرف تاجے کو لمحہ، نابود میں لمحہ، قیام میسر آ گیا۔ یہ خیال اس پر وارد ہو گیا کہ اس کے نئے قادری سرکار کا نام کسی اسم اعظم کی طرح ہے۔ جو اس کو ہر مشکل سے نکالنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

کبھی کبھی فرد خود کو کتنی تیزی سے بے معتبری کے حصار سے نکال کر، نا اعتباری کی دھوپ میں کھڑا کر دیتا ہے، اور وہ لوگ جنہیں کوئی کچھ نہیں سمجھتا۔ بے نام۔ بے چہرا۔ بے وقعت لوگ معتبری کی بلندی پر فائز ہو جاتے ہیں۔

کمال ہے اے کن فیکون والے۔۔۔!اے عزت اور ذلت کے تخت الٹنے والے۔۔۔! تجھے سلام تو کمال در کمال، تیری ہستی لازوال حقیقتوں کو اجالتی ہے۔

صدیوں کا ادراک لمحے بھر میں تاج دین عرف تاجے کے کاسہ سر میں سما گیا۔

ٹھہراؤ۔ سکون۔ طمانیت۔ نے اس کے بدن کو چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔

''کب لے گئے وہ۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی آواز بلند ہوئی۔

تاج دین عرف تاجے کو جیسے صدیوں کو سفر نے لمحہ، نابود سے لمحہ، موجود میں لا کھڑا کیا۔

''شاہ جی۔۔۔وہ تو اسی دن، رات کو لے گئے تھے۔!'' تاجے نے کہا۔ اس کو اپنی آواز کے ٹھہراؤ اور لہجے پر خود بھی تعجب ہوا۔ کیا یہ اس کی آواز تھی۔؟ اس کا دل چاہا کہ وہ کچھ بول کر اپنی آواز خود ہی دوبارہ سنے۔ مگر شاہ جی کے احترام میں چپ رہا۔

''کیا خود آئے تھے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کے قدرے ڈھیلے لہجے نے لمحے بھر میں اس کی آرزو پوری کر دی۔

اچانک جیسے تاجے کے لہجے میں عقیدت، محبت اور پیار کے ہزاروں دیپ روشن ہو گئے۔

''انہوں نے نرگس کی حالت دیکھی تو بولے ہم اپنی بیٹی لے جا رہے ہیں۔'' تاجے نے لمحے بھر کو خاموشی کا سہارا لیا، پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔'' شاہ جی ہماری کیا مجال کہ ہم قادری سرکار کو انکار کریں۔ وہ تو جی ہمارے مرشد پاک ہیں۔ ہماری اولاد تو کیا۔! ہمارے بدن کی بوٹیاں بھی مانگ سکتے ہیں۔ بھلا ہم کیسے منع کر سکتے ہیں۔؟''

جڑیں چاروں طرف پیوست کر لیتا ہے۔

☆☆☆

''آدمی آدمی کے زخم کا مداوا ہے۔ آدمی ہی زخم کھاتا ہے۔ آدمی ہی زخم دیتا ہے اور پھر آدمی ہی زخم کا مداوا بن جاتا ہے۔'' قادری سرکار کہہ رہے تھے۔ ان کے مریدین، عقیدت مند، مداح سر جھکائے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ''لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم سیکھتے نہیں۔ حالات، واقعات ہمیں اپنے، اپنے طریقے سے سنبھلنے کا، جاننے کا موقع دیتے ہیں۔ مگر ہم ہر واقعہ، ہر حادثے کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اور پھر اسے شعوری طور پر بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ اکثر اوقات قدرت کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ ہم اس واقعے، اس حادثے کی گہرائی میں جائیں۔ اس کو سوچیں، سمجھیں، اس کا تجزیہ کریں اور اس طرح سے تربیت لیں۔ یہ تربیت کا وہ ربانی پہلو ہے۔ جس کے ذریعے خدا نے اپنے انبیاء علیہ اسلام کو، اپنے پیاروں کو، اپنے اولیاء کو تربیت دی۔ یہ علم لدنی کا ظاہری حصہ ہے جو کہ ہر اس شخص کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ آگے لے جانا چاہتا ہے۔ مگر افسوس آدمی پر۔! وہ ان باتوں کو، واقعات کو، حادثات کو، سمجھنے کی، ان پر غور کرنے کی، زحمت ہی نہیں کرتا۔ بس قسمت کو کوستا، اور تقدیر کو برا بھلا کہتا رہتا ہے۔!'' قادری سرکار خاموش ہو گئے۔ یوں لگا کہ جیسے اچانک کائنات سنسان ہو گئی ہو۔

چند لمحے ایسی ہی کیفیت طاری رہی۔ پھر سبحان اللہ۔۔۔ الحمدللہ کا ایک شور اٹھا اور یوں لگا کہ جیسے کائنات بیدار ہو گئی ہو۔

قادری سرکار کے درس عام عالموں، پیروں، واعظوں، پروفیسرز نما سکالرز سے بہت مختلف ہوتے تھے۔ وہ بات کو انتہائی آسان حقیقتوں سے شروع کرتے اور ایسی جگہ لا کر ختم دیتے جہاں سے انسان کچھ نا کچھ سوچنا شروع کر دیتا ہے۔

میں بھی سوچ رہا تھا۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ کہیں قادری سرکار مجھ سے تو مخاطب نہیں تھے۔؟ ہاں ایسا ہی ہے۔ میری محبت نے مجھے بارہ سال تڑپایا۔ راتوں کی نیند حرام کی، سکھ، چین، آرام، کیریئر سب اس کی نذر ہو گیا۔ سارا جیون زخم، زخم ہو گیا۔ آدمی زخم دیتا ہے۔ وہ روحی تھی۔ آدمی زخم کھاتا ہے۔ وہ میں تھا۔ اور آدمی ہی زخم کا مداوا بنتا ہے۔ وہ بھی میں تھا۔ کیا ہو رہا ہے۔؟ میرے اندر بے چینی پھیلنے لگی۔ میں نے خانقاہ کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے وحشت ہونا شروع ہوئی۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سنیئے۔۔۔!'' میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

ایک نرم چہرے والے شخص نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ ہی تنزیل ہیں۔؟''

''جی ہاں۔۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کو قادری سرکار بلا رہے ہیں۔'' اس نے مجھے پیغام دیا۔ ''آپ اندر تشریف لے آئیں۔!''

''کیا۔؟'' حیرت نے مجھے جکڑ لیا۔ ''قادری سرکار مجھے بلا رہے ہیں۔ اب کیا ہو گا۔ کیا ہونے والا ہے۔؟'' بے شمار اجنبی سوالات نے مجھے گھیر لیا۔

☆☆☆

''شاہ جی ضمنی الیکشن میں آٹھ دن رہ گئے ہیں۔'' ریاض کمدار نے شاہ ہارون گیلانی کو رپورٹ پیش کی۔

شاہ ہارون گیلانی اس وقت اپنے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آٹھ، دس افراد ان کے ارد گرد جمع تھے۔ جو کہ ان کے سیاسی معاملات میں معاون تھے۔

''فضل اللہ کیا کہتا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے سوال کیا۔

''شاہ جی اس کے ساتھ ساری گل بات ہو گئی ہے۔ کہتا ہے کہ اٹھارہ لاکھ تو ہمارے خرچ ہو گئے ہیں۔ آٹھ دس اوپر ہوں گے تو بات بنے گی۔!'' ریاض کمدار نے بتایا۔

سے اُتر کر کھیتوں والی تنگ پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اپنے گھر جانے کے لئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ بہت مطمئن۔ اس کو اسم اعظم مل گیا تھا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ بحیثیت فرد وہ معتبر ہے۔ اور معتبر ہونے کے احساس نے اس کے اندر تک سکون بھر دیا تھا۔ اس کو معتبر کرنے والے قادری سرکار تھے۔

☆☆☆

شاہ ہارون گیلانی اپنے سٹڈی روم میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ کیوبن سگار ان کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ مگر وہ اندر ہی اندر بے کلی، بے چینی، غصے، اکتاہٹ اور شدید رنج میں مبتلا تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سینکڑوں میل دور بیٹھا ہوا شخص ان کے مضبوط قلعے میں اتنی کامیابی سے اپنی فتح یابی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے۔ کہاں غلطی، کہاں جھول، کہاں بے احتیاطی ہوئی ہے۔۔۔! سوال در سوال ان کے اندر جنم لے رہے تھے۔

وہ بہت گھاگ، بہت منجھے ہوئے، بہت طاقتور سیاستدان تھے۔ ہوا کا رخ پہچاننے میں ملکہ رکھتے تھے۔ ہر قدم اتنا نپا تلا سوچ کر، سمجھ کر، اعداد و شمار کو، نفع نقصان کی بنیاد پر مرتب کر کے اٹھاتے تھے کہ بڑے سے بڑا مخالف ان کو مات نہیں دے سکتا تھا۔ پھر وہ قادری سرکار کو کیا سمجھتے۔؟

قادری سرکار۔۔۔! وہ تو بس یہی سمجھ رہے تھے کہ علاقے میں ان کے چند سو مرید ہو گئے۔ مگر دیگ کے ایک ہی دانے نے ان کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

قادری سرکار سے ان کی ملاقات ملک نیاز نے کروائی تھی۔ وہ ٹرانسپورٹ کا وزیر تھا۔ شاہ ہارون گیلانی اس کی ساری ہسٹری جانتے تھے۔ ایک کھٹارا سی بس سے اس نے اپنے کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ اور دس سال کے قلیل عرصے میں اس کا شمار ملک کے چند بڑے ٹرانسپورٹرز میں ہونے لگا تھا۔ وہ اس کی ساری وجہ قادری سرکار کی دعائیں قرار دیتا تھا۔ قادری سرکار سے ان کو پہلی ہی ملاقات میں کچھ بھی خاص نہیں لگا تھا۔ سوائے اس کے کہ قادری سرکار بہت کم اور بہت نپا تلا بولتے تھے۔ سنتے زیادہ تھے۔ اور سینکڑوں جملوں کا جواب دو، چار مختصر جملوں میں دے دیتے تھے۔

وہ ان کو عام پیروں سے مختلف تو لگے تھے، مگر بس اس سے زیادہ نہ انہوں نے توجہ دی، نہ کبھی ان کی ضرورت محسوس کی۔ یہ تو ضمنی انتخابات میں، ان کو پتا چلا کہ اس حلقے میں ان کے مریدین کافی ہیں۔ تو وہ قادری سرکار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مگر وہاں ان کو ایسی چویشن کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے وقتی طور پر پسپائی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ مگر اب وہ سوچ رہے تھے کہ ان کا فیصلہ بروقت تھا۔

اندر ہی اندر سرنگ بن گئی تھی۔ لیکن کیسے۔؟

تب اچانک ہی قادری سرکار کی آواز جیسے ذہن کے نہاں خانوں سے ابھر آئی۔

''تم لوگوں سے صرف غرض کا، دونوں کا رشتہ رکھتے ہو۔ ان کی پیداوار، ان کی صلاحیتیں سب رہن رکھ لیتے ہو۔ مگر ان کے حقوق، ان کے حالات پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ یاد رکھو معاشرے کے کچلے ہوئے، پسے ہوئے لوگ اگر اکٹھا ہو جائیں تو پھر انقلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ حقائق ہیں۔ ذرا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ سلم کی دعوت پر غور کرو۔ وحدانیت اور مساوات پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، دعوت پر لبیک کہنے والے، امراء تھے، یا عام مزدور، غلام۔۔۔؟''

''کیا ہونے والا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کے ماتھے پر پسینہ پھوٹنے لگا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ کیا کچلے ہوئے لوگوں کو سہارا دینے، انہیں ہمارے برابر کھڑا کرنے والا آ گیا ہے۔؟'' انہوں نے زور سے سر جھٹکا۔

سگار میں سے موٹا سا گل جھڑا۔ سگار سلگتا ہوا، ان کی انگلیوں کو جلن کا احساس دینے لگا تھا۔ انہوں نے جلدی سے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اور اپنے گرد و پیش یوں دیکھنے لگے کہ جیسے کسی کی موجودگی کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''کوئی ہے۔؟'' انہوں نے چلا کر کہا۔ مگر لمبی چوڑی سٹڈی روم میں تنہائی کے علاوہ دوسرا کوئی ساتھی نہیں تھا۔

وہ باہر خوف کو تلاشنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر یہ بھول رہے تھے کہ خوف اندر سے جنم لیتا ہے اور برگد کی طرح اپنی

''نہ کوئی جماعت، نہ کوئی زمیندار، نہ ٹھیکے دار۔!'' ریاضے کمدار نے کہا۔ ''بس اللہ بیلی ہے۔!'' اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''گدھے۔!'' پتا نہیں کیوں شاہ ہارون گیلانی کو جلال آ گیا۔ ''تو اس کو معمولی سمجھتا ہے۔ جس کا اللہ بیلی ہو۔!'' بولتے ہوئے سب چپ ہو گئے۔ جیسے اچانک ہی سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

''شاہ جی سچ کہتے ہیں۔ ریاضے۔!'' منشی عبدالکریم کی آواز بلند ہوئی۔ ''جس کا اللہ بیلی ہو اس کو دنیا کی کیا فکر۔۔۔! یہ ہمیشہ اللہ والے، شاہ جی جیسے لوگ سمجھتے ہیں۔ چل اٹھ شاہ جی سے معافی مانگ۔!''

''معاف کر دیں شاہ جی۔'' ریاضے کمدار کو تو جیسے اس صورت حال سے نکلنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر شاہ ہارون گیلانی کے پیروں سے لپٹ گیا۔

پھر شاہ ہارون گیلانی کے غصے سے سب ہی لرزتے تھے۔ ان کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں تھی کسی میں۔ حکم عدولی، غصے، ناراضگی کا شکار ہونے والے ان گنت لوگوں کے احوال ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھے۔ بعض اوقات تو انتہائی معمولی غلطی، بے ارادہ، بے اختیار غلطی بھی ظلم اور تشدد کا سبب بن جاتی تھی۔

شاہ ہارون گیلانی کے سنگین لہجے میں اسکرین کی طرح ان کو تمام معاملات کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

''خیال کیا کر۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے پاؤں سمیٹ لیے۔

''ذرا اس خادم حسین کو تو بھی کبھی بلاؤ۔'' شاہ ہارون گیلانی نے ریاضے کمدار کو حکم دیا۔

''جی اچھا جی۔!'' ریاضے کمدار نے سر جھکا کر کہا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

اچانک شاہ ہارون گیلانی کے بلیک بیری موبائل سے ایک دلکش قومی ترانے کی دھن بلند ہونے لگی۔

''ہیلو۔!''

''شاہ جی، ہم بول رہے ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے ایک لحظہ دیر نہ لگائی آواز پہچاننے میں۔

''آپ۔ آپ کیسے ہیں۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ وہ سب تیزی سے اٹھے اور الٹے پاؤں باہر نکل گئے۔

چند لمحوں میں ڈرائنگ روم خالی ہو گیا۔

''آپ کب آئے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ بے حد نرم رسیلا ہو گیا۔

تین چار دن ہو گئے ہمیں واپس آئے۔ مگر تم نے ہماری خبر ہی نہ لی۔!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جب حکم ہو حاضر ہو جاتا ہوں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ان کے لہجے سے نرمی، مروت، تابعداری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''پھر صبح آ جاؤ۔! کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہمیں واپس درگاہ بھی جانا ہے۔!'' آواز میں بلا کی لاپروائی تھی۔

''جی بہتر ہے۔'' شاہ ہارون گیلانی نے حاجی بجر کے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ ان کے وسیع فراخ، بے شکن ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

یہ ڈرا کے رکھنے والے خود بھی کسی سے اندر ہی اندر ڈرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات روایتوں کی طرح ڈر بھی لوگوں میں نسل در نسل سرایت کرتا رہتا ہے۔ اور ویسے بھی اکثر بڑے آدمیوں کا ضمیر خوف اور لالچ کے خمیر سے گندھا ہوتا ہے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی ملک کی بہت بڑی، بہت محترم، بہت عظیم الشان درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ وہ درگاہ جس کا سنتے ہی دل فرط عقیدت سے، نگاہیں احترام کے بوجھ سے پلکوں کا بوجھ اٹھانا چھوڑ دیتی تھیں۔ اس درگاہ سے وابستگی نسلوں کا فخر سمجھی جاتی تھی۔ دو چار ہی درگاہیں تھیں جہاں سے تعلق رکھنا کھرے سید ہونے کی علامت تھا۔ اور پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی دونوں ہی چیزوں کیلئے معتبر تھے۔

اس ضمنی انتخابات میں سات امیدوار حصہ لے رہے تھے۔ فضل اللہ آزاد امیدوار تھا اور موجودہ وقت میں اس کے حاجی اچھے خاصے تھے۔

''ٹھیک ہے پچیس لاکھ روپے دو۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے لاپرواہی سے کہا'' پر وہ مانا کیسے۔؟''

''شاہ جی۔!'' ریاضے کمدار نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''میں نے اس کو سمجھایا کہ اگلے الیکشن میں ڈیڑھ برس رہ گیا ہے۔ تو ضمنی میں جیت کر کیا لے گا۔ نا تیری کوئی لابی ہے نا بولی۔ ہر پارٹی اگلے الیکشن پر نظر جمائے بیٹھی ہے۔ جب مضبوط پارٹی کسی اور کو سپورٹ کرے گی تو تجھے اتنا بھی نہیں ملے گا اور پھر شاہ جی خود اس سیٹ پر کسی کو کھڑا کریں گے۔ جس کے ساتھ شاہ جی ہوں گے ووٹ تو سارے اسی کو ملنے ہیں۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یوں سودا پکا ہو گیا۔''

''اور حفیظ دا پتر کیا بولتا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''تو بول۔'' ریاضے کمدار نے ایک دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا نام اقبال تھا۔ جس کو سب بالا کہتے تھے۔ اس کے بائیں کان میں موٹی سی ایک سونے کی بالی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے اندر ایک سرخ یاقوت پڑا ہوا تھا۔

''شاہ جی سرکار۔۔۔!'' بالے نے اطمینان سے کہا۔ ''حفیظ دا پتر تو میسنہ نکلا۔ ایسی شعلہ بیان تقریریں کرتا تھا کہ مانو آگ لگا دے گا۔ میں سیدھا اس کے پاس گیا اور ریحانہ بجلی کی سی ڈی اس کو دکھائی اور جس میں ریحانہ بجلی کی تباہ کن کارکردگی اور آخری سین میں بے چاری کے چنے پڑ بے جارہے تھے۔ بس جی میں نے تو پھر اس کو یہی کہا تیری تین بہنوں کے لئے نو بندے کافی ہوں گے یا بارہ۔ بس جی وہ تو فوراً ہی ڈھے گیا۔ پندرہ منٹ میں ہی اس کو بل ہلا کر تپ چڑھ گیا۔ میں نے دستبرداری کے کاغذات پر سائن انگوٹھے کروائے اور علاج کے لئے لاکھ روپیا دیکر چلا آیا۔!'' بالے نے بتایا اور شاہ ہارون گیلانی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ اور نظریں جھکا کر قالین کی طرف دیکھنے لگا۔ شاہ ہارون گیلانی چند لمحے اس کو دیکھتے رہے۔ پھر جیب سے ایک گڈی نکال کر اس کی طرف اچھال دی۔

بالے نے بڑی عقیدت سے گڈی کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر اٹھا شاہ ہارون گیلانی کی طرف بڑھا۔ نوٹوں کی گڈی شاہ جی کے پیروں سے مس کر کے چوم کے جیب میں رکھ لی۔

تاجے کمدار نے کہا۔ ''پھر ایک مسئلہ ہے شاہ جی۔!''

''کہو۔۔!''

''ایک امیدوار ایسا بھی ہے جس نے ابھی تک انتخابی مہم نہیں چلائی۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔ وہ تو اپنے کاغذات بھر کے ایک پنچایت کر کے گھر بیٹھ رہا ہے۔!''

''وہ کون ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کی چھٹی حس اچانک بیدار ہونے لگی۔ ''کیا نام ہے۔؟''

''خادم حسین نام ہے جی اس کا۔۔!'' ریاضے کمدار نے بتایا۔

''کیا ہے اس کا آگا پیچھا۔؟'' بے ساختہ شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

''ایم اے، بی ایڈ ہے۔ اس کے باپ کی چار کلے زمین ہے۔ ایک چھوٹا سا سکول اپنی زمین پر بنایا ہے۔ پہلے شہر میں رہتا تھا۔ پھر واپس آ گیا۔ کہتا ہے کہ حکم ہوا ہے کہ جو سیکھا ہے اس کو آگے پھیلاؤں۔ گاؤں والوں نے ہی اس کو کھڑا کیا ہے۔ اس کے پاس تو روپیہ پیسا بھی نہیں۔ ہے جو کماتا ہے وہ وہیں سکول میں بچوں کی کتابوں، کابیوں، کپڑوں پر خرچ کر دیتا ہے۔ شادی نہیں کی، باپ ہے، دو بہنیں ہیں، ایک چھوٹا معذور بھائی ہے۔!''

''انتخابی مہم کیوں نہیں چلا رہا ہے۔؟''

''کہتا ہے کہ ووٹ مانگنا، خود کو سرداری کے لئے پیش کرنا خلاف سنت ہے۔ یہ اللہ کے بندوں کی مرضی ہے کہ وہ کس کو اہل سمجھتے ہیں۔''

''اس کے پیچھے کون ہے۔؟'' بے ساختہ شاہ ہارون گیلانی نے پوچھا۔

بھرپور ادب، احترام، تکلف اور خوف لیا ہوا احساس چاروں جانب رچا بسا تھا۔

شاہ ہارون گیلانی خاموشی سے بیٹھ گئے۔ وسیع وعریض نشست گاہ میں کوئی نہیں تھا۔ سہیل انہیں بٹھا کر دبے قدموں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک شاہ ہارون گیلانی ادھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر آرام وہ انداز میں نشست پر نیم دراز ہو گئے۔ پتا نہیں کتنی دیر گزری تھی کہ مدھم شور سے انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی اندر داخل ہو رہے تھے۔ شاہ ہارون گیلانی اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی آگے بڑھ کر بغل گیر ہوئے، مصافحہ کیا، اور جب تک پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی اپنی نشست پر بیٹھ نہیں گئے کھڑے رہے۔

''یہاں آئیں ہمارے پاس۔'' پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی نے انہیں مخاطب کیا۔ ''یہاں بیٹھئے۔'' انہوں نے تھوڑا سا کھسک کر اپنے پاس ہی جگہ بنائی۔ شاہ ہارون گیلانی ان کے پاس بیٹھ گئے۔

''آپ نے یاد کیا۔ کوئی ضروری بات تھی۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے آہستگی سے پوچھا۔

''آپ کے علاقے میں کون کھڑا ہو رہا ہے۔؟''

''عبداللہ۔۔۔ ہمارا بھتیجا ہے۔'' کچھ عرصے قبل امریکہ سے پڑھ کر آیا ہے۔ اب سیاست میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔

''اگر آپ کا اپنا بھتیجا ہے تو پھر اس کو الیکشن میں کھڑا کریں۔ ضمنی میں کیا رکھا ہے۔؟'' پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی نے سوال کیا۔

''اس لیئے کہ سال ڈیڑھ پڑا ہے۔ ضمنی میں جیت کر تھوڑا مانوس ہو جائے گا اسمبلی کے ماحول سے، کچھ یاریاں دوستیاں بن جائیں گی، پھر تو بطخ کے بچے خود ہی تیرنا سیکھ لیتے ہیں اپنی جبلت کے سہارے۔!'' شاہ ہارون گیلانی ہنسے۔

''بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس جگہ سے ملک ریاض اپنے آدمی کو کامیاب کروانا چاہتے ہیں۔!''

پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''وہ چاہتے ہیں کہ بات طے ہو جائے تاکہ پھر کوئی مشکل نہ ہو۔ بلا وجہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنا اچھا نہیں۔!''

''کیا۔۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا منہ بے ساختہ حیرت سے کھل گیا۔ ''ملک ریاض کی یہ جرأت کہ وہ ہمارے مقابلے میں آدمی کھڑا کرے۔؟''

''بات جرأت کی نہیں حقائق کی ہو رہی ہے۔'' شاہ ہمدانی نے اطمینان سے کہا۔ ''کچھ نہ کچھ تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ تم اس کے ساتھ الیکشن میں ایڈجسٹمنٹ کر لینا۔ معاملہ طے ہو جائے گا۔!''

''آپ کیوں اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''کیا ہمارے خاندان میں کوئی نہیں رہا جو ہم اس سیٹ کو چھوڑ دیں۔''

''خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے سمجھایا۔ ''اس کو الیکشن میں آنے دو، وہ نئی پارٹی بنانا چاہ رہا ہے، بہت پیسہ ہے اس کے پاس، مگر تجربہ نہیں، گراس روٹ لیول بھی صفر ہے۔ بہت بھرے کو راستہ نہ دو تو پھر چھلک پڑتا ہے۔ ڈیڑھ سال میں خاصی اہمیت بنالے گا، لوگوں کو ایک نئی پارٹی مل جائے گی اور پھر اس پارٹی کو ہم سب سپورٹ کریں گے۔!''

''مگر اس کا فائدہ کیا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے الجھن ظاہر کی۔

''ہارون گیلانی اپنے خول سے باہر نکلو۔ لوگ بدل رہے ہیں۔ تنگ آ رہے ہیں۔ باسٹھ برس سے ایک ہی کھیل دیکھ رہے ہیں۔ میوزیکل چیئر، باری باری حکومت چل رہی ہے۔ مگر مسائل حل نہیں ہو رہے۔ اس سے پہلے کہ عوام کی قوت کا سیلاب ہمیں بہا کر لے جائے۔ ہمیں اس پہ بند باندھنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔!''

''تو پھر مقابلہ ہونے دیں تاکہ لوگ نورا کشتی نہ سمجھیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''اگر اپنی مرضی سے ووٹ دیکر منتخب کریں گے تو انہیں اقتدار میں شراکت کا احساس ہوگا۔''

جس ملک میں تعلیم کا تناسب محض دستخط کے نام پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا بمشکل 22 فیصد سے زیادہ نہ ہو۔ جہاں آج بھی دوسری شادی کے لئے بدکاری کا الزام لگا کر قتل کرنا ایک سماجی رویہ سمجھ کر تسلیم کیا جاتا ہو۔ جہاں عورتوں کی بے حرمتی کو بھی نسلی فخر سمجھا جاتا ہو۔ جس معاشرے میں عورت، لڑکا رکھنا باعث فخر سمجھا جاتا ہو۔ اس معاشرے میں پیر کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ جب جہل کا یہ عالم ہو کہ دنیا اور آخرت اعمال کے بجائے پیروں کی خوشنودی پر منحصر کر دی جائے۔ تو پھر وہاں الیسے، خوف، ڈر، سماجی جرائم کا رونما ہونا اور اخلاقی قدروں کا پامال ہونا ایک عام سی بات رہ جاتی ہے۔

ہندوستان کی نسلی عصبیت آج بھی کسی نہ کسی روپ میں نام بدل کر ہمارے اندر رہتی ہے۔ ذاتوں کی تقسیم کا نظام جو کہ مسلمانوں نے گذشتہ بارہ سو برسوں میں جذب کیا تھا۔ کلمے کو اختیار کرنے کے باوجود اسے اپنے اندر سے ترک نہ کر سکے۔ ایسا معاشرہ ترقی کر کے، مذہب، سیاست اور معیشت کی طاقتور تکون بن گیا تھا جہاں سب نے اپنے اپنے کارٹل بنا لئے تھے۔ اس کارٹل سے باہر رہنا ناممکن تھا اور دوسرا کوئی کارٹل والوں کی مرضی کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی اس طاقتور تکون کا ایک بہت اہم حصہ تھے۔ ان کے جاری کیے ہوئے نسب نامے ذات کے ارفع ہونے کی دلیل تھے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ مرید تھے۔ لطف کی بات یہ تھی ان درگاہوں کی سجادہ نشینی بھی یقینی اور بے یقینی کے حصار میں ڈولتی رہتی تھی۔ ہر گدی کے درجن، درجن بھر دعویدار تھے۔ مقدمات، اعتراضات، شکوک اور شبہات سے بھرے ہوئے سجادہ نشین مسکراتے چہروں، چمکتی ہوئی عباؤں جبہ اور دستاروں کے سائے تلے عقیدت اور محبت کے چراغ جلائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

شاہ ہارون گیلانی کی سیاہ مرسیڈیز، پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی وسیع وعریض کوٹھی کے پورچ میں جا رکی۔ وہ صرف ایک ڈرائیور، ایک گارڈ کے ہمراہ ہی آئے تھے۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے آگے بڑے بڑوں کا کروفر ڈھیلا پڑ جاتا تھا۔ کیونکہ وہ سیاسی، سماجی، اور مذہبی تینوں ہی حلقوں کی مثلث کی ان دیکھی طاقت تھے، وہ طاقت جو بعض اوقات دکھائی تو نہیں دیتی ہے لیکن محسوس لازمی ہو جاتی ہے۔

جونہی شاہ ہارون گیلانی کی گاڑی کا دروازہ کھلا لپک کر سہیل آگے بڑھا۔ سہیل پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کا خاص آدمی تھا۔

"زہے نصیب آج شاہ جی تشریف لائے، ہماری قسمت جاگی۔!" وہ بے حد تپاک سے بولا۔

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے اور پوچھا۔ "کیسے ہو سہیل بڑی سیر سُور کرتے پھر رہے ہو۔؟"

"بس جی شاہ جی پیر صاحب کے اردگرد ہی رہتا ہوں۔ ہم پروانوں کی تو وہ ہی شمع ہیں، ان ہی پر ایک دن جل مر جائیں گے۔!" سہیل نے برجستہ جواب دیا۔

شاہ ہارون گیلانی مسکرائے اور سہیل کی معیت میں اندر داخل ہو گئے۔ ابھی صبح کے پانچ ہی بج رہے تھے۔ مگر چاروں طرف دن چڑھے کی چہل پہل تھی۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر وقت محو عبادت رہتے ہیں۔ کبھی سوتے نہیں ہیں، ان کی اس کرامت کے بے شمار گواہ تھے۔ عرس کے دنوں میں محافل میں ان کو مسلسل جاگتا دیکھ کر ان کے مریدین ان پر واری صدقے جاتے تھے۔ لیکن مخالف کہتے تھے کہ وہ نیند نہ آنے کی دوا کھاتے ہیں، یہ سچ تھا، مگر وہ نیند آنے کے لئے دوا کھاتے تھے۔ وہ انسومنیا کے مریض تھے، یعنی وہ بیماری جس میں نیند ہی نہیں آتی۔ بس اونگھ سی آ جاتی ہے۔ اندر کا منظر دیدنی تھا۔ انتہائی خوبصورت نشست گاہ تھی، انتہائی مہنگے قالین، سیاہ چمڑوں کی دبیز نشستیں، اور گرد فرانسیسی دریچوں پر سرسراتے ہوئے باریک جارجٹ وشیفون کے پردے، ہر نشست کے سامنے بے حد نفیس برتنوں میں پھل اور میوہ جات رکھے ہوئے تھے۔ خوبصورت مہکتے ہوئے گلدستوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ بتدریج بلند ہوتی ہوئی نشستوں میں سے اونچی وسیع، فراغ نشست پیر سید جہانگیر شاہ ہمدانی کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے مغل شہنشاہ کا دربار،

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کبھی منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

''بھولے بادشاہ۔'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے ہنس کر کہا۔ ''اگر لوگوں نے آزادی کے ساتھ، شعور کے ساتھ، سچائی کا ادراک کر کے ووٹ دیا تو پھر وہ نہ تمہیں ووٹ دیں گے اور نہ ہی ملک ریاض کو وہ کسی تیسرے کو منتخب کر لیں گے۔ لوگوں کو محدود آزادی سے زیادہ اجازت نہیں دی جا سکتی، ورنہ سارا سسٹم ڈی ریل ہو جائے گا۔ اور ہمارا سارا جاہ و جلال، شاہانہ کروفر عوام کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔''

''لیکن۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہنا چاہا۔

''سنو۔۔۔!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے لہجہ بدلا۔ ''ہم نے تمہیں بتا دیا اب تم جانو اور تمہارا کام۔ فیصلہ تمہارا، علاقہ تمہارا۔''

شاہ ہارون گیلانی خاموش ہو گئے، چند لمحے خاموشی رہی، پھر شاہ ہارون گیلانی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔''

''ضرور پوچھو!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے ملائمت سے کہا اور انگور کا ایک بڑا سا دانہ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

''آپ کس کے ساتھ ہیں۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے اپنی سوالیہ نگاہیں پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

''ہم۔۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اطمینان سے پہلو بدلا، ایرانی قہوے کا ایک گھونٹ لیا اور صاف اور ہموار لہجے میں جواب دیا۔ ''ہم وقت کے ساتھ ہیں!''۔

شاہ ہارون گیلانی نے انہیں دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''اجازت ہے؟'' انہوں نے کہا اور بغیر جواب سنے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی اطمینان سے انہیں دیکھتے رہے۔ جب وہ باہر نکل گئے تو انہوں نے اپنے موبائل فون کے بٹن پش کرنا شروع کر دیئے۔ چند ہی لمحوں میں رابطہ قائم ہو گیا۔

دوسری طرف شاید کوئی منتظر ہی بیٹھا تھا، سی ایل آئی پر نمبر دیکھتے ہوئے بیتاب ہو گیا۔ ''پیر جی کام ہو گیا۔۔؟''

''نہیں۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے جواب دیا۔ ''ہارون گیلانی نہیں مانا۔ اب تم جو چاہو کر سکتے ہو، کر لو۔''

''پیر جی ہمارا تو نذرانہ ہی ضائع گیا۔''

''اپنے کروڑ کو رو رہے ہو تم تو کہہ رہے تھے ملک ریاض کہ یہ درگاہ شریف کی مرمت کے لئے ہماری طرف سے رکھ لیجئے۔ نذر کرنے کے بعد بھی دل میں میل بھرا ہے۔۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے درشت لہجے میں کہا اور پوچھا۔ ''کیا ہم سے تعلق توڑ رہے ہو۔؟''

''ارے۔۔۔ ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' ملک ریاض کی گھبرائی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ''میری توبہ، خدا مجھے مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہ کرے، ایسے تو کئی کروڑ آپ پر نثار۔۔!''

''پیروں سے جڑے رہو گے تو فائدے میں رہو گے۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے چمکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سیاست میں آئے ہو تو دل بڑا رکھو، لوگ تو پچاس پچاس کروڑ لے کر نکلتے ہیں، تمہاری تو اتنی شوگر ملیں ہیں۔ کاروبار ہیں۔ کچھ سر عام۔ کچھ خفیہ۔۔ خفیہ سا۔۔!'' وہ ہنسے!

''آپ بھی بس۔۔!'' ملک ریاض کا لہجہ ایک دم بامروت ہو گیا۔ ''جیسے مناسب سمجھیں لیکن ایک بات ہے۔۔!''

''وہ کیا۔''

''پھر میں الیکشن میں ہارون گیلانی کا لحاظ نہیں کروں گا۔!''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''ہم نہ تمہیں روک سکتے ہیں، نہ اسے۔ ہم تو افہام و تفہیم چاہتے ہیں، باقی معاملات تم اہل سیاست جانو۔ ہم تو دعائیں کرتے ہیں۔!'' انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا اور جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

میں نے کسی کا بتایا ہوا نو مہینے دوائی کا کورس کیا تھا لیکن سینے کی تکلیف اب تک ہے جس سے میں سخت پریشان ہوں کہ آخر یہ تکلیف ختم کیوں نہیں ہوتی جبکہ میں ابھی تک اس کا علاج بھی کرا رہی ہوں۔ بابا جی! کچھ ایسا علاج بتایئے کہ یہ تکلیف جڑ سے ختم ہو جائے۔ بابا جی! اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆ بیٹے امداد! جب علاج تمہیں خود کرنا ہے تو پھر مجھے لکھ کر اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ تمہارا خط صرف اس لیے شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسرے پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہو اپنے طور سے علاج کرنا کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

□ شہلا۔ کے پی کے

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ میری اور میری بہن کی دور کی نظر بہت کمزور ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ دور کی نظر ٹھیک ہو جائے۔ میری نظر کا نمبر منفی ۳.۵۰ ہے جبکہ میری بہن کی نظر کا نمبر منفی ۳.۰۰ ہے۔ آپ کوئی ایسا علاج تجویز کریں جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ مہربانی فرما کر ہمارے لیے دعا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے۔

☆ بیٹی شہلا! نماز فجر کے بعد ایک تسبیح یا نور کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو۔ سونف کا بہت استعمال کرو۔ وٹامن اے آنکھوں کے لیے بہت مفید ہے۔ آنکھیں ٹھنڈے پانی سے بار بار ضرور دھویا کرو۔ مدت ۴۱ روز ہے۔

□ جمیلہ۔ کھاریاں

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! جس طرح آپ لوگوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دنیا اور آخرت دونوں میں دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر چھائیاں ہیں میں کوئی بھی گرم چیز استعمال نہیں کرتی ہوں حتیٰ کہ چائے بھی نہیں پیتی۔ ٹھنڈی چیزوں کا زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ کچی سبزیوں کا بھی استعمال کرتی ہوں۔ اس کے باوجود بھی چھائیاں ختم نہیں ہوتی ہیں۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ نماز پابندی سے ادا کرتی ہوں۔ دوسرے میرا پیٹ بھی شادی شدہ عورتوں کی طرح نکلا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں بھی کوئی وظیفہ بتا دیں۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔

☆ جمیلہ! روزانہ رات کو ٹھنڈے پانی میں دو قطرے لیموں کے عرق کے ملا کر روئی سے چہرے پر لگاؤ۔ ہفتے میں ایک بار انڈے کی سفیدی میں روغن بادام ملا کر چہرے پر دس منٹ تک لگاؤ پھر چہرہ دھولو۔ ہر نماز کے بعد ۹۹ بار یا مصور پڑھ کر چہرے پر پھیر لیا کرو۔ صبح نہار منہ ہلکی پھلکی ورزش ضرور کرو۔ مدت ۴۱ دن ہے۔

□ آشنا۔ بدین

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! مسئلہ یہ ہے کہ میں گزشتہ دو سال سے ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے اور میرے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہماری ذات اور قوم کا نہیں ہے اس لیے میرے گھر والے اس رشتے پر رضا مند نہیں ہوں گے مگر بابا جی! میرے چاچا کی بیٹی کا بھی دوسری ذات برادری میں رشتہ ہوا ہے۔ بابا جی! میں نہیں چاہتی کہ اپنے ماں باپ کی عزت خراب کر کے کوئی قدم اٹھاؤں۔ برائے کرم مجھے کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے میرے گھر والے عزت سے ہم دونوں کی شادی پر تیار ہو جائیں۔ بابا جی! اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کو ساری زندگی دعا دوں گی۔ بابا جی! میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ جلد سے جلد میری مدد کریں۔

☆ بیٹی آشنا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بکثرت پڑھو۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔ اللہ ضرور اپنا کرم کرے گا۔

□ بنفشہ قربان۔ فیصل آباد

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے ہمارا گھرانا اتنا خوش حال تھا کہ تمام برادری اور دوست احباب ہمیں داد دیتے تھے اور ہم ان کی خاطر تواضع بڑھ چڑھ کر سر انجام دیتے تھے لیکن اب ہمارے گھر میں نہ وہ خوش حالی ہے نہ برکت۔ میرے

عزیزانِ من!
میرے لبوں پر بس ایک ہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اچھے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور برے کاموں سے محفوظ رکھے۔
میرے بچوں میں ہمیشہ کی طرح تمہیں صرف یہی نصیحت کروں گا کہ جس قدر ممکن ہو "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" کا بہت ورد کریں۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کریں۔ اور کوشش کریں کہ امداد سفید پوش خاندانوں کی کریں۔ اللہ میں دیتے ہوئے کبھی یہ سوچنا کہ ہمیں اس کے بدلے بھی کچھ ملے گا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ ہم سب کو گناہوں سے دور رہنے کی توفیق عطا کرے۔ میرے بچوں' عزیزو اللہ کے نبی ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ "جو ہاتھ نہ پھیلا سکے اس کی پہلے امداد کرو۔" جب انسان کسی دوسرے انسان کی ضرورت پوری کرتا ہے تب اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اپنے اس بندے کی تمام ضروریات پوری فرماتا ہے۔
بس یہی دعا ہے کہ اللہ ہمیں کار آمد بنائے اور ہم اپنی اس ایک زندگی میں اتنی نیکیاں کمالیں کہ روز حشر ہمارا نامہ اعمال ہمارے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے۔ ہم سوچتے تو بہت کچھ ہے مگر سوچ کر عمل میں تاخیر کر دیتے ہیں۔ اور پھر انسانی ذہن تو ہشت پہلو ہوتا ہے۔ بس میں یہی کہوں گا کہ اپنے بچوں کو بھی بتائیں کہ ایک دوسرے کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھو، جھوٹ سے بچو اور اپنے آپ کو بھی پاک صاف رکھو اور اردگرد کو بھی..... جب بدن پاک صاف ہوتا ہے تب روح بھی پاکیزہ رہتی ہے اور روح کی پاکیزگی سارے ماحول کو پاک رکھتی ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین۔

□ امداد علی۔ ٹھٹھہ۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ کی عمر دراز کرے۔ بابا جی! آپ نے مجھے نہار منہ ادرک کی قاشیں کھانے کو کہا تھا اور رات کو مرغی کی یخنی ایک پیالی پینے کو کہا تھا۔ بابا جی! میں نے تقریباً دو ہفتے تک آپ کی بات پر عمل کیا تو اس کے بعد میری داڑھ کے کونے والے مسوڑھے میں درد شروع ہوگیا جو تقریباً ایک ہفتے سے بھی زیادہ چلا۔ میں کھانا بھی آسانی سے نہیں کھا سکتا تھا۔ میری ماں نے اور دوسرے لوگوں نے مجھے کہا کہ یہ درد ادرک کھانے کی وجہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ یہ بہت گرم ہے اور یہ کھانا بند کردو اور کہا کہ مرغی بھی گرم ہے۔ اس کی یخنی بھی مت پیا کرو۔ بابا جی! میں نے ان سب کو بہت سمجھایا کہ ایسا نہیں ہے تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ سب ادرک کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے لیکن میری والدہ نے مجھے منع کردیا کہ آئندہ تم ادرک نہیں کھاؤ گے اور مرغی کی یخنی بھی بند کردی کہ یہ چیزیں گرم ہیں اور صحت کے لیے صحیح نہیں ہیں۔ محترم بابا جی! اب آپ بتائیں' میں کیا کروں؟ میں والدہ کی نافرمانی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ برائے مہربانی آپ کوئی دوسرا حل بتائیں تاکہ مجھے اس تکلیف سے نجات ملے۔ بابا جی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے سینے میں تکلیف ہوتی ہے اور مجھے تپ دق کی بیماری بھی ہوگئی تھی جس کا

کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیے جس سے میری شادی بیرونِ ملک کام کرنے والے لڑکے سے نہ سہی' ملک میں ہی کسی بھی اچھے لڑکے سے فوراً ہو جائے۔ بابا جی! میرے گھر کے حالات خراب ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے۔ بابا جی! میں بہت مجبور ہوں۔ مہربانی کر کے ایسا کوئی وظیفہ بتائیے جس سے میرا مسئلہ فوراً حل ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔

☆بنی ناصرہ! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! وظیفہ مستقل مزاجی سے کیا جاتا ہے۔ نماز قضا مت ہونے دو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

صغیر احمد۔ لاہور

○ بابا جی! السلام علیکم! ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم پڑھا' جس طرح آپ دُکھی انسانوں کی خدمت کرتے ہیں' اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ (آمین!) بابا جی! میں نے دو سال پہلے کرائے کی دُکان لی' دُکان میں' میں نے بچوں کی چیزیں ٹافی' چاکلیٹ' بسکٹ وغیرہ رکھے ہیں۔ دُکان کا کرایہ 1,500 نکال کر میرے پاس 1,000 روپے بچتے تھے۔ میں نے دُکان میں پی سی او بڑھایا تاکہ میری آمدنی زیادہ ہو۔ پہلے پہلے یہ کام خوب چلا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ رمضان میں عید کارڈز لگائے کہ ان میں کچھ بچت ہو جائے لیکن وہ بھی نہیں چلے۔ بابا جی! سردی کے مہینے میں چکن سوپ لگایا' ایک ہفتے تک تو آٹھ کلو سوپ روز نکل جاتا تھا لیکن اب دو کلو سوپ بھی نہیں نکلتا تھا۔ بابا جی! اب میں دُکان میں مال بڑھانے سے بھی ڈرتا ہوں کہ جتنا بھی مال بڑھاؤں' بچت وہی کرایہ نکال کر 1,000 سے 1,500 روپے تک ہی ہوتی ہے۔ بابا جی! میری روزی میں رکاوٹ ہے یا کسی نے بندش کروائی ہے؟ آپ استخارہ کر کے بتائیں اور جو بھی وظیفہ دیں' اس کے پڑھنے کی تعداد کم ہو جو میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ بابا جی! ہمارا گھر صرافہ بازار میں ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میری امی گھر میں کھانا بنا دیں تو میں دُکانوں میں ٹفن دے آؤں' لیکن بابا جی! ڈر لگتا ہے کہ اگر سوپ کی طرح ٹفن بھی نہیں چلے تو ہمارا سارا پکا ہوا کھانا بے کار جائے گا۔ بابا جی! میں اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ میں نے انٹر کا امتحان دیا ہے۔ دُعا کریں' میرا رزلٹ اچھا آئے۔ بابا جی! اگر تعویذ کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتادیں کہ تعویذ کس طرح منگواؤں؟ بابا جی! وظیفہ زیادہ بڑا نہ ہو' اتنا ہو کہ میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ میری روزی کے دروازے چاروں طرف سے کھل جائیں تاکہ میں اپنے والدین کو حج پر بھیج سکوں۔ (آمین!)

☆ بیٹے صغیر! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے! تعویذ منگوانے کے لیے تفصیل درکار ہوتی ہے۔ تم مجھے اپنا مکمل نام مع والدہ ارسال کرو۔ جوابی لفافے پر واضح پتا لکھو تاکہ تمہیں تفصیل ارسال کی جاسکے۔

فرزانہ۔ حیدرآباد

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا یہ پہلا خط ہے اور میرا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ میری شادی کو 12 سال ہو گئے ہیں اور میں اولاد کی نعمت سے اب تک محروم ہوں۔ ہم میاں بیوی تمام ٹیسٹ کروا چکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ٹھیک ہوں' خرابی میرے شوہر میں ہے۔ انہوں نے کافی علاج کرایا لیکن بات نہیں بنی۔ بابا جی! میں بہت پریشان ہوں' میں اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں اور ان کو الزام نہیں دیتی' بس صبر کرتی ہوں۔ میرے شوہر بھی اس بات پر بہت پریشان ہیں۔ اتنی ٹینشن ہے کہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ میں ان کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہوں۔ آپ کے بارے میں پڑھ چکی ہوں کہ آپ خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں' سو اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی اچھا سا وظیفہ ارسال کر دیں۔ زندگی بھر دُعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ میرے اور میرے شوہر کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ (آمین!) میرا دوسرا مسئلہ میرے بہنوئی کا ہے۔ میرے بہنوئی کی کوئی مستقل

والدین بہت سخت ہو گئے ہیں۔ اس سے قبل وہ اپنی اولاد پر جان نثار کرتے تھے۔ اب ہر وقت لڑائی اور فساد برپا رہتا ہے جس سے گھر کا ہر فرد بہت متذبذب اور بدحال ہو کر رہ گیا ہے۔ اب ہم سے بلکہ گھر کے تمام افراد سے ابو کا رویہ برداشت نہیں ہوتا۔ پلیز باباجی! کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے ہمارے گھر میں خوش حالی آئے اور ابو کا رویہ ٹھیک ہو جائے۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً تیرہ چودہ سال سے ہماری اپنی سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے۔ جتنا کماتے ہیں سارا خرچ ہو جاتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ کوئی ایسا ورد بتائیں جو میں ہر وقت کر سکوں۔ میں پرائیویٹ طور پر پڑھ رہی ہوں اور فرسٹ ایئر میں ہوں اور اسکول میں پڑھاتی بھی ہوں۔ قرآن پاک بھی سب نے پڑھا ہوا ہے۔ پلیز باباجی! ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ آپ ہماری مدد کریں۔ میرے یہ دونوں مسئلے حل کر دیں تو میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔

☆بنی بینش! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بہت نوازتا ہے مگر جب وہ اس کی راہ میں صدقہ خیرات نہیں کرتے ہیں تو پھر وہ اپنی نعمتیں واپس لینا شروع کر دیتا ہے۔ جس قدر ممکن ہو توبہ استغفار پڑھو۔ بروز پیر کچھ رقم ضرور خیرات کر دیا کرو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد ۳-۳ بار سورۃ واقعہ پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ۲۱ دن ہے۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کر لو۔

□ شریف۔ کوئٹہ۔

○ محترم باباسائیں! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! خیریت طرفین مطلوب! ہم غریب لوگ ہیں۔ میرے والد صاحب ڈرائیور ہیں۔ ہم لوگوں کے اوپر قرضہ ہے۔ اکیلے والد صاحب کمانے والے ہیں۔ ہم دو بھائی ہیں اور ایک بہن ہے۔ میں سب سے بڑا ہوں۔ میں نے T.I.P. سے ڈپلوما کورس تین سال کا ہری پور سے کیا ہے لیکن نوکری نہیں مل رہی ہے۔ باباسائیں! میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔ تعلیم بھی ساتھ ساتھ جاری ہے اور دکان پر الیکٹرک کا کام بھی سیکھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی آسان وظیفہ بتا دیں جس سے میرا کام ہو جائے۔ مسئلہ نمبر دو۔ باباسائیں! میری عمر ۲۳ سال ہے لیکن میرا قد چھوٹا ہے۔ مجھے ہر وقت احساسِ کمتری محسوس ہوتا ہے۔ آپ برائے مہربانی میری مدد کریں اور مجھے اس احساسِ کمتری سے نجات دلا دیں۔ میں تمام عمر آپ کو دعائیں دوں گا۔

☆بیٹے شریف! نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد سورۃ اخلاص ۳۳-۳۳ بار پڑھو اور دعا کرو۔ انشاء اللہ روزگار فراہم ہوگا۔ جہاں تک قد کا تعلق ہے تو بیٹے! وہ اب بڑھنا ممکن نہیں کیونکہ قد ایک خاص عمر تک بڑھتا ہے جو گزر چکی ہے۔ تم اس کو خامی سمجھتے ہو یا کمی جانتے ہو جو کہ نہیں ہے۔ اپنے اندر اچھی عادتیں پیدا کر دو تاکہ لوگ تم سے ملنا چاہیں۔ مدت دو ماہ ہے۔

□ امینہ۔ شیخوپورہ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند کرے۔ (آمین!) باباجی! آپ ہمیشہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور انہیں صحیح رستہ بتاتے ہیں۔ باباجی! میں نے آپ سے اپنے ٹرانسفر کے لیے تعویذ منگوایا تھا' تعویذ باندھ حاصل کرتے ہی میرا کام ہو گیا ہے۔ باباجی! اب آپ ایک اور مسئلے میں ہماری مدد کریں۔ باباجی! میری نند کے لیے کوئی بہتر اور مناسب رشتہ نہیں مل رہا۔ باباجی! پلیز آپ تعویذ عنایت کر دیں۔

☆بنی امینہ! اللہ تمہیں مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بہن سے کہو بعد نمازِ فجر اور عشاء اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ پوری سورۃ ۷-۷ بار پڑھے اور دُعا کرے۔ مدت دو ماہ ہے۔ جبکہ تعویذ کے لیے تم سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات لے لو۔

□ ناصرہ۔ گوجرہ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں نے آپ سے کسی بیرونِ ملک کام کرنے والے لڑکے سے شادی کے لیے تعویذ لیا تھا' اس تعویذ کو سال سے اوپر ہو گیا ہے لیکن یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ باباجی! برائے کرم

سروس نہیں ہے۔ فی الحال سروے کا کام کرتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ نہیں۔ دو بچے ہیں۔ گزارہ بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ مہینے کا آخر تو ہمیشہ ادھار پر چلتا ہے۔ اُن کے لیے بھی کوئی اچھا سا وظیفہ دیں۔ ہمیشہ آپ کی شکرگزار رہوں گی۔

☆بیٹی فرزانہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھا کرو۔ جو شخص اللہ کو راضی کر لیتا ہے‘ وہ کامیاب رہتا ہے۔ بیٹی! اولاد کے لیے تعویذ دیتا ہوں‘ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو‘ میں تفصیل ارسال کروں گا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بہن سے کہو نمازِ فجر‘ ظہر اور عشاء کے بعد تین تین بار سورہ مزمل پڑھیں۔

اول و آخر درود شریف پھر حاجت بیان کرے۔

مدت ایک ماہ ہے۔

□ نسیم۔ شہداد کوٹ

○ بابا جی! میں آپ کی بہت بدنصیب بیٹی ہوں۔ 32 سال کی زندگی میں اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ اب زندگی سے خوف آنے لگا ہے۔ اللہ نے مجھے 4 بچے دیئے ہیں۔ مجھے اپنی اولاد سے بہت محبت ہے مگر بابا جی! مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ میں اور بچے اکثر بھوکے ہی رہتے ہیں۔ شوہر میرا سال بھر پہلے حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ اس کی زندگی میں تو روکھی سوکھی مل ہی جاتی تھی مگر اب تو حالات بہت خراب ہیں۔ میں اَن پڑھ عورت ہوں‘ رشتے دار بھی میرے جیسے ہی غریب ہیں۔ چار بچے کون پال سکتا ہے؟ بابا جی! میری ماں کہتی تھی‘ اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے اور یہ اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ سب اچھے لوگ میری ماں کے ساتھ ہی مر گئے۔ اب صرف برے لوگ ہی زندہ ہیں کیونکہ میں جس کے پاس بھی گئی مدد مانگنے‘ سب نے منع کر دیا۔ میں یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ اللہ کرے‘ آپ کو میری بات سمجھ آ جائے۔ مجھے کوئی ایسی دُعا بتائیں جس کے پڑھنے سے اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور میرے بچے بھی سب کے بچوں کی طرح پیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں۔

☆بیٹی نسیم! اللہ تمہاری مشکلات دور فرمائے۔ بیٹی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تم سے راضی نہیں؟ اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ بیوہ اور یتیم کا خیال یقیناً وہی لوگ رکھتے ہیں جو جنت میں گھر بنانا چاہتے ہیں۔ یقین رکھو‘ دنیا میں بہت اچھے لوگ موجود ہیں‘ اسی لیے یہ دنیا قائم بھی ہے۔ مایوس مت ہو‘ گزرا وقت سدا نہیں رہتا۔ صبر اور مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار الحمد شریف پڑھو اور دعا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ اپنا مکمل پتا مجھے ارسال کرو۔

□ نعیم شاہ۔ گھوٹکی

○ بابا جی! دُعا کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں۔ بابا جی! بات کچھ اس طرح سے ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے‘ دُکھوں کو اپنے اردگرد گھومتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اللہ نے ہمارے باپ اور چچا کو اتنی دولت دے رکھی ہے کہ ان کو خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس کتنی دولت ہے؟ مگر اس کے باوجود وہ اتنے کنجوس ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔ بابا جی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جہاں پر اس نے ہمیں اتنا کنجوس باپ دیا ہے‘ وہیں پر اس نے ہمیں پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والی ماں بھی دی ہے۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے باپ کے خلاف اتنا کیوں ہوں؟ تو بات یہ ہے کہ ان کے پاس دولت تو ہے مگر ہمارا گھر اتنا خراب ہے کہ میں بتا نہیں سکتا تو پھر میں یہ سوچتا ہوں‘ یہ دولت کس کام کی ہے؟ آج تک کسی اولاد نے اپنے باپ پر لعنت نہیں بھیجی ہو گی مگر میں اپنے باپ پر اور اس کی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بات بات پر میری ماں سے جھگڑتا ہے جس کی وجہ سے میری ماں نے کئی مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اللہ نے اس کو بچا لیا ہے۔ بابا جی! میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ہماری ماں کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے باپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ برائے کرم آپ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہمیشہ یہ بات سمجھاتا ہوں کہ جو لوگ اللہ سے پورے یقین کے ساتھ مدد مانگتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم فرمایا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ نماز فجر کے بعد تین بار سورۂ یٰسین پڑھو۔

اول و آخر درود شریف 9-9 بار پھر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل بعد نماز عشاء بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بس خیال رہے' حاجت پوری ہوتے ہی حسب استطاعت رقم اللہ کی راہ میں دو گے۔

□ رفیق احمد۔ کوٹری

○ بابا جی! میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میری عمر 25 سال ہے اور میرا سر تقریباً گنجا ہو چکا ہے۔ پورے سر میں خشکی بھری رہتی ہے حالانکہ میں سرسوں کا تیل بھی لگاتا ہوں۔ بال کم ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے بہت بڑا لگتا ہوں۔ میں نے پڑھا ہے کہ آپ بالوں کی دوا دیتے ہیں۔ پلیز' مجھے جلدی سے دوا بھیجیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو سکے۔

☆ بیٹے رفیق! خط میں اپنا پتہ ضرور لکھا کرو۔ میں دوا کے ساتھ طریقہ استعمال بھی ارسال کروں گا۔

□ صالحہ۔ پڈعیدن

☆ بیٹی صالحہ! تمہارے دونوں خط مجھے ملے مگر پھٹے ہوئے۔ میں نے دونوں خطوط کے جواب بھی دیئے مگر مجھے محسوس ہوا کہ تمہارا پتا بھی مکمل تحریر نہیں ہوتا۔ آئندہ خط لکھو تو مکمل پتا ضرور لکھا کرو۔ شہر کا نام واضح لکھو۔ مکان نمبر اور گلی نمبر بھی صاف لکھا کرو۔

□ سائیں احمد۔ دادو

○ بابا جی! میرے دو مسئلے ہیں' بہت شدید نوعیت کے' ایک تو پورا سال میرا گلا خراب رہتا ہے' کچھ بھی کھاؤں' تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے میری بیوی کا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے اس کو جوڑوں کی بھی تکلیف شروع ہو گئی ہے۔ میں نے آپ کے رسالے میں پڑھا ہے کہ آپ ان امراض کی دوائیاں دیتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی بتا دیں۔ میں اپریل کے آخر میں کراچی آ رہا ہوں' یہ دوائیاں دفتر سے لے لوں گا۔

☆ بیٹے احمد! بس دفتر آنے سے پہلے مجھے مطلع کروا دینا' میں دونوں ادویات تیار کر دوں گا۔ انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

□ شیریں۔ جہلم

○ بابا جی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی! میری عمر 18 سال ہے۔ میں جہلم سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو چاہتی ہوں' وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی اور کو چاہتا ہے اور میں اس کی چاہت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس لڑکے پہ اس کی چاچی نے کافی جادو تعویذ وغیرہ کیے ہیں اور وہ اسی کی باتوں پہ عمل کرتا ہے۔ بابا جی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو میں چاہوں تو میری شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ یہ وظیفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ کر سکوں گی۔ بابا جی! میں آپ کو ہمیشہ دعائیں دیتی رہوں گی۔ بابا جی! میرا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے ابو بہت سخت ہیں' وہ ذرا ذرا سی بات پہ ہماری بے عزتی کر دیتے ہیں۔ بابا جی! مجھ کو ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ ہم سے پیار کریں اور انہیں کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں گی۔

☆ بیٹی شیریں! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہ کثرت پہلے کلمے کا ورد کرو۔ سورہ مریم کی ابتدائی تین آیات تین تین بار ہر نماز کے بعد پڑھو اور دعا کرو۔ رزق میں برکت کے لیے یَا غَنِیُّ یَا مُغْنِیُّ کا بہت ورد کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ نوید احمد۔ کراچی

○ بابا جی! میں ایف۔ اے میں پڑھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بہت تعلیم حاصل کروں مگر جو بھی پڑھتا ہوں' بھول جاتا ہوں۔ ٹیچر کے سوال کا جواب بھی نہیں دے پاتا حالانکہ جواب آتا ہے۔ بہت جلدی گھبرا جاتا ہوں اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ بابا جی! بری حالت ہو رہی ہے

کہ جس کے کرنے سے ہم اپنا گھر بنانے میں کامیاب ہو جائیں بلکہ ہمارے باپ اور چچا کے دل کو اللہ نرم کر دے اور باباجی! آپ بھی ہمارے لیے دُعا کریں کہ اللہ ہمیں بھی خوشی کے دن دکھائے۔ (آمین!)

☆ بیٹے نعیم! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ ہمارا مذہب ہمیں توازن کی نصیحت کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ اپنانا چاہیے۔ ہم سب کو یہی دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ اپنے تمام بندوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ کچھ بھی ہے وہ تمہارے والد ہیں' ان کے بارے میں برا مت سوچو۔ والدہ کو سمجھاؤ' زندگی اللہ کی امانت ہے' اس کی حفاظت کریں۔ رزق کا وعدہ اللہ کا ہے لہٰذا بے فکر رہو۔ والد اور والدہ دونوں کا خیال رکھو اور اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ والدہ سے کہو' نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۃ فاتحہ پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ راحت علی۔ لاہور

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! سلام کے بعد عرض یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی آپ سے کئی بار رابطہ کیا مگر پتا نہیں' کیوں آپ جواب نہیں دیتے؟ باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر میں ایک عجیب سی تکلیف ہے۔ میرا تمام سر کسی عجیب سی قوت میں جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میرا دماغ جکڑا ہوا ہے بلکہ سننے اور سمجھنے کی قوت بھی کم ہے۔ اس بیماری کا بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تو کسی عالم سے استخارہ کروایا تو اس نے بتایا کہ میں جب بالکل چھوٹی تھی تو ایک دن میرے اوپر سے جن اور پریوں کا گزر ہوا تھا اور اس وقت ایک پری کے پروں کی مٹی تا کوئی چیز میرے سر پہ آ گری تھی جس کی وجہ سے یہ تکلیف ہوئی ہے۔ باباجی! بات کچھ بھی ہو پر میرے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں' یہاں تک میں کیسے پہنچی' یہ تو مجھے ہی پتا ہے۔ میں بہت پڑھنا چاہتی ہوں لیکن اس تکلیف نے میرا سارا کیریئر ہی تباہ کر دیا ہے۔ میں دو سالوں سے مسلسل دُرود شریف پڑھتی آ رہی ہوں۔ اس سے مجھے تھوڑا سا افاقہ ہوا ہے کہ میری نظر کی کمزوری کچھ دور ہوئی ہے اور کچھ سمجھنے میں بھی افاقہ ہوا ہے لیکن اب تو دن بہ دن پڑھائی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اگر کلاس میں دُرود شریف کی طرف دھیان دیتی ہوں تو لیکچر سمجھ میں نہیں آتا اور اگر دُرود شریف چھوڑ دیتی ہوں تو تکلیف ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل کرتا ہے' خودکشی کر لوں لیکن اللہ تعالیٰ پہ یقین کر کے آگے بڑھتی ہوں کہ شاید کسی دن وہ مجھ پہ رحم کرے اور مجھے اس عجیب و غریب بیماری سے چھٹکارہ حاصل ہو جائے۔ باباجی! خدا کے لیے مجھے اس تکلیف سے چھٹکارہ دلائیں۔ میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ میں اپنی تعلیم میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔ باباجی! اپریل میں میرے امتحان ہیں اور میں سخت پریشان ہوں۔ آپ جو کہیں' میں کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے اجتماعی دُعا کریں۔ میں کسی بھی مشکل وظیفے یا تعویذ تجویز کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لیے! میرے لیے کوئی راستہ نکالیں۔

☆ بیٹی راحت! تمہیں میں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے لیے مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ زوہیب علی۔ بہاولپور

○ باباجان! میری بیوی نے آپ سے میری نوکری کے لیے تعویذ لیا تھا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ 3 سال بعد مجھے اپنی پسندیدہ جگہ پر نوکری مل گئی۔ فی الحال تنخواہ کم ہے مگر میں مطمئن ہوں۔ یہاں ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ باباجان! میرا ایک اور مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میری کچھ زمین اوحر ڈیرہ میں ہے جو میں بیچنا چاہتا ہوں مگر مناسب قیمت نہیں لگتی۔ کوئی وظیفہ عنایت کیجیے جس کی برکت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ میرے رشتے کے چچا یہ زمین مارکیٹ ویلیو سے کچھ کم پر خریدنا چاہتے ہیں مگر وہ یہ رقم دو اقساط میں ادا کریں گے۔ اب آپ مشورہ دیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سودے بازی کا ہمارے آپس کے تعلقات پر برا اثر پڑے۔ آپ کے جواب کا منتظر۔

☆ بیٹے زوہیب! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں

ہائیڈ پارک

ذوفی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

کب ہوگا اذن سفر

شہر مدینہ خواب میں دیکھا تھا ایک رات
ہے انتظار کب یہ خواب تعبیر پائے گا
ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں کوئی سفری لکیر
تیرا اکرم ہی ہو گا آقا جو تو مجھے بلائے گا
پلکوں سے چوم لوں در و دیوار مدینہ
کب میرا نصیب یہ اعزاز پائے گا
بستی ہے مری خاک کی ذرہ بے نشاں
خواہش ہے مگر درِ مدینہ سے سلام آئے گا
کعبے کو دیکھوں اور درِ مصطفیٰ کو چوم لوں
لگتا ہے اس کے بعد ہی میرے دل کو چین آئے گا
کتنی خوش نصیب گھڑی ہو گی صائمہ
جب تیرے نبی کے گھر سے تجھے بلاوا آئے گا
محبوب خدا ہے تو ہمارا بھی نبی ہے
روز حساب تری شفاعت کا ہمیں پیغام آئے گا
ہے عجب ہی تاثیر تیرے شہر کی گلیوں میں
جو اک بار چلا گیا وہ بار بار جائے گا

شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

مجھے تم یاد آتے ہو

جب شام کے ملگجے اندھیرے در و دیوار پر چھانے لگیں، جب سورج چپ چاپ مغرب میں چھپ جانے کو بے قرار ہو۔ جب درختوں کے سائے گہرے ہونے لگیں۔ جب پرندے گھروں کو لوٹ جانے لگیں اور جب رات کی رانی کی خوشبو سانسوں میں اتر کر وجود میں گھلنے لگے اور جب سب روشنیاں سمٹ کر رات کی چادر اوڑھ لیں۔

ہاں...... جب

مجھے تم یاد آتے ہو!

عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

کرکٹ

کرکٹ کا آغاز انگلینڈ کے جنوب مشرقی حصے کے سبزہ زاروں اور چراگاہوں سے ہوا۔ ملکہ الزبتھ اول کا دورِ حکومت سنہری کہا جاتا ہے کیونکہ کھیلوں نے اس دوران خوب ترقی کی۔ رام ویل کے دورِ اقتدار میں تو کرکٹ انگلینڈ کی ثقافت کا اہم حصہ بن گئی۔ ایم سی سی کا قیام 1782ء میں عمل میں آیا اور کرکٹ کے قوانین 1747ء میں بنائے گئے تو کئی کلب معرض وجود میں آئے۔ کرکٹ کا پہلا میچ 1674ء میں انگلینڈ کی کاؤنٹی کینٹ کے مقام وکس بیتھ میں ہوا۔ انگلینڈ میں صحیح معنوں میں کرکٹ کا پہلا میچ 1697ء میں کھیلا گیا۔ مئی 1709ء میں پہلا انٹر کاؤنٹی میچ ہوا اس طرح 1784ء میں پابندی کے خاتمے کے بعد کرکٹ کو ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ 1884ء میں 11،11 کھلاڑی منتخب کیے گئے اور کرکٹ کے کھیل کو تقویت ملنے لگی پھر انٹرنیشنل کرکٹ کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا اور یوں 1877ء میں پہلا ٹیسٹ میچ انگلینڈ اور آسٹریلیا کے مابین کھیلا گیا۔ یہ کھیل اتنا مقبول ہوا کہ 1975ء میں کرکٹ کے پہلے ورلڈ کپ کے

تو میں کیسے پڑھ سکوں گا؟ شاید میرا مسئلہ آپ کو بہت اہم نہ لگے مگر میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔

☆ بیٹے نوید......! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ اس پر تمہارے مستقبل کا دارومدار ہے۔ تم سب سے پہلے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اگر دن میں 4 گھنٹے پڑھتے ہو تو اب 8 گھنٹے پڑھو یعنی دوگنا وقت دو۔ نماز پابندی کے ساتھ ادا کیا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ نہار منہ 4-3 بادام اچھی طرح چبا کر کھا لیا کرو۔ نَصرٌ مِنَ اللّٰہِ فَتحٌ قَرِیب کا بہت ورد کیا کرو۔

□ افشین ۔کمالیہ

☆ بیٹی افشین! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ کچھ معاملات بڑوں کے طے کرنے کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چاہتے ہوئے بھی اس میں نہیں بول سکتے۔ تم اللہ سے اچھے حالات کی دعا کرتی رہو وہ ضرور سنے گا۔ والدہ سے کہو اپنے تمام بچوں پر چاروں قل اور الحمد شریف پڑھ کر ضرور دم کیا کریں۔ اپنی بھاوج سے کہو بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ انعام ضرور پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ فارینہ ثروت ۔جام شورو

○ السلام علیکم! بابا جی! اس سے پہلے بھی میں نے خط لکھے اور آپ نے میرے مسائل کو حل کیا۔ بابا جی! میری عمر 40 سال ہے اچانک میرے منہ پر داڑھی اور مونچھوں والی جگہ بال نکل رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بال مستقل ختم کرنے کا نسخہ بتائیں تاکہ میں اس پر عمل کروں۔ اگلے شمارے میں ضرور میرے لیے نسخہ لکھ دیجیے گا۔ بہت بہت شکریہ!

☆ بیٹی فارینہ! تمہارا مسئلہ شدید نوعیت کا نہیں۔ کسی اچھے پارلر سے رابطہ کرو۔ اس مسئلے کے لیے خواتین گرم ویکس استعمال کرتی ہیں مگر تجربے کار خاتون سے ہی رجوع کرو۔

نصیحت

ایک دن ابن سماک ہارون رشید کے دربار میں پہنچا۔ ہارون نے کہا۔ "مجھے کوئی نصیحت کرو۔"

ابن سماک نے کہا۔ "ہارون اگر کبھی تمہارا گلا بند ہو جائے اور تم کچھ نہ پی سکو تو کیا کرو گے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں اس بلا کو دور کرنے کے لیے اپنی پوری سلطنت کا آدھا حصہ دے دوں گا۔"

ابن سماک نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں ایسی بیماری لگ جائے جس کے باعث تم پیشاب نہ کر سکو تو اس سے بچنے کے لیے کیا کرو گے؟"

ہارون رشید نے جواب دیا۔ "میں اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی حکومت کا نصف حصہ دے دوں گا۔"

اب ابن سماک نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہارون رشید! اس سے معلوم ہوا کہ تمہاری حکومت کی کل قیمت ایک پانی کے قطرے کا اوپر سے نیچے جانے اور اس کے باہر نکلنے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔"

مرسلہ: ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

بیٹیاں

کیا ہوتی ہیں بیٹیاں
مگر پنکھ نہیں ہوتے بیٹیوں کے
میکے بھی ہوتے ہیں
سسرال بھی ہوتے ہیں
مگر گھر نہیں ہوتے بیٹیوں کے
میکہ کہتا ہے بیٹیاں تو پرائی ہیں
سسرال کہتا ہے پرائے گھر سے آئی ہیں
اے خدا! تو ہی بتا
آخر یہ بیٹیاں کس گھر کے لیے بنائی ہیں

شاعر: راشد لطیف۔ صبرے والا

کامیابی

کامیابی ایک خوب صورت تتلی ہے جس کے تعاقب میں انسان بہت دور نکل جاتا ہے۔ اپنوں سے دور اپنی

اچھے لوگ

دنیا بڑی ظالم ہے اتنا مرنا مشکل نہیں جتنا جینا مشکل ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جو اچھوں کو برا کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔ برے لوگوں نے اچھوں کا جینا مشکل کیا ہوا ہے لیکن آفرین اچھوں پر ہے جو ہر حال میں اچھے ہیں۔ اچھائی کو برائی پر برتری حاصل ہے۔ برے لوگوں کا کیا ہے، وہ تو بے چارے برے ہیں بہرحال اچھوں کا کوئی جوڑ نہیں!

حسن انتخاب: خواجہ اویس۔ سٹی مچن آباد

المیہ

ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ گھر میں صرف بیٹی کی تربیت کی جاتی ہے کہ اس نے سسرال والوں کی کیسے خدمت کرنی ہے اور ان کو خوش کیسے رکھنا ہے لیکن بیٹے کو قطعاً یہ نہیں سکھایا جاتا کہ جو لوگ اس کو اپنے دل کا ٹکڑا دے گئے ان کا لڑکے پر کیا حق ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں صرف اور صرف لڑکی کے سسرال کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ لڑکے کے سسرال کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا کیا خدمت صرف اور صرف عورت پر ہی فرض ہے کیا لڑکے کے سسرال والوں کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ کیا آج تک کسی والدین نے اپنے بیٹے کو کہا ہے کہ بیٹا تم نے اپنے ساس سسر کی عزت کرنی ہے۔ ان کی خدمت کرنی ہے۔ ہم اپنی بیٹی کو خادمہ بنا کر پرائی کر دیتے ہیں اور دوسروں کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر خادمہ والے کام لیتے ہیں۔

حسن انتخاب: خواجہ حسنین۔ سٹی مچن آباد

اک اور نظر سے

دیکھ کر اس دور کے انسان کو
آج کل شیطان خود حیران ہے
دیکھ کر انسان کو ہے سوچ میں
میں ہوں یا یہ آدمی شیطان ہے

شاعر: راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

ہی لوگ اس کے دیوانے ہونے لگے۔ ہر سال کرکٹ کھیل مشہور ہونے لگا اور نت نئے کھلاڑی ابھرنے لگے۔ ٹیسٹ اور ون ڈے کرکٹ کے بعد اب تو ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ نے اس کھیل کو مزید دلچسپ اور شاندار بنا دیا ہے اور ہزاروں کھلاڑیوں کے ریکارڈز اس کھیل کے گواہ ہیں۔

زورِ قلم و تحقیق: عبدالوحید مزاج۔ میانوالی

غزل

دیارِ دل سے کسی کا گزر ضروری تھا
اجاڑ رستے پہ کوئی شجر ضروری تھا
ذرا سی دیر میں بجھنے کو تھا مگر اس دم
دیے کو چلتی ہوا کا ثمر ضروری تھا
اگر نہ ہوتے یہ دنیا اسی طرح چلتی
ہمارا ہونا جہاں میں مگر ضروری تھا
نظر میں شعر سجاتے غزل ساعت میں
سخن کے شہر میں ایسا ہنر ضروری تھا
ہمارے دل میں رہی ہے بس ایک ہی خواہش
دیارِ یار میں اپنا بھی گھر ضروری تھا
چھلک رہی ہیں مرے روم روم سے خوشیاں
تمہاری بزم کا کچھ تو اثر ضروری تھا

شاعری: صائم جی۔ میانوالی

کہاوت

ایک چینی کہاوت ہے۔ ”جسے مسکرانا نہیں آتا اسے دکان نہیں کھولنا چاہیے۔“

مرسلہ: احمد رضا اظہر۔ کراچی

جسم موت کے بعد

انسان کے مرنے کے بعد تیسرے دن ناخن گرنے لگتے ہیں۔ چوتھے دن بال جھڑنے لگتے ہیں۔ پانچویں دن دماغ پگھل جاتا ہے۔ چھٹے دن پیٹ پھٹ کر منہ اور اعضائے مخصوصہ سے باہر آجاتا ہے۔ دو منٹوں میں کچھ نہیں رہتا۔ سوائے ہڈیوں کے تو پھر اتنا غرور، اتنی لالچ اتنی برائیاں اتنا کس لیے؟؟

حسن انتخاب: علی رضا۔ فیصل آباد

موازنہ

میں نے اپنے ماموں جان سے پوچھا کہ ”ماموں جان آپ کے اور ہمارے زمانے میں کیا فرق ہے۔ لوگ پرانے زمانے کو کیوں پسند کرتے ہیں؟“

ماموں نے جواب دیا۔ ”بھانجے صاحب ہمارے زمانے کو لوگ اس لیے پسند کرتے تھے کہ ہم لوگ دوستوں رشتے داروں کا خیال رکھتے تھے۔ ان سے دلی محبت کرتے تھے اور اگر کوئی بیمار ہو جاتا تھا خود جا کر فیس ٹو فیس ملاقات کرتے تھے، جس سے تیمارداری کے ساتھ ساتھ محبت بھی بڑھتی تھی جب کہ آج کل کوئی بیمار ہو تو آج کی نسل ان کے پاس جانے کے بجائے فیس بک پر ہی بیمار کی خیریت پوچھ لیتی ہے، چاہے بیمار ساتھ والی گلی میں ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ تم ٹچ فون تو استعمال کرتے ہو مگر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر رہنا پسند نہیں کرتے۔ تم فیس ٹو فیس ملاقاتوں کی جگہ انٹرنیٹ فیس بک پر ہی گزارا کرتے ہو تو پھر کہتے بھی ہو کہ ہماری زندگی میں سکون کیوں نہیں ہے۔ یاد رکھو یہ انٹرنیٹ وغیرہ بھی بہت اچھے ہیں مگر جو مزہ حدیث کے مطابق خود جا کر دوستوں، عزیزوں کی خیریت معلوم کرنے میں ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔“

حسن خیال: غلام مرتضیٰ علوی۔ گوجرہ

غزل

بند کھڑکی کو کھولتی ہے ہوا
داغ دل کے ٹٹولتی ہے ہوا
شام ہوتے ہی میرے آنگن میں
تیرے لہجے میں بولتی ہے ہوا
خشک پتے مرے شکستہ خواب
جن کو قدموں سے رولتی ہے ہوا
کچھ کہی ان کہی کہانی سی
ہر دریچے سے بولتی ہے ہوا
چھیڑتی ہے محبتوں کے گیت
موتی آنکھوں میں رولتی ہے ہوا
بھیگے موسم میں کوئی آیا جمال
زلف شانوں پہ کھولتی ہے ہوا

شاعرہ: فصیح جمال۔ حیدرآباد

جھاگ نکالتے ہیں اور یوں دل ٹھنڈا کرنے کے بعد اپنے کارنامے پر نازاں خوشی خوشی گھر لوٹتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا دورِ جدید کے لوگ ہر وقت غصے میں کیسے رہتے ہیں؟ بھئی' غصہ تو آنی جانی چیز ہے لیکن' سے قائم کر لینا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی......سیانوں کا کہنا ہے' غصہ پہاڑ کی برفیلی چوٹی کی طرح ہے۔ آپ چوٹی پر جا سکتے ہیں' وہاں قیام نہیں کر سکتے۔"

ممتاز مفتی کی تصنیف "رام دین" سے اقتباس

انتخاب: پارس جونیجو۔ گاؤں بورڑی

احساس

بیوی نے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ جب بھی کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتے ہیں تو بس دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں اس وقت کہ آپ شادی شدہ ہیں۔"

"بھول کہاں جاتا ہوں' اس وقت تو اپنے شادی شدہ ہونے کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔" شوہر نے سرد آہ بھر کے کہا۔

مرسلہ: شہروز شریف' کراچی

روشن اقوال

- انسان کی اکثر خواہشات لاحاصل ہوتی ہیں۔
- آدمی باہر کی رونق اس وقت تلاش کرتا ہے جب اس کے اپنے اندر ویرانی ہو۔
- اندر کی دنیا آباد ہو جائے تو باہر کی دنیا بری لگنے لگتی ہے۔
- تنہائی میں کوئی بھی شخص گھٹن کا شکار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس وقت یادوں کا ہجوم ساتھ ہوتا ہے۔
- دوسروں کی خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر مت بھولیے کہ آج جس عمارت کی بنیاد آپ نے چوری کی اینٹ پر رکھی ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور گرے گی۔
- مصیبت کے دن خواہ کیسے بھی گزریں' گزر ہی جاتے ہیں اور اگر یہ نہیں گزرتے تو بھی آخر کار انسان خود ہی گزر جاتا ہے۔
- قسمت ایک طوائف کی مانند ہوتی ہے۔
- محبت آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھتی ہے اسی لیے محبت کے دیوتا کو اندھا کہا جاتا ہے۔
- تقدیر بہت کم تدبیر کا ساتھ دیتی ہے۔

مرسلہ: ارم تنویر۔ راولپنڈی

بیس منٹ

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان آسائشوں کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس کچھ بھی نہیں۔ میرے ایک جاننے والے ایک شادی پر گئے۔ واپسی پر اہلِ خانہ کے کسی رشتے دار نے انہیں اپنی لگژری سیلون میں بٹھا لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کار ایسی لمبی اور پُر آسائش تھی کہ مجھے اس پر ایک محل کا گمان گزرتا تھا۔ میں نے ٹانگیں سیدھی کیں تو وہاں اتنی جگہ تھی کہ اگلی نشست اس نیم تاریک ماحول میں دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ اور ہلکی پھلکی موسیقی'...... ڈرائیور نے جو کہ نظر نہیں آ رہا تھا' اطلاع دی کہ صاحب فریج میں سے کوئی بھی مشروب نکال کر نوش فرمائیں۔ دس منٹ کے سفر کے بعد ان صاحب کا کہنا ہے کہ اس کار کے باہر جو لوگ چل پھر رہے تھے' وہ نامعتبر سے نظر آنے لگے۔ پندرہ منٹ بعد انہوں نے سوچا کہ آخر یہ لوگ اس سڑک پر کیوں چل رہے ہیں اور جب تک وہ گھر پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ ان عوام الناس کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ انہیں فوت ہو جانا چاہیے۔ یہ ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوا جو اس لگژری کار میں صرف بیس منٹ بیٹھا اور جو لوگ پیدا ہی ان ہی آسائشوں میں ہوئے ہیں' ایسی کاروں میں ہمہ وقت سفر کرتے ہیں' وہ کیسے جان سکتے ہیں کہ باہر گرمی ہے' دھول ہے' لوگوں کی زبانیں پیاس سے لٹک رہی ہیں۔ ان کا بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ باہر اتنی گرمی تو نہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی تصنیف "ہزاروں ہیں شکوے" سے اقتباس

انتخاب: تحسین جونیجو۔ بورڑی' خیرپور ناتھن شاہ

حقیقت سے دور اپنی بساط سے باہر اپنے جامے سے نکل جاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ کامیابی کی سرمستی میں اپنی عاقبت برباد کر دیتا ہے۔ کامیابی ایک کھلونا ہے جس کے حصول کا عمل انسان سے منزل کا شعور چھین لیتا ہے۔ ایک محنت کرنے والا انسان کامیابی کی خاطر محنت کرتا ہے۔ چیونٹی صبح سے شام تک محنت کرتی ہے اور اس کی کامیابی یہ ہے کہ خاک راہ سے رزق مل جائے۔ گدھ کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی پرواز مردار کا راستہ دکھائے۔ مکڑی کتنا خوب صورت جالا بنتی ہے ایک ماہر ریاضی دان اور انجینئر کی طرح۔ اس کا مقصد کامیاب ہو جاتا ہے اس کا مقصد جالا نہیں مکھی ہے وہ مکھی پکڑنے کے لیے خوب صورت جالا بنتی ہے اور یہ اس کی کامیابی ہے۔
واصف علی واصف کی تصنیف "دل دریا سمندر" سے اقتباس

سیاسی بحث

دو سیاست دان کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ ایک نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو؟"
"خبردار سیاسی بحث میں میری بیوی کا ذکر نہیں آنا چاہیے۔" دوسرے سیاستدان نے چلا کر کہا۔

بھوکا

فقیر۔ "بی بی جی آپ کے پاس کسی بھوکے کے لیے کھانا ہے۔"
بی بی۔ "ہے تو سہی مگر وہ بھوکا ابھی دفتر سے نہیں آیا۔"
مرسلہ: محمد انس انور۔ اسلام آباد

تو میرے ساتھ رہے

تیرا میرا ساتھ زندگی بھر یوں تیرے میرے ساتھ رہے
تیرا ہر دکھ ہر غم ہر پل ہر پل یوں میرے ساتھ رہے
پل بھر بھی بھول نہ پاؤں تجھے تو مجھے یوں ہر وقت یاد رہے
میری چھوڑ اپنی سوچ تیری ہر سوچ یوں تیرے ساتھ رہے
میں میرا دل کھلونا یہ کھلونا ہمیشہ یوں تیرے ساتھ رہے
یہ جھوٹی دنیا بھی ہے تیری نظر میں تیری نظر یوں تیرے ساتھ رہے
میری قسمت میں تیری بے رخی تو کیا تیری بے رخی یوں تیرے ساتھ رہے
مت تو مجھے نفرت سے تیرا طلب گار ہوں میں عمر بھر کا جان
یہ تو تا سہی دل ٹوٹا ہوا ہر دم یوں تیرے ساتھ رہے
نادان تجھے بھول گئے قانون عشق تو تیری سزائیں میرے ساتھ رہے
جرم ہوا غلطی سے دل دے بیٹھے تیرا ہر واریوں میرے ساتھ رہے
مجھے پروا نہیں اس جھوٹے زمانے کی سارا جہان یوں تیرے ساتھ رہے
مرنا لازم ہے یعقوب تو گر اک شرط مرتے دم تو یوں میرے ساتھ رہے
شاعر: ایم یعقوب احمرانی۔ ڈیرہ غازی خان

گزارش مختصر

میری جان سنو!
ہجوم مہوشاں سے گر ہو فرصت
تو سوچنا کہ
یہ کیا انصاف ہے؟
اوروں سے مسکرا کر ملنا
چاہنے والوں سے شرما کر ملنا
شاعر: بزدابت افشاں۔ مہوڑہ فتح جنگ

غصہ

پرانے زمانے میں جب انسان جنگلی دور میں تھا تو غصہ ایک اندھا جذبہ ہوا کرتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ اگر آپ پر کسی نے پتھر پھینکا اور پھر بھاگ گیا۔ اس پر آپ کو غصہ آ جاتا۔ آپ اپنا تیر کمان اٹھا لیتے اور گھر سے نکل جاتے۔ باہر کوئی بھی چلتا پھرتا نظر آتا۔ چاہے وہ انسان ہوتا یا پرندہ یا پڑوسی کی بھینس آپ اس پر تیر چلا دیتے اور پھر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے بعد جھونپڑے میں داخل ہو کر آرام سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتے۔ اس زمانے میں بدلے یا انتقام کا سوال نہ تھا۔ صرف دل ٹھنڈا کرنے کی بات تھی۔ اس کے بعد انسان آہستہ آہستہ مہذب ہوتا گیا اور اس کی سمجھ میں آ گیا کہ غصہ نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ غصہ دلانے والے کو سزا دی جائے۔ آج کی صورت حال دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہم پھر سے جنگلی دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ جب بھی ہم غصے میں آتے ہیں تو جوش میں باہر نکلتے ہیں۔ سڑک پر چلتی بسوں کو روک کر انہیں آگ لگا دیتے ہیں۔ چلتی گاڑیوں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ چار ایک نعرے لگاتے ہیں منہ سے

قدیر کا فون آیا۔ ''کدھر ہے تو احمق کے پٹھے!'' اس نے سلسلہ ملتے ہی کہا۔ ''ساری دنیا تجھے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جلدی سے پریس پہنچ'' اس نے جھٹکے سے فون بند کر دیا۔

میں فون رکھ کر نہانے کیلئے باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر میں نے اماں کو خدا حافظ کہا اور قدیر کے پریس چل پڑا۔

جس وقت میں قدیر کے پریس پہنچا وہاں پندرہ بیس لوگ جمع تھے۔ قدیر اپنے دفتر میں بیٹھا تھا اور کئی لوگ اس کی میز کے گرد جمگھٹا لگائے بیٹھے تھے۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا قدیر نے بلند آواز میں کہا۔

''لو جی آ گئے اپنے تنزیل جی۔!''

کئی گردنیں میری طرف گھوم گئیں۔

''تو اٹھ۔!'' قدیر نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کہا۔ ''اپنے تنزیل جی کیلئے جگہ خالی کر دے!''

وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کرسی خالی کر دی۔

میں قدیر کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

قدیر نے کہا۔ ''لو جی یہ اپنے تنزیل جی ہیں۔ ''سندیسے جو گم ہو گئے'' کے خالق۔ اب آپ لوگ جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھو!''

پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا ''یہ اپنے شاعر، ادیب ہیں ان سب کو آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا تھا اس لئے میں نے ان سب کو پریس بلا لیا۔۔۔!''

قدیر کمرشل کتابوں، کہانیوں کے ساتھ ساتھ ادبی کتابوں کو بھی چھاپتا تھا۔ حالانکہ قدیر کے ابا اس بات کے سخت مخالف تھے کہ قدیر کسی بھی ایسی کتاب کو چھاپے، جس کا ذرا سا بھی تعلق ادب سے ہو ان کا کہنا تھا کہ یہ حرام خور سارا دن لفظوں کی جگالی کرتے ہیں، کام دھام نہیں کرتے اور پیسے مار جاتے ہیں۔ مگر قدیر کی کچھ اپنی ہی فطرت تھی۔ وہ اپنے باپ کی بھرپور مخالفت کے باوجود ادیبوں کی کتابیں چھاپنے میں پیش پیش رہتا تھا۔

''تنزیل جی آپ نے تو کمال کر دیا۔ پہلی ہی کتاب میں اس قدر بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں کہتا ہوں واللہ نظر نہ لگے!'' ایک دھان پان سے صاحب بولے۔ انہوں نے لکھنوی اسٹائل کا کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ چہرے مہرے سے پچاس کے پیٹے میں معلوم ہو رہے تھے۔

''ارے جمالی صاحب۔!'' قدیر نے میرے بولنے سے پہلے ہی مداخلت کی۔ ''ان کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپنے جا رہا ہے۔''

''واہ بھئی واہ۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

''ہماری تو ایک کتاب بھی دو سال میں ختم نہیں ہوتی۔'' جمالی صاحب نے کہا۔

''ارے جمالی صاحب کسی کی سمجھ میں آپ کا فلسفہ آئے تو کوئی خریدے۔۔۔ تبصرہ نگار تک کہہ دیتے ہیں کہ بھئی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی پرنٹنگ اور جلد بندی ہے۔!'' کسی نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''ارے چھوڑیں غزالی صاحب آپ کی شاعری کون سی بک رہی ہے۔ ہر غزل کی زمین کسی استاد کی چرائی ہوئی لگتی ہے۔!''

''گویا غزالی صاحب شاعر نہیں قبضہ گروپ ہیں۔!'' کسی نے ٹکڑا لگایا۔

چاروں طرف سے قہقہے اُبل پڑے۔

''یہ سب ہمارے شاعر، ادیب، کالم نگار، دانشور ہیں۔'' قدیر نے میرا ان سے تعارف کرانا شروع کر دیا۔

وہ سب بیک وقت بہت اچھے، بہت دلچسپ، فقرے باز، حاسد، ٹانگ کھینچنے والے، بخیے ادھیڑنے والے، جلے پر نمک چھڑکنے والے، پیار کرنے والے اور چاہے جانے والے تھے۔

ہر آدمی کے اوپر کتنی ہی پرتیں ہوتی ہیں، ساری حیاتی پرت در پرت بندہ کھلتا ہی رہتا ہے۔



تیرِ نیم کش

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا

ذیشان ریاض......فیصل آباد

آتش غم تو سلگتی ہے ہمارے دل میں
آج کیوں آپ کے رخسار تک آ پہنچی ہے

فلک شیر تابش......شاہ گڑھ

سمندر کے سفر میں اس طرح آواز دو ہم کو
ہوائیں تیز ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے

غلام مرتضیٰ علوی......تحصیل گوجرہ

موسم خوشبو باد صبا چاند شفق اور تاروں میں
کون تمہارے جیسا ہے وقت ملا تو سوچیں گے

صائم جی......میانوالی

کہانی یوں ادھوری چل رہی ہے
ہمارے بیچ دوری چل رہی ہے
ہمیں پیچھے دھکیلا جا رہا ہے
یہ کوشش بھی شعوری چل رہی ہے

یاسر العطاس......کراچی

دل کا سونا ساتھ زمانہ ڈھونڈے گا
تیر نگاہیں ساتھ زمانہ ڈھونڈے گا
مجھ کو میرے بعد زمانہ ڈھونڈے گا
دل کا سونا ساتھ زمانہ ڈھونڈے گا

عروسہ مغل......میرپور خاص

عالم نہیں بٹھاؤ سامنے اُن کو
آسیب نہیں مجھ پہ عشق چڑھا ہے

خواجہ حسین......منچن آباد

میری فریاد رائیگاں ٹھہرے
آہ نکلے تو داستاں ٹھہرے

بابر محبوب......کراچی

سیاہ رنگ ہی اتنا عزیز کیوں ہے مجھے؟
بچھڑنے والے کی آنکھوں کا رنگ تھا شاید

فرح دیبا......اسلام آباد

ابھی صیاد رہنے دے قفس میں
مجھے بے گھر نہ کر آزاد کر کے

کرن ظہیر......کراچی

آنکھ میں جب نمی نہ تھی پہلے
زندگی زندگی نہ تھی پہلے
اب جو میرے لبوں تک آئی ہے
بات وہ تشنگی نہ تھی پہلے

یاسمین رضا......ڈیفنس، کراچی

وگرنہ کار جہاں لے کے بیٹھ ہی جاتے
تمہاری یاد نے رکھا ہمیں نہال بہت

طاہرہ رضوی......لندن

سر سے پا تک میں جس میں بھیگ سکوں
اب وہ ساون کہاں برستا ہے

زبیدہ اکرم......منظور کالونی، کراچی

عشق تجھ سے نہیں مگر جاناں!
ناز انداز اور ادا سے ہے
دیکھیے وقت کیا دکھائے گا؟
خوف اس بار اک گھٹا سے ہے

نیہا عزیز......کراچی

اس خرابے میں سبھی اپنی جگہ پہ خوب ہیں
خوش بیانوں میں بھی کوئی باہنر تم سا نہیں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

رضوانہ کوثر.........لاہور

تو مجھے اس طرح سنبھال نہیں
ٹوٹ جاؤں نہ احتیاط میں میں

سید بدر سعید.........لاہور

کس قدر حسن میں ڈھلے ہو تم
جب سے اس شخص سے ملے ہو تم

شائستہ چوہان.........چک شہزاد اسلام آباد

جس کے ہونے میں کچھ نہ اچھا ہوا
پھر وہی واقعہ نہ پوچھ ابھی
پہلے سانسیں سمیٹ لینے دے
کیا ہوا کیا ہوا نہ پوچھ ابھی

عادل گلزار.........فیصل آباد

زندگی کے سراب رستوں پر
زندگی کی تلاش جاری ہے

عاصم خان نیازی.........رحیم یار خان

انا کی جنگ میں ہم جیت تو گئے لیکن
پھر اس کے بعد بہت دیر تک نڈھال رہے

ثانیہ ناز.........کراچی

کیوں یہ مجبوریاں گنواتے ہو؟
اک اک بات مانتا ہوں میں
اس وضاحت کی کیا ضرورت ہے؟
چہرہ پڑھنا بھی جانتا ہوں میں

نسیم سلطانہ.........قیوم آباد کراچی

تم سا کوئی اور زمانے میں ہوا تو رب سے شکایت ہوگی
تم کو چاہنے والا کوئی اور ہوا تو قیامت سے پہلے قیامت ہوگی

نور الحسین.........گلشن حدید کراچی

جب شام ہوتی ہے مجھے تم یاد آتے ہو
بن کے گیت وفا کا مرے ہونٹوں پہ لہراتے ہو

اشفاق شاہین.........کراچی

لہو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں؟
کسی بھی شخص سے کوئی غرض نہیں مجھ کو
میں صرف تیرے لیے سب سے رابطہ رکھوں

شازیہ ظہیر.........عارف والا ساہیوال

زندگی بھر دل کسی مجبور کا جلتا رہا
لوگ ہمدردی کے پردے میں ہوا دیتے رہے

ایاز اعوان.........شاد لطیف ٹاؤن

یہ اضطرابِ عشق ہے یا عشقِ اضطراب
دیتا دلاسے خوب ہے ویسے ترا سراب

عزیقہ بوٹا.........کراچی

زندگی جب بھی کسی شے کی طلب کرتی ہے
میرے ہونٹوں پہ ترا نام مچل جاتا ہے

عدیل بھٹی.........کراچی

بات کردار کی ہوتی ہے وگرنہ عارف
قد میں انسان سے سایہ بھی بڑا ہوتا ہے

عارش عتیق.........کراچی

اگر کام آئے گا کوئی تو ہم ہی کام آئیں گے
کبھی نہ کام آئے گا ہجوم دوستاں تیرا

ماہ رخ خان.........کراچی

خوشبو لباس رنگ وہی ہیں مجھے عزیز
اب تک تری پسند مری عادتوں میں ہے

☆☆☆

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

کوپن برائے

شعر نغمہ

نام

پتا

مارچ 2017ء